اس پتھر کی کہانی جو عشقِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں روتا رہتا تھا
گیلے پتھر
لا الٰہ الا اللہ
محمد رسول اللہ
غارِ حرا
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
اقرأ باسم ربک الذی خلق
آئیڈیل پبلک لائبریری
0301-7283296
0334-9630911
محمد فیاض ماہی

پیش لفظ

"معزز قارئین کرام!
آپ کی پُر خلوص عدالت میں دوسری مرتبہ حاضر ہو رہا ہوں۔ امید ہے کہ پہلے جیسی محبت اور پذیرائی ملتی رہے گی۔ تاکہ آپ سے میرا یہ قلمی دوستانہ قائم رہے۔

ناول لکھنا اتنا مشکل نہیں ہے جتنا کٹھن کام پیش لفظ لکھنا ہے۔ ویسے بھی آج کے ترقی یافتہ دور میں جہاں الیکٹرانک میڈیا کی بہتات نے کتاب پڑھنے والوں کو اچھی کتاب سے بہت دور کر دیا ہے۔ وہاں علم اور آگہی سے بھی دوری بڑھتی جا رہی ہے۔ اچھی کتب لکھنے والے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ کیونکہ اچھا پڑھنے والے کمپیوٹر اور کیبل کی مہربانیوں سے وقت ہی نہیں نکال سکتے۔ مگر ان چیزوں کی اپنی بھی ایک حقیقت ہے۔ جن سے انکار ممکن نہیں ہے، لیکن اگر ان کو مثبت طور پر استعمال کیا جائے۔

آج کا قاری اچھی کتاب کو ترس گیا ہے، لیکن ابھی بہت سے ایسے مصنفین ہیں جو اس کٹھن کام کو انجام دینے کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہیں۔ جو واقعی قابل تحسین بات ہے۔

میری پہلی کاوش "گھنگھر و اور کشکول" کے عنوان سے آپ کی جہاندیدہ نظروں سے گزر چکی ہے اور الحمد للہ متبولیت کی سند بھی حاصل کر چکی ہے۔ آپ کی محبت اور خلوص نے مجھے اپنا اگلا ناول لکھنے پر مجبور کیا ہے اور آپ کی محبت کا جواب محبت سے دینے کے لیے "گیلے پتھر" کے نام سے اپنی کاوش کو لے کر حاضر ہوا ہوں۔ امید ہے کہ یہ بھی آپ کے بلند معیار پر پورا اترے گا۔

"گھنگھر و اور کشکول" کی اشاعت کے لیے میں برادر نوید اے شیخ (رابعہ بک ہاؤس) کا دلی طور پر ممنون ہوں۔ ان کی محبت نے مجھے مصنفین کی صف میں شامل کیا ہے۔

اب "گیلے پتھر" لے کر محترم برادر جناب عبدالغفار (علی میاں پبلی کیشنز) کے توسط سے حاضر ہوں۔ اس کتاب کے بارے میں اتنا ہی کہوں گا کہ اب تک عشقِ حقیقی پر آپ کی

نظروں سے بہت سے ناول گزرے ہوں گے۔ جن کو آپ کے ذوق نے مقبولیت کی سند عطا کی ہے۔ یہ ناول آپ کو یقیناً پہلی تحاریر بھولنے پر مجبور کر دے گا۔ یہ میرا دعویٰ نہیں ہے۔ بلکہ آپ کے بلند معیار پر قائم میرا مان ہے۔

اس ناول کا مرکزی کردار کوئی جاندار نوجوان نہیں ہے۔ بلکہ ایک بے جان پتھر ہے۔ جو جبل نور کے نورانی پتھروں کے خاندان کا ایک فرد ہے اور آقائے دو جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مقدس پر درود وسلام کے پھول نچھاور کرتا ہے۔ آپ کی محبت اور عقیدت میں دن رات آنسو بہاتا ہے اور مدینہ شریف سے آنے والی ہوا کو، سورج کو، چاند اور آسمان کو خود سے معتبر اور افضل جانتا ہے کہ وہ تو دن رات آقائے دو جہاں فخر کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس در کی زیارت سے فیض یابی حاصل کرتے رہتے ہیں۔ مگر وہ بے جان ہے۔ یہیں پڑا رہتا ہے۔

اس کی المناک داستان کا آغاز اور انجام میں نے اپنے حقیر سے الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک مشرک نے اسے وہاں سے جدا کر دیا تو رب کریم کو اس پتھر کا رونا انسانوں کے رونے سے بھی زیادہ پسند آ گیا۔ اس کے رونے اور غم میں دکھاوا نہ تھا۔ رب کریم نے اس مشرک کی دنیا اتھل پتھل کر دی۔

ایک عاشقِ رسول کا قصہ، کہانی کی صورت میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس کہانی میں ایک کردار جو کہ ''شاہ جی'' کے نام سے ہے۔ آپ کو بتاتا چلوں کہ وہ کردار حقیقی دنیا میں موجود تھا۔ یعنی شاہ جی میرے پیر و مرشد ہیں۔ قادریہ خاندان سے تعلق رکھنے والے آلِ رسولؐ کے اس مقدس گھرانے کے عظیم چشم و چراغ سے متعلق لکھی جانے والی تمام باتیں اور کرامات سچی ہیں۔ جن کا گواہ میں اور میرے والدین کے علاوہ ان کے مریدین بھی ہیں۔

اس کتاب کی تکمیل کے لیے میں نے، قرآن کریم، احادیثِ مبارکہ اور جن جن کتب کا مطالعہ کیا ہے ان میں سے جو بھی مواد تحریر کیا ہے۔ ان کے حوالہ جات باقاعدہ درج ہیں۔ ان محترم مصنفین کا بے حد ممنون ہوں جن کی تصانیف سے میں علم حاصل کر کے اپنی کوتاہ نظری اور کم علمی کے باوجود اس کتاب کو مکمل کر سکا ہوں۔

''وحدہٗ لاشریک'' کی ذاتِ مقدس کے علاوہ ایک انسان کو سجدہ کرنے والے خبیث شخص کا افسانہ بھی آپ کے رونگٹے کھڑے کر دے گا۔ نام نہاد اور جعلی پیروں کے چنگل میں پھنسے ہوئے ایک جاہل خاندان کے ابوجہل کا قصہ جو کہ عبرت کا نشان بن کر گلیوں میں بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

مذکر و مؤنث کا عشق تو آپ نے بہت پڑھا ہو گا۔ جبکہ ایک پتھر کا عشق یقیناً آپ کو چونکنے پر مجبور کر دے گا۔

اس کتاب کو تحریر کرنے کے لیے میں نے ایک صفحہ بھی بیٹھ کر نہیں لکھا۔ بلکہ تمام ناول کھڑے ہو کر لکھا ہے۔ یہ اس ناول کے مرکزی کردار (پتھر) سے میری محبت ہے کیونکہ الحمدللہ گزشتہ سال اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کرم فرمایا اور میں عمرہ کی سعادت حاصل کر سکا۔

مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی زیارات اور فیض یابی سے ذہن اور دل کو سکون ملا ہے۔ آپ کے معیار کے مطابق لکھنے کی کوشش کی ہے۔ مگر پھر بھی اتنی تفصیل اور وضاحت سے نہیں لکھ سکا کیونکہ ان مقدس مقامات کے ایک ایک انچ سے نور اور معطر خوشبوئیں پھوٹتی رہتی ہیں۔ جنہیں مجھ جیسے کم علم آدمی نے احاطہ قلم میں لانے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ میں جو بھی لکھ سکا ہوں، پیارے آقا کالی کملی والے کے صدقہ ہی سے لکھ سکا ہوں اور تاحیات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظرِ کرم کا محتاج اور طلبگار رہوں گا۔

اس ناول کو پڑھ کر حسبِ دستور اپنے قیمتی اور تنقیدی خطوط سے مطلع کریں۔ میں ان قارئین کا بھی بے حد ممنون ہوں۔ جنہوں نے ''گھنگھرو اور کشکول'' پڑھنے کے بعد اس کے مختلف موضوعات پر تنقیدی خطوط لکھ کر میری غلطیاں سدھاریں۔

یہ ایک الگ اور منفرد موضوع ہے۔ جبکہ ''گھنگھرو اور کشکول'' جیسے کئی موضوع کئی رائٹرز تحریر کر چکے ہیں، لیکن یکسانیت کا قائل نہ ہونے کی بنا پر میں نے بالکل ہی الگ موضوع چنا ہے۔ جو یقیناً آپ کو بے حد پسند آئے گا۔

میں ذاتی طور پر برادر حافظ محمد سرفراز احمد کا ممنون ہوں۔ جن کی محبت تا حال شاملِ حال ہے۔ ان دوستوں کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے میری ابتدائی تحاریر پڑھ کر مجھے لکھنے پر اُکسایا۔ برادر عبدالغفار نے اس ناول پر جس محنت اور لگن کا مظاہرہ کیا ہے وہ جذبہ واقعی قابلِ ستائش ہے۔

والسلام

محمد فیاض ماہی

ہر سال کی طرح اس سال بھی بخاری حویلی میں بہت سے لوگ جمع تھے، جو کہ ہر سال سولہ مئی کو بخاری بابا کے والد محترم کے عرس میں حاضر ہوتے تھے۔ ملک بھر سے آنے والے تمام مرید ایک دوسرے سے واقف تھے۔ ان میں آپس کا رشتہ ''پیر بھائی'' کا تھا۔

بخاری بابا جو کہ سادگی اور مردانہ وجاہت کا بہترین نمونہ تھے۔ اپنے تمام مریدوں کو ان کے سیدھے نام سے پکارتے تھے، بلکہ ان کی اولادوں کے نام بھی بابا کو یاد تھے۔ بخاری بابا حسبی نسبی سیّد تھے۔ آلِ رسول ہونے کی نسبت سے لوگ ان کا احترام اور حیاء کرتے تھے۔ وہ بھی اپنی کھال میں مست رہنے والے نیک بزرگ تھے۔ کبھی کسی کے کام میں مداخلت نہ کی تھی۔ بہت دھیمے اور ٹھہرے ہوئے لہجہ میں گفتگو فرماتے تھے۔ کھانا مریدوں کے ساتھ ہی زمین پر بیٹھ کر کھاتے تھے۔

اب بھی وہ دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے اور ارد گرد مریدین کا جم غفیر لگا ہوا تھا۔ شاہ جی جو بھی پانی یا سالن کسی مرید کو دیتے وہ یہ تبرک بڑے احترام اور عقیدت سے لیتا اور محبت سے تناول کرتا تھا۔

اسمٰعیل جو کہ بخاری بابا کا خاص خادم تھا۔ وہ ان کے کندھے دباتا رہتا اور کبھی ٹانگیں اور پاؤں دبانے لگتا۔ اسمٰعیل کے بارے میں مریدوں کی رائے ملی جلی تھی۔ کوئی کہتا کہ یہ ''جن'' ہے اور انسانی روپ میں شاہ جی کی خدمت پر مامور کیا گیا ہے۔ جبکہ کوئی یہ نظریہ رکھتا تھا کہ شاہ جی کی کوئی اولاد نہیں ہے، انہوں نے اسمٰعیل کو گود لیا ہے۔ گذشتہ سترہ سال سے اسمٰعیل کے چہرے، رنگت اور صحت میں کسی نے بھی کوئی فرق نہ دیکھا تھا۔ بہر کیف تمام مریدین اس کے بارے میں مختلف نظریات رکھتے تھے اور طرح طرح کی باتیں بھی کرتے تھے، لیکن ان کے برعکس اسمٰعیل نے کبھی بھی کسی مرید سے کوئی بات نہ کی تھی۔ وہ خاموش طبع اور سنجیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ یہ فن بھی رکھتا تھا کہ وہ پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح سرائی کرتے ہوئے آنسوؤں کی جھڑی لگا دیتا تھا۔ لوگ

اس سے رونے کا سبب دریافت کرتے تو محض اتنا ہی کہتا:

''تم نہیں جان سکتے یہ آنسو کیوں اور کہاں سے آتے ہیں؟''

وہ خوش الحانی میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ مریدین کے کہنے پر کبھی بھی نعت نہ پڑھتا بلکہ مرشد سرکار کے کہنے پر مدح سرائی کرتا اور خود کو اس میں ڈبو لیتا۔ بعض دفعہ تو یہ گمان بھی ہوتا کہ اسمٰعیل کی آنکھیں خون برسانا شروع کر دیں گی۔

اب بھی مریدین شاہ جی کی طرف دیکھ رہے تھے کہ وہ اسمٰعیل کو نعت گوئی کے لیے کہیں گے۔ یک دم حویلی کے مین گیٹ سے ایک شخص روتا پیٹتا اندر آیا اور لوگوں کے مجمع کو چیرتا ہوا سیدھا شاہ جی کے قدموں میں گر پڑا۔ وہ سینہ کوبی کر رہا تھا اور تمام لوگ اسے حیرانگی سے دیکھ رہے تھے۔ وہ شاہ جی کے قدموں میں پڑا بلک بلک کر رو رہا تھا اور شاہ جی اسے دیکھ رہے تھے۔ پھر جب کچھ لمحات اسی طرح گزر گئے تو انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور دلاسا دینے والے انداز میں پوچھا۔

''تاج دین کیا بات ہے۔ کیوں سینہ کوبی کر رہے ہو؟ خود بھی پریشان ہو اور ہمیں بھی پریشان کیا ہوا ہے۔ ذرا پُرسکون ہو جاؤ اور تمام معاملہ کہو۔''

تاج دین یہ سن کر اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔

''میں برباد ہو گیا ہوں شاہ جی۔ میری دنیا لٹ گئی ہے۔ میرا اب آپ کے سوا کوئی سہارا نہیں ہے۔ آپ ہی میری مدد کر سکتے ہیں۔ شاہ جی مجھے زندہ درگور ہونے سے بچا لیں میں مر جاؤں گا۔'' وہ سسکیوں میں کہہ رہا تھا اور شاہ جی کے پاؤں بھی پکڑ رکھے تھے۔

''آپ کو تو معلوم ہے کہ میرے دونوں جوان بیٹے اس وقت جیل میں ہیں اور وہ گناہگار ہیں یا نہیں۔ اللہ سچا جانتا ہے، لیکن میں باپ ہوں۔ میں ان کو بے گناہ تصور کرتا ہوں، لیکن قانون جذبات اور رشتوں کا لحاظ نہیں کرتا۔'' یہ کہہ کر وہ پھر رونے لگا اسمٰعیل حیرت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا اور لوگ اسمٰعیل کے سرخ ہوتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔

''دیکھو تاج دین پہیلیاں بجھوانے میں وقت ضائع مت کرو۔ تمہیں معلوم ہے کہ عصر کے بعد ختم شریف ہے اور دربار پر بھی حاضری کے لیے جانا ہے۔ اس لیے جو بھی بات ہے کھل کر کہو۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کروں گا کہ تمہاری پریشانی دور ہو جائے۔'' شاہ جی نے ایک مرتبہ پھر تاج دین کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اپنے روایتی اور میٹھے انداز میں بولے۔

''شاہ جی قانون نے میرے دونوں بیٹوں کو 'پھانسی' کی سزا سنا دی ہے اور کل انہیں

'پھانسی' دی جائے گی۔'' تاج دین نے ہچکیوں میں وہ بات کہہ دی جو اب تک تمام مریدین کے لیے معمہ بنی ہوئی تھی۔

''میرے بڑھاپے کا سہارا، میرے بیٹے۔ میں ان کے لاشے اپنے کندھوں پر کیسے اٹھاؤں گا؟ میں تو پہلے ہی غربت اور قسمت کا مارا ہوا ہوں۔ میرے یہ جھکے ہوئے کندھے اپنے جوان بیٹوں کے جنازوں کو سہارا دینے کی استطاعت و ہمت نہیں رکھتے۔ آپ کو خدا کا واسطہ کچھ نہ کچھ ضرور کیجئے شاہ جی!'' تاج دین کی گریہ زاری سے سارا ماحول افسردگی میں ڈوب گیا تھا۔ بلکہ کچھ کمزور دل احباب تو رو بھی پڑے تھے۔ تاج دین ان کا کوئی سگا نہ تھا لیکن پیر بھائی کا رشتہ تو تھا اور اسی رشتہ کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے لیے ہمدردی اور نیکی کا نرم گوشہ دل میں رکھتے تھے۔

شاہ جی نے اٹھ کر مجمع میں دور تک نگاہ دوڑائی اور ایک شخص کو اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ وہ لوگوں کو پھلانگتا ہوا شاہ جی کے پاس پہنچا اور باادب کھڑا ہو گیا۔ جب شاہ جی کھڑے ہوتے تو تمام مرید بھی اٹھ کر کھڑے ہو جاتے تھے، لیکن شاہ جی نے انہیں ان تکلفات سے سختی سے منع کیا ہوا تھا۔ وہ ہر قسم کے دکھاوے کو بے معنی اور فضول جانتے تھے۔

''نذیر حسین کیا تم کچھ مدد کر سکتے ہو؟'' شاہ جی نے باادب کھڑے ہونے والے شخص سے کہا۔

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر سرکار، لیکن میں مجبور ہوں۔ کیوں کہ فیصلہ میری عدالت سے نکل کر سپریم کورٹ میں جا پہنچا تھا اور تمام ثبوت اور گواہ بھی تاج دین کے بیٹوں کے خلاف تھے۔ قتل ہونے والوں کے وارث بہت اثر و رسوخ والے ہیں۔ انہوں نے ہائی کورٹ کی رحم کی اپیل کو سپریم کورٹ میں چیلنج کر دیا تھا۔'' باادب کھڑے شخص نے شاہ جی کو تمام صورتِ حال بتا دی۔ شاہ جی اور اس شخص کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہائی کورٹ کے جسٹس ہیں۔

''ٹھیک ہے تم بیٹھو۔ اب مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔'' شاہ جی نے جسٹس نذیر حسین کو کہا اور واپس تاج دین کی طرف پلٹے۔

''اب خاموش ہو کر بیٹھ جاؤ۔ قانون کے فیصلے بہت سوچ سمجھ کر کیے جاتے ہیں۔ میں اس قانون کے فیصلے کو چیلنج تو نہیں کرتا لیکن رب العزت سے دعا کرتا ہوں کہ وہ تمہارے بیٹوں کو بری کر دے۔ بیٹھو اور میرا انتظار کرو۔ میں ابھی آتا ہوں۔'' یہ کہہ کر شاہ جی اندر کی طرف چلے گئے۔ اندر زنان خانہ میں کسی مرد کو جانے کی اجازت نہ ہوتی تھی اور اس

موقع پر مختلف شہروں سے آئی ہوئی عورتوں سے حویلی بھری ہوئی تھی۔

کوئی دس پندرہ منٹ کے جان لیوا انتظار کے بعد تاج دین اور حاضرین محفل نے دیکھا کہ شاہ جی اندر سے حویلی کے صحن میں داخل ہو رہے ہیں اور ان کے ہاتھ میں ایک بہت موٹا ڈنڈا پکڑا ہوا ہے۔ جو کہ تقریباً ڈھائی فٹ لمبا تھا۔ لوگ حیرانی سے کبھی شاہ جی کو دیکھتے اور کبھی ڈنڈے کی طرف دیکھتے اور تاج دین تو شاہ جی کے ہاتھوں میں ڈنڈا دیکھ کر بے اختیار کھڑا ہو گیا تھا۔ شاہ جی نے ڈنڈے پر اپنی گرفت مضبوط کی اور آتے ہی پورے زور سے ڈنڈا کھینچ کر تاج دین کی پیٹھ پر دے مارا۔ اس اچانک حملہ سے تاج دین بری طرح لڑکھڑا کر دور لوگوں پر جا گرا۔ جو حیرت اور دلچسپی سے اس حرکت کو دیکھ رہے تھے۔ تاج دین اس زبردست چوٹ سے بُری طرح زخمی ہوا تھا اور روتا ہوا حیرت سے شاہ جی کو دیکھتا ہوا پھر کھڑا ہو گیا، لیکن جب اس نے اسی انداز سے ایک بار پھر شاہ جی کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو وہ مجمع کو چیرتا ہوا حویلی کے بیرونی دروازہ کی طرف لپکا اور گرتا پڑتا دروازے سے باہر گلی میں غائب ہو گیا۔ شاہ جی بھی اس کے پیچھے ہو لیے اور تمام مریدین بھی حیرت و استعجاب کے عالم میں شاہ جی کے پیچھے ہو لیے، لیکن انہوں نے شاہ جی کو باہر گلی میں پُرسکون انداز میں کھڑے دیکھ کر سکھ کا سانس لیا۔ ان کے ساتھ تاج دین بھی تھا جو کہ زیادہ دور نہ جا سکا ہوگا شاہ جی اسے بازو سے پکڑ کر لا رہے تھے اور واپس اپنی حویلی میں آ کر اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے ڈنڈا اسمٰعیل کو پکڑا دیا تھا۔ جبکہ تاج دین کی نظریں اسمٰعیل کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے ڈنڈے کی طرف تھیں اور وہ بار بار اپنی پیٹھ بھی سہلا رہا تھا۔ شاہ جی نے سانس درست کرتے ہوئے تاج دین کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

''یہ تمام لوگ گواہ ہیں۔ تمہارا ایک بیٹا کل بری ہو جائے گا۔ جبکہ دوسرا پھانسی چڑھ جائے گا۔ اگر تم دونوں مرتبہ ہی اپنی پیٹھ پر ڈنڈے کی مار سہہ لیتے تو تمہارے دونوں بیٹے ہی بری ہو جاتے۔ مگر تم ایسا نہ کر سکے۔'' شاہ جی کی بات سن کر حاضرین کو سکتہ ہو گیا۔ جبکہ تاج دین کی گریہ زاری میں اضافہ ہو گیا۔ وہ شاہ جی کے قدموں میں لوٹ رہا تھا اور اونچی آواز میں رو رو کر شاہ جی سے کہہ رہا تھا۔

''آپ بے شک میری کمر چھلنی کر دیں۔ میری پیٹھ کو کوٹ کوٹ کر ملیدہ بنا دیں۔ میں اُف تک نہ کروں گا۔ میرے دوسرے بیٹے کو بھی بچا لیں۔ شاہ جی خدا کے واسطے۔ میری پیٹھ پر جتنے چاہیں ڈنڈے برسائیں۔ آپ کو خدا کا واسطہ۔'' وہ بلک بلک کر فریاد کر رہا تھا۔

''نہیں تاج دین۔ وہ لمحہ دوبارہ نہیں آ سکتا۔ کیونکہ میں اپنے رب کو بڑی مشکل سے

منا کر آیا تھا۔ اب وہ وقت وہ گھڑی وہ لمحات بیت گئے ہیں۔'' شاہ جی نے تاج دین کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور اسمٰعیل کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اسمٰعیل اشارہ سمجھ کر ہاتھ باندھ کر باادب کھڑا ہو گیا اور سرورِ کائنات کی مدح سرائی کرنے لگا اور لوگ اس کی کیفیت اور پُرسوز آواز میں سرور اور وجد محسوس کرنے لگے۔

بھول سکتا نہیں مجھ کو منظر پیارا مدینے کا
ہے نگاہوں میں بس یہی اک سہارا جینے کا

خوش بخت پرندے ہیں اڑتے ہیں ان فضاؤں میں
کاش میں بھی کبوتر ہوتا اک پیارا مدینے کا

یہ شعر پڑھتے ہوئے اسمٰعیل کی آنکھیں ساون کی طرح برسنے لگیں۔ وہ اپنی آواز پر قابو نہ پا سکا اور اگلا مصرع کہنے سے پہلے ہی اس کی آواز پھٹ گئی۔ وہ بلک بلک کر رونا شروع ہو گیا۔ شاہ جی نے اس کی کیفیت بھانپتے ہوئے اسے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ شاہ جی کے کندھے دبانے لگا، لیکن اس کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو گئی تھیں۔

☆======☆======☆

اے صبا مصطفٰیؐ سے جا کہنا
غم کے مارے سلام کہتے ہیں

سبز گنبد کی ان ہواؤں کو
دل ہمارے سلام کہتے ہیں

اللہ اللہ حضورﷺ کے گیسو
بھینی بھینی مہکتی وہ خوشبو

جن سے معمور ہے فضا ہر سُو
اور نظارے سلام کہتے ہیں

آج پھر وہ بہت اداس ہو رہا تھا، لیکن اپنا غم اور پریشانی وہ اپنے چھوٹوں سے نہ کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ان سب سے بڑا تھا اور بڑا بننے کے لیے بڑا پن اور متانت ضروری ہوتی ہے، لیکن اس کے رفقاء بھی اس کا مزاج جانتے تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ آج ''نورانی'' بہت

اداس ہے۔ اس کا وجود نم ہو رہا تھا۔ اس کی طرف سے آنے والی نمدیدہ ہوا چھوٹے ''نورانیوں'' کو بھی غمزدہ کر رہی تھی۔

''نورانی! کیا بات ہے؟'' چھوٹے نورانی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس ہولناک اور طوفانی رات میں تم اداس لگ رہے ہو اور تمہارا وجود بھی پگھلا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ کیا تمہیں اس طوفان کا ڈر ہے؟''

''خدائے بزرگ و برتر کی قسم۔ یہ ہولناکیاں، یہ طوفان اور یہ سیاہ رات میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی۔ نہ ہی مجھے ان کا کوئی غم ہے۔ میرا دکھ اور میرا غم تم سب اچھے طریقے سے جانتے ہو۔'' بڑے نورانی نے غمزدہ لہجے میں جواب دیا تو تمام چھوٹے نورانی اثبات میں سر ہلانے لگے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ آج نورانی کو پیارے پیارے آقا تاجدارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد نے تڑپا دیا ہے۔ جب بھی کبھی ایسا ہوتا وہ تمام واقعہ من و عن بیان کر دیتا تھا۔ جو اس نے دیکھا اور سنا ہوتا تھا اور چھوٹے نورانی اپنے نمدیدہ وجود کو بمشکل سنبھال پاتے تھے۔ آج بھی وہ سمجھ گئے تھے کہ بڑا نورانی، انہیں والئی دو جہاں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری پیاری باتیں سنائے گا اور وہی ہوا جس کی وہ توقع کر رہے تھے۔ بڑے نورانی نے کہنا شروع کیا۔

''کئی سو سال پہلے میرے پاس ایک نورانی اور وجدانی شکل و صورت والے بشرؐ نے آنا شروع کیا۔ وہ میرے پاس آ کر کئی کئی راتوں کو قیام فرماتے تھے۔ ان کے پاس ستو اور پانی ہوتا تھا۔ وہ یادِ الٰہی میں رو رو کر ہلکان ہو جاتے اور ایک ہی دعا ان کے گلابوں جیسے ہونٹوں پر ہر وقت رقصاں ہوتی تھی۔ اے میرے رب میری امت کو بخش دے۔ میں حیران و متعجب ہوتا کہ یہ شخص کون ہے؟ کتنی بے قراری اور بے چینی ہے اس کے لہجے میں، یہ کس اُمت کے لیے دعا مانگ رہے ہیں۔ یہ کون ہے؟

میرے سوال الجھتے گئے۔ میں مزید حیرت و استعجاب کے سمندر میں غوطے کھانے لگا۔ وہ کئی کئی دن اور کئی کئی راتوں کو میرے پاس بلکہ میرے ساتھ ٹیک لگا کر اللہ رب العزت کی بارگاہ میں روتے رہتے۔ پھر کبھی کبھار انہیں کوئی عورت لینے آ جاتی۔ وہ اس کے ساتھ خاموشی سے چل پڑتے۔ پاؤں میں نعلین بھی ٹوٹے ہوئے ہوتے۔ ان کے کُرتے پر کئی کئی جگہوں پر پیوند لگے ہوتے تھے۔ میں اس محترم شخصیت کو دیکھ کر سوچنا شروع کر دیتا کہ یہ کون ہے؟ جس کی بھینی بھینی خوشبو سے میرا سارا گھر بلکہ تمام علاقہ معطر ہو جاتا ہے۔ یہ کون ہے جس کے رخِ انور کو دیکھ کر چاند بھی اپنا آپ چھپا لیتا ہے؟

یہ کون ہے جس کی معصوم اور پاکیزہ گریہ زاری دیکھ کر ہمارے بھی دل دہل جاتے ہیں۔ یہ کون ہے جس کے وجود کی خوشبو میرے انگ انگ میں بس کر میرا وجود معطر کر دیتی ہے۔

لیکن یہ سب کچھ سوچ کر ہی رہ جاتا ہوں۔ اس کا جواب میرے پاس نہ تھا۔ نہ ہی چاند اس اہلیت کا مالک تھا کہ مجھے کچھ بتا سکتا۔ ہاں البتہ اتنا ضرور تھا کہ میں ان کی نورانی وجدانی اور روشن من موہنی سی صورت کا دیوانہ ہو گیا تھا۔'' بڑا نورانی یہ تمام قصہ سنا رہا تھا اور چھوٹے نورانی بڑے قرینے سے پڑے ہوئے اس قصہ کو بغور سن رہے تھے۔ بلکہ تجسس اور حیرت سے بڑے نورانی کی طرف دیکھ بھی رہے تھے۔ اس نے کچھ توقف کے بعد پھر کہنا شروع کیا۔

''ایک رات تجسس کا اختتام ہو گیا۔ وہ سب کچھ ہوا جو میں نے کبھی بھی نہ سوچا تھا۔ اچانک میرا تمام وجود لرز اٹھا مجھے محسوس ہوا کہ میں کسی نادیدہ بوجھ تلے دبا جا رہا ہوں۔ کوئی مجھے اپنی مٹھی میں سمیٹ رہا ہے۔

اچانک ایک پُرنور اور پُروقار آواز نے رات کی تاریکی کا سینہ چیرا۔

''اقراء'' یعنی پڑھ۔

''لیکن میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔'' نورانی چہرے والے نے آواز کی سمت دیکھ کر کہا۔

''اِقراء'' پڑھ۔ آواز نے پھر کہا۔

مگر وہی جواب تھا کہ میں پڑھنا نہیں جانتا۔

آواز والے نے نورانی چہرے والے کے معطر وجود کو اپنے بازوؤں میں لے کر زور سے دبایا۔ دوسری مرتبہ پھر تیسری مرتبہ دبایا گیا تو پھر آواز آئی کہ ''پڑھ'' تو نورانی چہرے والے نے پوچھا۔ ''کیا پڑھوں؟''

تو قرآنِ حکیم کی سورۃ ''العلق'' کی چند آیات نازل ہوئیں۔

نورانی چہرے والے نے حیرت سے پوچھا۔ ''تم کون ہو؟''

تو آواز آئی۔ ''حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں جبرائیل امین ہوں اور آپ کو بشارت دی جاتی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔'' جبرائیل امین علیہ السلام نے آیاتِ اقراء پڑھانے کے بعد آپ کو اپنا تعارف کروایا تو حضور نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سر جھکا لیا اور آپؐ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس وقت آپ کی عمر چالیس سال ایک ماہ تھی۔ اس سے پہلے بھی آپؐ کو خواب اور خیالات کی صورت میں اسرارِ خداوندی کے منکشف

ہونے کا احساس ہوتا تھا۔"

یہ تمام باتیں مکہ مکرمہ سے مشرق کی طرف دو میل کے فاصلے پر واقع "کوہِ حرا" پر رہنے والے بڑے نورانی پتھر نے اپنے کنبہ کے چھوٹے نورانی پتھروں کو بتانے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ وہ جب بھی اداس ہوتا۔ اسی نورانی شکل والے پیارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کرتا تھا اور تا قیامت نہ بھولنے والے واقعہ کو دلچسپی سے سننے والے چھوٹے نورانی پتھروں کو سناتا تھا۔

"اور میں اس بات پر بھی فخر کرتا ہوں کہ میں سرکارؐ کی آمد و نبوت سے پہلے کوہِ حرا تھا، لیکن ان کی آمد کے بعد اب "جبلِ نور" بن گیا ہوں۔ آج میری غمناکی اور اداسی کی وجہ بے سبب نہ تھی۔ بلکہ مدینہ منورہ سے آنے والی سرکار کے وجود کو عقیدت اور احترام دینے والی بھینی بھینی معطر ہوا نے مجھے اداس کر دیا تھا۔ میرا وجود یونہی نم دیدہ نہیں ہے۔ بلکہ میں رو رو کر بھی حضورؐ کی مدح سرائی کروں تو قیامت تک ان کی مدحت میں کچھ بھی نہیں بیان کر سکتا۔

"میرے ساتھیو ہم کتنے عظیم ہیں کہ پیارے آقا کو جب نبوت عطا ہوئی۔ جب جبرائیل امین علیہ السلام آئے۔ جب قرآن کی ابتدائی نورانی آیات کا نزول ہوا تو ہمارے بے جان خاندان کو رب العزت نے شرف بخشا۔ اس کی اس نعمت کا شکر اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے کہ اس کے فرمان کے مطابق اس کے پیارے محبوب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر کثرت سے درود پڑھا جائے تا کہ وہ ہمارے دس درجات مزید بلند فرما دے۔" وہ کچھ توقف کے بعد پھر بولا۔

"اب تہجد کا وقت ہو گیا ہے۔ پھر بعد میں خلقِ خدا کی آمد آمد ہو جائے گی۔ لہٰذا اس پُر نور وقت کو ضائع کرنے کی بجائے آقائے دو جہاں پر درود و سلام کے خزانے اور مدحت سرائی کے پھول نچھاور کرنا شروع کر دو۔"

بڑے "نورانی پتھر" کی ایمان افروز باتیں سن کر سرورِ کائنات کی یاد میں رو رو کر نم ہونے والے "گیلے پتھروں" نے سمجھ جانے والے انداز میں سر ہلایا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح سرائی میں مصروف ہو گئے اور غارِ حرا کا ماحول پُر نور ہوتا گیا۔

☆======☆======☆

"کیا آج پھر کسی سے جھگڑا کر کے آ رہے ہو؟" ماں جی نے دروازہ پار کرتے ہی اس سے سوال کر دیا تھا۔ اس نے حسبِ عادت ماں جی کی طرف مسکرا کر دیکھا اور اندر صحن کی طرف بڑھ گیا۔

"جو بات میں پوچھ رہی ہوں اس کا کوئی جواب ہے تمہارے پاس کہ نہیں؟" ماں جی نے استفسار کیا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ بلکہ صحن میں لگے ہوئے نلکے سے پانی نکال کر ہاتھ منہ دھونے لگا۔ ماں جی خود ہی بڑبڑاتی ہوئی کچن میں داخل ہو گئیں۔

"پتہ نہیں کب سدھرے گا؟ تیرا ابا زندہ ہوتا تو تجھے چار جماعتیں پڑھا کر کوئی افسر لگوا دیتا۔ لیکن وہ بے چارا اپنی بیماری سے ہار گیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح میں تمہارے "اُلاہے" سن سن کر تجھ سے ہار گئی ہوں۔" ماں جی نے چار پائی پر بیٹھ کر روٹی کا انتظار کرنے والے اکلوتے بیٹے کے آگے روٹی رکھتے ہوئے کہا۔ مگر اس کی صحت پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بلکہ وہ چپ چاپ کھانا کھانے میں مشغول ہو گیا۔

"یہ روزانہ دنگا فساد کر کے تجھے کیا ملتا ہے؟" ماں جی نے اس کی طرف استفہامیہ انداز میں دیکھا تو اس نے ماں جی کو ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"خود ہی سمجھاتی ہے کہ روٹی کھاتے وقت بولا نہیں کرتے اور خود ہی سوالوں کا پنڈورا بکس کھول کر بیٹھ جاتی ہو۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ پانی پی کر اوپر کی طرف منہ کر کے بولا۔ "اللہ تیرا شکر ہے" اور سونے کے لیے اسی چار پائی پر لیٹنا چاہا تو ماں جی نے برتن اٹھانے شروع کر دیئے۔ کچھ دیر بعد وہ اس کے ساتھ والی چار پائی پر آ کر لیٹ گئی۔

"میں جانتا ہوں کہ کئی سوالات تیرے من میں مچل رہے ہیں۔ پر میں کیا کروں...... میں جدھر جاتا ہوں۔ دنگا فساد خود ہی میرے پیچھے پہنچ جاتا ہے۔ جیسے میری خوشبو اس کو آ جاتی ہے۔" وہ لیٹتے ہوئے بولا۔ "کیا کروں زندہ رہنے کے لیے بدمعاشی ضروری ہے۔ نہیں تو یہ دنیا تمہیں جینے نہیں دے گی۔ میرا تو یہی نچوڑ ہے بس!"

"میں تیری اس بونگی دلیل سے مطمئن ہونے والی نہیں ہوں۔ یہ بات تو تُو نے کئی مرتبہ کہی ہے۔ میں تیری ماں ہوں تیرے بھلے کے لیے ہی کہتی ہوں۔ میرا پتر، کوئی ڈھنگ کا کام کر لے۔ جس سے ہم ماں بیٹا عزت کی روٹی کھا سکیں۔" ماں جی اسے سمجھا رہی تھیں۔

"اچھا! کون سے کام کر لوں؟ پڑھا لکھا تو ہوں نہیں۔ کیا سائیکلوں کو پنکچر لگایا کروں؟"

"مجھے پتہ ہے تم یہ بھی نہیں کر سکتے۔" ماں جی بھی آج اسے زچ کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ "میں تو کہتی ہوں کہ "میاں جی" کے پاس سے کوئی تعویذ لے آ۔ اللہ کے نیک بندے ہیں وہ کوئی نہ کوئی بندوبست کر دیں گے۔"

وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ "تُو بھی بہت بھولی ہے۔ بھلا کاغذ کے پرزے پر الٹی سیدھی

لکیریں کھینچ کر اس کو چڑے میں "مڑھوا" کر گلے میں لٹکانے سے کوئی بگڑے کام سیدھے ہو جاتے ہیں؟ ایسا ہوتا تو لوگ ہسپتالوں میں جانا چھوڑ دیتے۔ کوئی صدر مملکت بننا چاہتا تو تعویذ پہن کر بن جاتا۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "کوئی بھی ڈھنگ کا کام کرنے کے لیے کھلا روپیہ چاہیے۔ سمجھتی ہے نا۔ روکڑا!! اور یہ سب کچھ اپنے پاس ہے نہیں اور اس کا مطلب ہے کہ اگر روکڑا نہیں ہے تو پھر کوئی عزت والا کام بھی نہیں۔ اس لیے مجھے بدمعاش ہی رہنے دے۔ کم از کم چار بندے رعب شوب تو سہہ لیتے ہیں اور پھر پلس بھی عزت کرتی ہے۔" وہ ابھی یہ باتیں کر ہی رہا تھا کہ بیرونی دروازہ دھڑا دھڑ پیٹا جانے لگا۔ اس نے سامنے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی پر نگاہ دوڑائی تو رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔

دروازہ ایک بار پھر زور زور سے دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ اب باہر سے کسی کی کرخت آواز بھی آنے لگی۔

"جلدی سے دروازہ کھولو!...... ورنہ توڑ دیا جائے گا۔"

"اوہ پایا دروازہ نہ توڑو میں آ رہا ہوں۔" اندر سے اس کی آواز نے باہر والوں کو کچھ دیر کے لیے مطمئن کر دیا۔ وہ حیرت و استعجاب میں مبتلا ماں جی کو چھوڑ کر دروازہ کھولنے کے لیے ڈیوڑھی میں چلا گیا۔

مگر یہ کیا؟ دروازہ کھلتے ہی دس بارہ پولیس والے اسے اندر دھکیلتے ہوئے اس کے گھر میں داخل ہو گئے۔ ماں جی بھی انہیں دیکھ کر حیران ہو گئیں۔ غفران کی وجہ سے پولیس کئی بار ان کے دروازہ تک آئی تھی، لیکن کسی بھی سپاہی کی اتنی جرأت نہ ہوئی تھی کہ وہ غفران کے گھر میں داخل ہوتا، لیکن آج تو معاملہ ہی الگ نظر آ رہا تھا۔ ان سپاہیوں کے ساتھ ایک انسپکٹر بھی تھا۔ جس نے اندر داخل ہوتے ہی غفران کو ہتھکڑی لگانے کا حکم دے دیا تھا۔ کانسٹیبل غفران کو اچھی طرح جانتے تھے اور اس کی بدمعاشی سے دبتے بھی تھے۔ پھر بھی اپنے آفیسر کا حکم ماننے پر مجبور تھے۔ ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر غفران کو ہتھکڑی لگانی چاہی تو اس نے ہاتھ کھڑا کر کے سپاہی کو روک دیا اور غور سے نئے انسپکٹر کو دیکھنے لگا۔ جس کے حکم پر دوسرے سپاہی غفران کی طرف بندوقیں تانے کھڑے تھے۔ اس نے ایک نظر ماں جی پر ڈالی اور بولا۔

"اس وقت اس طرح میرے گھر میں آنے کا کیا مقصد ہے؟ یہ بندوقیں اور یہ ہتھکڑی پرے کر لو۔ تم نئے آئے لگتے ہو۔ غفران کو اچھی طرح جانتے نہیں ہو۔ اس طرح اس وقت میرے گھر میں آنے سے پہلے اپنے ان سپاہیوں سے ہی میرے بارے میں پوچھ لیتے۔"

وہ انسپکٹر کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس کے لہجے اور انداز نے انسپکٹر کو متاثر کیا تھا یا

نہیں لیکن اتنا ضرور تھا کہ وہ اس کی رعب دار آواز، اس کی شخصیت اور اس کے قد کاٹھ سے ضرور متاثر ہوا تھا۔

"تم جیسے بدمعاشوں اور غنڈوں کو اپنا تعارف کروانے کے لیے میں ان کے اڈوں، ڈیروں اور گھروں پر خود ہی پہنچ جاتا ہوں۔ رہ گئی بات یہ کہ اس وقت اس طرح میں تمہارے گھر کیوں آیا ہوں تو میری جان! میرے پاس تمہاری گرفتاری کا وارنٹ ہے۔" انسپکٹر کا لہجہ کافی ٹھہرا ہوا تھا، لیکن گھن گرج اور گونجدار آواز نے اس کے بات کرنے کے انداز کو کافی باوقار بنا دیا تھا۔ وہ پھر گویا ہوا۔

"تمہارے خلاف شیخ عمر حیات نے مقدمہ درج کروایا ہے کہ تم نے ان کی کاٹن فیکٹری میں آگ لگائی ہے۔ آگ پر تو قابو پا لیا گیا ہے، لیکن تم پر قابو پانا مشکل تھا۔"

غفران اور ماں جی یہ خبر سن کر حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگے۔ ماں جی اپنی جگہ سے پہلی بار آگے بڑھیں اور انسپکٹر کے آگے ہاتھ جوڑ کر کہنے لگیں۔

"دیکھیے انسپکٹر صاحب میرا بیٹا چور اور بدمعاش ضرور ہو سکتا ہے۔ مگر اتنا بڑا جرم نہیں کر سکتا۔ میں ماں ہوں اس کی، اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔" وہ گڑگڑانے لگی تو غفران نے اسے پکڑ کر سینے سے لگا لیا۔

"ایسے کام چور اور بدمعاش ہی کرتے ہیں کوئی ولی نہیں کرتے۔ باقی تمام باتیں تھانے میں چل کر ہوں گی۔ لے چلو اسے۔" انسپکٹر نے سپاہیوں کو حکم دیا تو وہ ماں جی کو چھوڑ کر خود ہی ان کے ساتھ چل دیا، لیکن ماں کی ممتا جانتی تھی کہ پولیس اس کے بیٹے کو بہت مارے گی۔ وہ بے چاری مجبور تھی۔ کچھ بھی نہ کر سکتی تھی۔ وہ اللہ سے دعائیں کرنے لگی۔ یک دم اس کے ذہن میں بجلی سی کوندی۔

"کیوں نہ شاہ جی کو بتایا جائے؟ مگر اس وقت تو وہ سو رہے ہوں گے۔ نہیں نہیں وہ جاگ رہے ہوں گے۔ آلِ رسول سوتے ہوئے بھی عبادتِ الٰہی میں مشغول ہوتے ہیں۔"

وہ خود ہی سوال و جواب کر رہی تھی۔

"یادِ الٰہی میں مشغول شاہ جی کو "بے آرام" نہیں کرنا چاہیے۔ خود ہی بھگتے۔ کیوں الٹے سیدھے کام کرتا ہے۔ روزانہ تو روکتی ٹوکتی رہتی ہوں۔ پر!...... کسی کی نہیں مانتا۔ اس کو سزا ملے گی تو نانی یاد آ جائے گی۔ میں کیوں آلِ رسول کی عبادت میں خلل ڈال کر گناہگار بنوں۔" اس نے تڑپتی مچلتی ممتا کو سہلانے کے لیے سادات کے سپرد کر دیا تھا۔

اگلے دن ممتا کی ماری ماں جی تھانے پہنچ گئی۔ غفران کی حالتِ زار دیکھ کر اس کی

آنکھوں نے ساون کی جھڑی لگا دی۔ وہ سلاخوں کو پکڑ کر رو رہی تھی کہ گرتا پڑتا غفران اٹھنے کی ناکام کوشش میں گر پڑا۔ وہ تقریباً گھسٹتا ہوا ماں جی کے پاس پہنچا۔ سلاخوں کے دوسری طرف ماں جی نے دونوں ہاتھ اندر کر کے غفران کو پیار کیا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ لگتا تھا کہ تمام رات اس نے جاگ کر گزاری ہے۔ یا پھر اسے پولیس کے تشدد نے سونے نہ دیا ہو۔ ماں جی کے نرم و گرم ہاتھوں کی گرمی محسوس کر کے ہی غفران کے آنسو نکل پڑے۔ اس کا جسم دُکھ رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے کہ ساری رات اس نے کانٹوں پر گزاری ہو۔ وہ ماں کے ہاتھوں کو چوم کر اپنے ہاتھوں سے ماں جی کے آنسو پونچھنے لگا۔

''میں نے شیخ عمر حیات کی فیکٹری میں آگ نہیں لگائی۔'' وہ بمشکل بول پایا۔

''میں جانتی ہوں پُتر، تُو فکر نہ کر۔ میں صبح ہی شاہ جی کے پاس گئی تھی۔ وہ ابھی آتے ہی ہوں گے۔''

ماں جی نے اسے تسلی دی۔ اتنی دیر میں سپاہیوں کی ایڑیاں بجنے کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ انہوں نے دیکھا تو نیا انسپکٹر تھانہ کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ وہ بڑی رعونت اور تکبر سے چلتا ہوا اپنے آفس میں جانے کی بجائے اِدھر آ گیا جدھر غفران کو بند کیا گیا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ طبیعت صاف ہو گئی ہو گی؟'' اس نے ماں جی اور غفران کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''اب بھی وقت ہے جو میں کہتا ہوں وہ کر لو۔ اس کورے کاغذ پر انگوٹھا لگا دو۔ میں تمہیں جانے دوں گا۔''

غفران کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی لکیر بنی۔ جیسے کہ وہ مسکرانے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ سلاخوں کو پکڑ کر آہستہ آہستہ اٹھتا ہوا بالکل تن کر کھڑا ہو گیا اور انسپکٹر کی بے رحم آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''تمام رات ظلم اور تشدد سہہ کر اپنے ''جثے'' کو اتنا مضبوط کر لیا ہے کہ اب اس پر تمہاری کسی بھی سختی کا اثر نہیں ہو گا۔'' وہ انسپکٹر کو مسکراتے ہوئے دیکھ کر کچھ توقف سے بولا۔ ''چڑیا کا بچہ جب گھونسلے میں ہوتا ہے تو وہ اُڑنے والے پرندوں کو دیکھ کر دل میں یہ خیال کرتا ہے کہ وہ بھی ان کی طرح اڑ سکتا ہے، لیکن اس کی خام خیالی اس کے گمان کو حقیقت میں اس وقت بدل دیتی ہے جب وہ پہلی بار ہی اونچی اڑان بھر لیتا ہے اور کسی نہ کسی شکرے کا شکار بن جاتا ہے۔'' وہ خاموش ہوا تو انسپکٹر نے بولنے کے لیے منہ کھولا، لیکن غفران نے ہاتھ کے اشارے سے اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا کہ ابھی اس کی بات ختم نہیں ہوئی ہے۔

''بالکل اسی طرح تم نے اس علاقہ میں آ کر یہ جاننے کی کوشش نہیں کی یہاں کے

شکرے تم جیسی چڑیا کا شکار کرنے کے لیے کتنے بے چین ہیں۔ تم نے اپنی دانست میں انتہائی اونچی اڑان بھر کر زندگی کی بہت بڑی غلطی کر لی ہے۔ اب اس کا خمیازہ بھگتنے کے لیے تیار رہنا۔''

ماں جی خاموشی سے غفران اور انسپکٹر کی گفتگو سن رہی تھیں۔

انسپکٹر غور سے غفران کی طرف دیکھ کر اپنے آفس میں چلا گیا۔

''تمہیں ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ وہ تو پہلے ہی تمہارا دشمن ہے۔ پتہ نہیں کہاں سے آ گیا ہے یہ۔''

ماں جی نے انسپکٹر کے جاتے ہی غفران سے کہا۔ اتنی دیر میں شاہ جی تھانہ کی حدود میں داخل ہوئے ماں جی نے شاہ جی کو دیکھ کر احتراماً نظریں جھکا کر سلام کیا۔ ان کے ساتھ اسمٰعیل بھی تھا۔ جو کہ شاہ جی کے پیچھے پیچھے مؤدبانہ انداز میں چلا آ رہا تھا۔

شاہ جی سیدھے ان کی طرف بڑھے۔ انہوں نے ماں جی کے سلام کے جواب میں پیار سے داہنا ہاتھ ان کے سر پر پھیرا۔

غفران نے بھی ہاتھ ماتھے پر لے جا کر شاہ جی کو سلام کیا تو وہ مسکرا کر اس کو مخاطب ہوئے۔

''کام دھندے تو تمہارے سبھی غلط ہیں، لیکن اس معاملہ میں تم بے گناہ ہو۔ اسی لیے میں تمہاری ضمانت کے لیے آیا ہوں اور ہمیشہ کی طرح پُر امید بھی ہوں کہ ایک دن تم وہ کام کرو گے۔ جس پر تمہاری یہ بوڑھی ماں فخر کرے گی۔'' وہ ماں جی کی طرف مڑے اور پھر گویا ہوئے۔

''تم ابھی سے گھبرا گئی ہو۔ ابھی تو بہت سی مشکلات اور کٹھن مراحل سے گزرنا ہے تمہارے اس بیٹے کو۔ اسے کندن بننا ہے۔ ذاتِ الٰہی پر شاکر رہو۔ وہ بہت نوازنے والا ہے۔''

پھر شاہ جی اسمٰعیل کے ساتھ انسپکٹر کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔ سپاہی نے اندر داخل ہوتے ہی شاہ جی کو کرسی پیش کی۔ وہ شاہ جی کے مان مرتبے کو پہچانتا تھا، لیکن سپاہی کی یہ حرکت انسپکٹر کو بُری لگی کہ ایک شخص کے لیے احتراماً کرسی پیش کرنے کی کیا تک ہے؟

''کہیے بابا جی میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' انسپکٹر نے شاہ جی کے کرسی پر بیٹھتے ہی پوچھا۔ وہ اب شاہ جی کے بالکل سامنے ٹیبل کے دوسری طرف تھا۔ جبکہ اسمٰعیل ہاتھ باندھ کر باادب کھڑا انسپکٹر کو گھور رہا تھا کہ شاہ جی کی مٹھاس بھری آواز سن کر چونک پڑا۔

’’غفران کو چھوڑ دیں انسپکٹر صاحب۔ میں اس کی ضمانت دینے آیا ہوں۔‘‘

’’آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟ بابا جی یہ مجرم ہے۔ اس نے شیخ عمر حیات کی کاٹن فیکٹری میں آگ لگائی ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ میں اسے چھوڑ دوں اور پھر آپ کے کہنے پر کیسے چھوڑ دوں؟‘‘ وہ کرسی سے تھوڑا سا آگے ہو کر جھکتا ہوا بولا۔ ’’کیا آپ آئی جی صاحب ہیں۔ کوئی وزیر وغیرہ ہیں۔ کوئی صدر یا پھر ہائی کورٹ کے جج ہیں جو انسپکٹر اشرف چاولہ کو حکم دے رہے ہیں؟‘‘

اس کے گستاخانہ رویئے کو اسمٰعیل برداشت نہ کر سکا۔ وہ یک دم آگے بڑھا اور اپنے بائیں ہاتھ سے انسپکٹر اشرف چاولہ کی گردن دبوچ لی اور اسے زمین سے تین چار فٹ بلند کر دیا۔ انسپکٹر کی آنکھیں گلا دب جانے سے باہر نکل آئی تھیں۔ بس یوں لگتا تھا کہ وہ کسی شکنجے میں جکڑا گیا ہے۔ اتنی طاقت اور پھر زمین سے تین چار فٹ کسی انسان کو محض بائیں ہاتھ سے گردن پکڑ کر بلند کر دینا عام انسان تو کیا بلکہ خاص انسان کا بھی کام نہ تھا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ پاس کھڑا ہوا سپاہی دیکھتا ہی رہ گیا۔

’’چھوڑ دو اسمٰعیل اس کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ چھوڑ دو یہ میرا حکم ہے۔‘‘ شاہ جی کی آواز کا سحر اسمٰعیل کی سماعت سے ٹکرایا تو اس نے اشرف چاولہ کو فضا میں ہی چھوڑ دیا۔ وہ دھپ سے اپنے ٹیبل پر آ گرا۔ وہ انتہائی خوفزدہ لگ رہا تھا، لیکن اپنے عہدہ اور سپاہی کی موجودگی میں اس کی اس طرح بے عزتی نے اسے مزید ’’تپا‘‘ دیا تھا۔

وہ بار بار اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا مل رہا تھا اور شاہ جی اور اسمٰعیل کو دھمکیاں بھی دے رہا تھا۔

’’ایسا کیس بناؤں گا بڈھے کہ تمہاری نسلیں تک جیل میں سڑیں گی۔ تم نے صرف میرا نام سنا ہے۔ تُو جانتا نہیں کہ چاولہ کس بلا کا نام ہے؟ اور تم ......‘‘ وہ اسمٰعیل کی طرف متوجہ ہوا۔ ’’تجھے تو ایسا الٹا لٹکاؤں گا سالے کہ تیری ساری مردانگی تیری شلوار کے رستے بہہ جائے گی۔‘‘

وہ اسمٰعیل کو ایک بار پھر اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور میز کے دوسرے کونے پر کھڑا ہو گیا۔ جبکہ شاہ جی کا اشارہ پا کر اسمٰعیل وہیں رک گیا۔ جیسے چابی سے چلنے والے کھلونے کی چابی ختم ہو گئی ہو۔ انسپکٹر اشرف چاولہ خوفزدہ ہو گیا تھا، لیکن وہ غفران کو بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ بے شک اس علاقہ میں نیا نیا آیا تھا۔ مگر شیخ عمر حیات کے تعلقات سے اچھی طرح واقف تھا اور پھر ’’ہدیہ‘‘ بھی لے چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ مزید کچھ

ہوتا۔ ایس پی صاحب کمرے کے اندر داخل ہوئے۔ انہیں دیکھتے ہی چاولہ اور سپاہی کی سٹی گم ہو گئی۔ دونوں کی ایڑیاں مؤدب انداز میں بج اٹھیں۔ جبکہ شاہ جی اپنی کرسی پر اور اسمٰعیل اپنی جگہ پر خاموش رہے۔ ایس پی نے اندر داخل ہوتے ہی چاولہ کے سیلوٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے۔ شاہ جی کو جھک کر سلام کیا اور ان کے قدموں میں بیٹھنے لگا لیکن شاہ جی نے انہیں کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور بولے۔

’’تم اس وقت اپنی ڈیوٹی پر ہو اور سرکاری لحاظ سے تمہیں اس کرسی پر بیٹھنا چاہئے۔‘‘

انہوں نے ٹیبل کے دوسری طرف کرسی کی طرف اشارہ کیا تو ایس پی، چاولہ کو حیرت زدہ چھوڑ کر اس کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مگر انتہائی مؤدب طریقے سے۔

’’آپ نے خوامخواہ ہی زحمت کی۔‘‘ وہ شاہ جی سے مخاطب ہوا۔ ’’آپ مجھے بتا دیتے جو بھی کام تھا۔ مجھے نہیں علم تھا کہ آپ نے مجھے اس لیے فون کیا تھا کہ آپ سے ملاقات اس طرح تھانے میں ہو گی۔‘‘ چاولہ نے ایس پی صاحب کی مؤدبانہ گفتگو سے اندازہ لگا لیا تھا کہ صاحب بھی شاہ جی کے مرید ہیں اور اب اس کی کم بختی شروع ہونے والی تھی۔

’’میں تو صرف غفران کی ضمانت کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ آپ اس کو چھوڑ دیں اور جو بھی ضروری کاغذی کارروائی ہے، پوری کر لیں میں ادھر ہی بیٹھا ہوں۔‘‘ شاہ جی انتہائی متانت سے بولے۔ ایس پی صاحب چاولہ کی طرف مڑے۔

’’کیوں بھئی غفران پر کیا کیس ہے؟ اور تم نے چارج سنبھالنے سے پہلے ہمیں انفارم کیوں نہیں کیا؟ کون ہو؟ کیا نام ہے؟ کہاں سے آئے ہو؟ غفران پر کیا مقدمہ ہے؟

’’سر اس نے شیخ عمر حیات کی کاٹن فیکٹری میں آگ لگائی ہے۔ جس سے ان کا لاکھوں کا نقصان ہو گیا ہے۔ انہوں نے غفران کو ملزم نامزد کرتے ہوئے اس کے خلاف مقدمہ درج کروایا ہے۔‘‘ چاولہ نے ایس پی صاحب کو اپنے تئیں مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

’’جو ایف آئی آر درج کی ہے مجھے دکھاؤ۔‘‘

چاولہ گھبرا گیا یہ یقیناً اس کے لیے افتاد تھی۔ کیونکہ وہ تو صرف شیخ عمر حیات کے کہنے پر ہی غفران کو پکڑ کر لے آیا تھا اور رات بھر تشدد کرتا رہا تھا۔ اب وہ شیخ عمر حیات کو کوس رہا تھا جس نے اس کا تبادلہ یہاں کروا کے اپنا ذاتی عناد اور دشمنی نکالنے کے لیے غفران پر جعلی مقدمہ درج کروایا تھا۔ حالانکہ چاولہ نے کوئی ایف آئی آر نہ کاٹی تھی۔ غفران کو گرفتار کرتے وقت بھی اس کی جیب میں کوئی سرکاری کاغذ نہ تھا۔ اگر غفران وارنٹ مانگ لیتا تو چاولہ کو

بتایا گیا تھا کہ وہ اَن پڑھ ہے۔ کسی بھی سرکاری کاغذ سے مرعوب ہو جائے گا، لیکن غفران نے وارنٹ کا سن کر ہی اس کے ساتھ چلنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اسی وجہ سے چاولہ نے بھی کوئی ایف آئی آر نہ کاٹی بلکہ غفران سے سادہ کاغذ پر انگوٹھا لگوانے کے لیے رات بھر ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا تھا۔ بلکہ اس پر تھرڈ ڈگری کا بھی استعمال کیا تھا۔ مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا تھا۔ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکنے کے بعد وہ ایس پی صاحب سے معذرت کرنے لگا۔

''سر میں ایف آئی آر درج کرنے ہی والا تھا کہ شاہ صاحب آ گئے۔ میں ان کی خدمت میں مصروف ہو گیا تھا۔'' اس نے سفید جھوٹ بول دیا جو ایس پی کی جہاندیدہ نظروں نے چاولہ کے چہرے کا طواف کرتے وقت محسوس کر لیا تھا۔

''جاؤ اور جا کر اسے آزاد کر دو تمہارے ساتھ جو بھی ہو گا وہ بعد میں ہو گا۔''

ایس پی صاحب کے حکم کی فوری تعمیل کے لیے وہ خود جلدی سے باہر نکل گیا۔ تھانے کا تمام عملہ الرٹ کھڑا تھا۔ جیسے ایس پی نہیں بلکہ ملک الموت آ گیا ہو۔ اس نے باہر نکلتے ہی حوالدار کو حکم دیا کہ غفران کو آزاد کر دو، لیکن حیرت کی انتہا تب ہوئی جب اس نے دیکھا کہ غفران اور ماں جی سامنے بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اسی وقت شاہ جی بھی کمرے سے باہر آئے۔ ان کے پیچھے اسمٰعیل اور ایس پی صاحب مؤدبانہ انداز میں کھڑے تھے۔

''اپنے آنسوؤں کو سنبھال کر رکھو نذیراں۔ ابھی بہت سی منازل تمہارے بیٹے کی منتظر ہیں۔'' شاہ جی نے ماں جی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''اسے بھی کچھ سمجھا دیں شاہ جی، اس نے میری جان سولی پر ٹانگی ہوئی ہے۔'' ماں جی نے بدستور نظریں جھکائے ہوئے غفران کی طرف دیکھ کر کہا۔ تو شاہ جی دھیرے سے مسکرا دیئے۔

''یہ بھی سمجھ جائے گا۔ بس اسے قلعی کرنا پڑے گا۔ ابھی وقت نہیں آیا۔ اسے کہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ یہ شیطان کے شکنجے میں ہے۔ ابھی کوئی بھی بات اس کی سمجھ میں نہ آئے گی۔ تم خوامخواہ ہی اپنا خون نہ جلایا کرو۔ ہاں البتہ اسے نمازِ فجر کے لیے ضرور جگایا کرو۔''

انہوں نے اسمٰعیل کی طرف دیکھا جو اشارہ سمجھ کر شاہ جی کے پیچھے چل پڑا اور ماں جی بھی غفران کو لے کر تھانے کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئیں۔ غفران بہت آہستہ آہستہ چل رہا تھا ایسا لگتا تھا کہ جسم میں کوئی بھی ہڈی سلامت نہ رہی ہے۔

انسپکٹر چاولہ کو ایس پی صاحب نے خاصی سرزنش کے بعد چھوڑا تھا۔ ایس پی صاحب

کے جانے کے بعد چاولہ نے سکون کا سانس لیا، لیکن شاید سکون اس کی زندگی سے غائب ہو گیا تھا۔ فون کی بیل نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ اس نے غصہ سے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے شیخ عمر حیات کی آواز سن کر وہ قدرے سنبھل کر بیٹھ گیا اور تمام تفصیل من وعن بیان کرنے لگا۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ دوسری طرف سے بھی کوئی خیر کی خبر نہیں ہے بلکہ جھڑکیاں ہی جھڑکیاں ہیں۔ آج دن ہی منحوس تھا۔ اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

☆======☆======☆

''یہ موا شیخ عمر حیات تمہارے پیچھے کیوں پڑ گیا؟'' ماں جی نے گھر میں داخل ہوتے ہی پہلا سوال داغ دیا تھا۔ ''تم نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟''

ماں جی نے غفران کو چارپائی پر لٹا دیا تھا۔ وہ کراہتا ہوا الٹا لیٹ گیا تھا۔ ماں جی اس کے لیے دودھ گرم کر کے لے آئیں۔ اس میں ہلدی ڈالی ہوئی تھی۔ انہوں نے یہ دودھ زبردستی غفران کو پلایا تھا۔

''اچھا میرا پتر آرام کر لے۔ کم بختوں نے رات بھر تمہیں سونے نہ دیا ہو گا۔'' وہ پیالہ واپس اندر لے گئیں۔ واپس آئیں تو انہوں نے اپنی بوسیدہ سی چادر سر پر اوڑھی ہوئی تھی۔ جیسے کہیں جانے کی تیاری کر رہی ہو۔ غفران بھی جانتا تھا کہ ماں جی کسی کے گھر میں کام کرتی ہیں۔

''اچھا میرا پتر اگر تو کہے تو میں حاجی عبداللہ صاحب سے بات کروں؟'' انہوں نے استفہامیہ انداز سے پوچھا تو غفران بھڑک اٹھا۔

''رہنے دے تجھے کیا پڑی ہے ان معاملات میں پڑنے کی۔ وہ پہلے ہی آپس میں ایک دوسرے کے خلاف ہیں۔''

وہ چارپائی سے اٹھتا ہوا بولا اور بمشکل کھڑا ہوا اور ماں جی کو لے کر باہر کے دروازے تک آیا تاکہ ان کے جانے کے بعد دروازہ بند کر لے۔

''ماں جی! اگر آپ نے حاجی صاحب سے کوئی بات کی تو میں کبھی گھر نہیں آؤں گا۔ بس یاد رکھنا۔'' اس نے ماں جی کو دروازہ سے باہر نکلتے ہوئے پکار کر کہا۔

''میں تیری ماں ہوں۔ کوئی دکاندار نہیں ہوں۔'' ماں جی بھی ہاتھ نچا کر بولیں۔

''جسے تو تڑیاں لگا کر ٹیکس وصول کرے گا۔ کہہ جو دیا کہ نہیں بتاؤں گی۔ بس یاد رکھوں گی۔''

ان کا انداز بھی اپنے بیٹے جیسا تھا۔

وہ دروازہ بند کر کے واپس اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ رات بھر جاگا ہوا تھا۔ خوب سونا چاہتا تھا۔ مگر جسم میں اٹھنے والی درد کی تیز ٹیسیں اسے جاگنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ وہ تین دن پہلے پیش آنے والے واقعات پر غور کرنے لگا۔ شیخ عمر حیات نے اسے آگ لگانے کے جرم میں کیوں پھنسوایا تھا؟ وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ شیخ عمر حیات کے تعلقات کافی اوپر تک ہیں۔ غفران جیسے تو محض کٹھ پتلیاں ہوتے ہیں۔ جن کی ڈور شیخ عمر حیات جیسے لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور شیخ عمر حیات جیسے لوگ روپیہ پیسہ اور اپنی ذاتی پہنچ سے غفران جیسی پتلی کی کبھی بھی ڈور کاٹ سکتے تھے۔ اب انتہائی محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ کیونکہ وہ شیخ عمر حیات کی اچھی خاصی تعلق داری سے بخوبی واقف تھا۔ حکومتی ایوانوں میں بھی شیخ عمر حیات کی دعا سلام تھی۔ جبھی تو اس نے اپنی مرضی سے انسپکٹر چاولہ کو راتوں رات ہی دوسرے علاقہ سے ٹرانسفر کروالیا تھا۔ کیونکہ غفران پر جھوٹا کیس بنانے کے لیے ایسے ہی انسپکٹر کی ضرورت تھی، جو غفران کا واقف کار نہ ہو اور کسی بھی کام کو بلا حیل وحجت شیخ عمر حیات کے کہنے پر کر گزرے۔ غفران چارپائی پر لیٹا ہوا ذہن میں اٹھنے والی الجھنوں کو سلجھا رہا تھا۔ مگر ہر بار سرا ہاتھ میں آنے کی بجائے نکل جاتا تھا۔ جس سے سوچوں اور پریشانیوں کی ڈور مزید الجھ جاتی تھی۔

شیخ عمر حیات کو اس طرح جہالت اختیار نہیں کرنی چاہئے تھی۔ کچھ بھی تھا غفران کو یہ ضرور علم تھا کہ ہمارا اسلام، ہمارا مذہب اس کام کو سختی سے منع کرتا ہے۔ وہ تو اَن پڑھ تھا۔ مگر شیخ صاحب کی تمام فیملی پڑھی لکھی تھی اور احکام خداوندی کو بخوبی جانتی تھی، اور تو اور اس نے ''ملیحہ'' کو بھی جاہلیت کے جال کی ڈوریوں میں الجھتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ اس کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتا تھا، لیکن صرف عزت وتوقیر کی حد تک۔

''احمد باؤ بھی پاگل لگ رہا تھا۔'' احمد باؤ کا نام یاد کرنے پر اسے ایک ایک بات یاد آ گئی تھی اور اب اسے خیال آ رہا تھا کہ شیخ عمر حیات نے اس پر جھوٹا الزام کیوں لگایا تھا اس کی گتھی سلجھنے والی تھی۔ سوچوں اور درد کی ٹیسوں نے اسے ایک بار پھر شیخ عمر حیات کے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔

''غفران آج ہمارے پیر صاحب آ رہے ہیں اس لیے ہر کام بڑی احتیاط اور سلیقے سے ہونا چاہئے۔'' شیخ عمر حیات نے اسے ہدایت دی۔

وہ اس وقت شیخ عمر حیات کی کوٹھی کے لان میں موجود تھا۔ وسیع وعریض کوٹھی کی ہر چیز ہی خوبصورت تھی۔ اس کے مکین بھی بڑے زندہ دل اور خوبصورت تھے، لیکن شیخ عمر حیات

ایسا فرد تھا جس کے چہرے پر خباثت ٹپکتی رہتی تھی۔ وہ ہر جائز وناجائز دھندے سے دن رات اپنی دولت کو بڑھانے میں لگا رہتا تھا۔ اب بھی کوئی پیر صاحب پکڑ لیے تھے۔ جنہوں نے یہ بتایا تھا کہ تم پر کالا علم کروایا گیا ہے۔ میں اس کا توڑ جانتا ہوں۔ بس شیخ صاحب نے انہیں اپنے گھر آنے کی دعوت دے ڈالی۔ وہ پیر صاحب سے خاصا متاثر نظر آتا تھا۔ جبھی تو تمام ملازموں کو احکامات کی بوچھاڑ میں بھاگ دوڑ کرنی پڑ رہی تھی۔ غفران بھی اس کے لیے کام کرتا تھا، لیکن یہ گھریلو کام کاج اس کے لیے وبال جان تھے۔ وہ ان بکھیڑوں سے دور بھاگتا تھا۔ کیونکہ کسی سے ٹیکس وصول کرنا۔ کسی سے بدمعاشی کے زور پر کوئی کام نکلوانا۔ کسی منسٹر یا ایم این اے کو بلیک میل کرنا اس کے لئے انتہائی آسان تھا۔ جبکہ گھریلو انتظامات اس کے لیے کٹھن اور صبر آزما ہوتے تھے۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ انکار کر دے، لیکن پھر وہ اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تھا کہ دیکھیں کون سا پیر شیخ صاحب کی تقدیر مزید چمکانے کے لیے آ رہا ہے۔

اس نے شام تک تمام دیکھ بھال کروالی تھی۔ کرنا کیا تھا۔ پیر صاحب نے لان میں آ کر بیٹھنا تھا۔ بس لان کو خوبصورت کرنے کے لیے اس نے مالی کو کہہ کر مزید پھول اور گملے منگوالئے تھے۔ نوکر چاکروں کی کمی نہ تھی، لیکن شیخ عمر حیات کی خباثت غفران کو بعض اوقات اس کی اوقات یاد دلانے کے لیے اس کے چہرے پر برسنے لگتی تھی۔ وہ غفران کو بھی یاد کرواتا رہتا تھا کہ وہ ''کمی کمین'' ہے۔ اس کے ٹکڑوں پر پلتا ہے۔ کبھی کبھی وہ غفران کو خود ہی کسی جھوٹے کیس میں پھنسوا دیتا اور خود ہی اس کی ضمانت کروا دیتا تھا۔ بس اپنی ''چودھراہٹ'' قائم رکھنے کے لیے۔

پیر صاحب کی گاڑی بنگلے میں داخل ہوئی تو شیخ عمر حیات ننگے پاؤں بھاگ کر گئے اور بیگم صاحبہ تو ایسے تھیں جیسے پیر صاحب خاص ان کے لیے ہی آئے ہوں۔ وہ تو بچھی جا رہی تھیں۔ شیخ عمر حیات نے آگے بڑھ کر گاڑی کا اگلا دروازہ کھولا اور جھک کر پیر صاحب کو سلام کیا۔ پیر صاحب باہر نکلے اور بیگم صاحبہ نے بھی کافی جھک کر سلام کیا تو پیر صاحب کی آنکھیں چندھیا گئیں، لیکن انہوں نے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا اور بیگم صاحبہ کے سلام کا جواب مسکرا کر دیا۔

''ادھر آئیے حضور۔'' شیخ صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے لان کی طرف چلنے کو کہا۔ وہ پیر صاحب کے پیچھے پیچھے ایک زرخرید غلام کی طرح ہاتھ باندھ کر چلا آ رہا تھا۔ یہی حال بیگم صاحبہ کا تھا۔ ملیحہ اور احمد باؤ ابھی تک نہیں آئے تھے۔ وہ غالباً پیر صاحب کے لیے

اعلیٰ سے اعلیٰ کھانا لینے گئے ہوئے تھے۔ کھانا تو ایک فون کال پر بھی منگوایا جا سکتا تھا، لیکن شیخ صاحب کا حکم تھا کہ ان کے دونوں بچے خود جائیں اور پیر صاحب کے لیے سپیشل ڈشز کا بندوبست کریں۔

غفران دور لان میں کھڑا یہ تمام معاملہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے پیر کی چال سے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ بھی کوئی اسی کی قماش کا ہی بندہ تھا، لیکن لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر پیر بن گیا تھا۔ کیونکہ غفران کی عمر ہی ان جیسے ''کن ٹٹوں'' میں گزری تھی۔

اس نے قریب آنے پر بھی آگے بڑھ کر پیر صاحب کو سلام نہ کیا۔ کیونکہ اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ غلط آدمی ہے اور وہ ہمیشہ اپنے دل کی مانتا آیا تھا۔ شیخ صاحب نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی لیکن وہ احترامِ پیر میں کچھ نہ بولا۔

پیر صاحب لان میں بچھی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھ چکے تھے۔ ان کے ڈرائیور کو ایک الگ جگہ پر بٹھا دیا گیا تھا۔ بنگلے کے تمام ملازم شیخ صاحب کی طرح ہاتھ باندھ کر عاجزی سے کھڑے تھے ماسوائے غفران کے۔

پیر صاحب نے شیخ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تو وہ نیچے ہی گھاس پر بیٹھ گیا اور بیگم صاحبہ بھی پیر صاحب کے پاؤں دبانے لگیں۔ وہ ''مسٹنڈا پیر'' آہستہ آہستہ پان چبا رہا تھا۔ جبکہ اس کی نظریں غفران کی طرف ہی لگی ہوئی تھیں۔ شاید اس نے بھی سمجھ لیا تھا کہ غفران بھی کوئی پہنچی ہوئی چیز ہے اور غفران بھی پیر صاحب کے حلیہ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

لمبے لمبے بال جو تیل لگا کر درمیان میں مانگ نکال کر کانوں سے بھی نیچے تک رکھے ہوئے تھے۔ کلف لگے کاٹن کے سفید شلوار قمیض کو پیر نے اس طرح پہنا تھا جیسے کہ اس نے کپڑے پر احسان کیا ہو۔ پاؤں میں پشاوری چپل اور کاندھے پر براؤن رنگ کا ''پٹکا'' یا ''صافہ'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس کی سرخ آنکھیں اور پان سے سرخ ہونٹ غفران کو ذرا بھی اچھے نہ لگے۔ اسے خواہ مخواہ ہی اس پیر سے نفرت ہونے لگی۔ پیر کی عمر کوئی چالیس سال ہو گی۔ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی داڑھی تھی۔ جو غفران کے ذہن کے مطابق لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے رکھی گئی تھی۔

غفران نے پیر کے وجود کا اچھی طرح سے جائزہ لے لیا تھا۔ جبکہ دوسری طرف پیر نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ غفران شیخ عمر حیات کی طرح گھڑے کی مچھلی نہیں ہے، بلکہ چبھنے والا کانٹا ہے لیکن وہ ایسے کانٹے نکالنا خوب جانتا تھا۔ کیونکہ وہ ''پیر'' تھا اور شیخ عمر حیات جیسے پڑھے لکھے جاہلوں کو پھانسنے کے لیے اس نے ایک کامیاب پھندہ تیار کیا ہوا تھا۔ جس

کا نام ''ڈاکٹر شارق'' تھا۔ اس نے ڈاکٹر شارق کا پرائیویٹ کلینک پوش علاقے میں بنوایا تھا۔ جہاں مریضوں کی جیبوں سے رقم نکلوانا کوئی مشکل نہ ہوتا تھا۔ اگر کوئی مریض شفایاب نہ ہونے کی شکایت کرتا تو ڈاکٹر شارق اسے پیر صاحب کا بتاتا اور پیر صاحب اپنے ''فن'' سے اس مچھلی کو اپنے فریب کی کنڈی میں پھانس لیتے تھے۔ ایسا ہی شیخ عمر حیات کے ساتھ بھی ہوا تھا۔

شیخ عمر حیات کو زمین پر بیٹھے دیکھ کر تمام ملازم حیران بھی تھے اور خدا کا شکر بھی کر رہے تھے کہ جس زمین پر یہ شخص اکڑ اکڑ کر چلتا ہے، آج اس پر کیسے مسکین بن کر بیٹھا ہے۔ چاہے کچھ دیر کے لیے ہی سہی انہوں نے شیخ کو کسی شخص کے پاؤں دباتے ہوئے پہلی بار دیکھا تھا اور بیگم عالیہ، وہ تو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھیں۔ آج کیسی یتیم بن کر پیر جی کے پاؤں دبا رہی تھیں۔

ملیحہ اور احمد باؤ نے لان میں داخل ہوتے ہی دیکھ لیا تھا کہ پیر صاحب کی خدمت میں ان کے والدین ہمہ تن مصروف ہیں۔ احمد باؤ نے گاڑی سے کھانا نکالنے کے لیے ملازم کو کہہ دیا تھا۔ جبکہ ایک اور ملازم پیر صاحب کی خدمت میں طرح طرح کے مشروب لے کر ٹرالی سجائے ہوئے آ رہا تھا۔ جس پر بڑی نفاست سے مشروبات سجے ہوئے تھے۔

''آپ نے اپنے قیمتی وقت سے وقت نکال کر ہم پر یقیناً احسان کیا ہے۔'' شیخ عمر حیات نے ملیحہ اور احمد باؤ کو آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ وہ پیر صاحب سے گفتگو شروع کرنے کے لیے بے تاب تھا، لیکن ابھی تک پیر نے اپنی زبان سے کوئی لفظ نہ نکالا تھا۔ بلکہ ملیحہ کو بغور دیکھنے کے بعد اس کی آنکھوں میں ہوس کی تیرتی ہوئی لکیریں اور گناہ کی چمک غفران نے دیکھ لی تھی۔ ملیحہ اور احمد باؤ نے بھی پیر صاحب کو جھک کر سلام کیا اور والدین کی تقلید میں زمین پر ہی بیٹھ گئے تھے۔ پیر کی ہوسناک نگاہیں ملیحہ کے پُر شباب وجود کا طواف کر رہی تھیں۔ جبکہ وہ احترام میں نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ اب احمد باؤ بھی ایک ٹانگ دبا رہا تھا اور عالیہ بیگم نے جھکتے ہوئے پیر صاحب کو بڑے احترام سے شربت کا گلاس پیش کیا تو وہ تھوڑا سا جھک گئی تھی اور یہ لمحہ پیر کے لیے بہت قیمتی تھا۔

اس نے اپنی آنکھوں کی پیاس کو عالیہ بیگم کے جھکنے سے ہی بجھا لیا تھا۔ اس نے گلاس لے کر گھونٹ گھونٹ پینا شروع کر دیا۔ آدھا گلاس پینے کے بعد اس نے گلاس ملیحہ کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ لو اسے پی لو۔ تمہاری تمام حسرتیں پوری ہو جائیں گی۔'' ملیحہ نے پیر صاحب

سے گلاس لے کر پینا شروع کر دیا وہ سوچ رہی تھی کہ یقیناً پیر کو پتہ ہے کہ وہ کس کو پسند کرتی ہے۔ کیا چاہتی ہے، لیکن اس کا باپ اس کی پسند کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ اب وہ پیر صاحب کو کہہ کر اپنی مرضی پوری کر سکتی تھی۔ پیر صاحب کی زبان سے یہ پہلے الفاظ تھے جو اس بنگلے کے مکینوں نے سنے تھے اور وہ بھی ملیحہ سے مخاطب تھے۔

''شیخ صاحب تمہارے گھر میں آسیب ہے۔'' پیر صاحب نے پیشہ ورانہ لہجے میں عمر حیات کے سر پر بم پھینکا۔ شیخ عمر حیات اس وقت دنیا میں سب سے مسکین خود کو ہی سمجھ رہا تھا۔ وہ نہایت عاجزی سے بولا۔

''سرکار میری تو کسی سے دشمنی نہیں ہے۔ بھلا مجھے کوئی کیوں تنگ کرے گا؟'' اس کے لہجے کی عاجزی اور مسکینیت دیکھ کر پیر صاحب نے دوسرا پتہ پھینکا۔

''جو سب سے عاجز اور شریف ہو۔ جو کسی کو تنگ نہ کرتا ہو۔ دشمن بھی اسی کے ہوتے ہیں۔'' کچھ دیر توقف کے بعد پیر صاحب نے اپنی کلف لگی قمیض سے ایک پان نکالا اور کھانا شروع کر دیا۔ جبکہ شیخ صاحب نے وہ کاغذ جس میں پان لپٹا ہوتا ہے۔ بڑے احترام سے اپنے ہاتھوں میں بھینچ لیا۔

''تمہاری بیوی تمہاری ہمدرد ہے۔'' پیر نے عالیہ بیگم کے دل میں بھی جگہ بنانے کے لیے اس کی تعریف کی۔ ''دکھ سکھ میں تمہارے ساتھ ہے۔ اس گھر سے آسیب دور کرنے کے لیے ہمیں بڑی سخت محنت کرنا ہوگی۔ تمہیں تھوڑی سی تکلیف تو ہوگی، لیکن باقی تمام زندگی سکون سے گزارو گے۔''

''آپ حکم کریں۔ آپ کے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔'' اس بار احمد باؤ نے جواب دیا تو پیر صاحب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ احمد باؤ کو پہلی بار دیکھ رہا ہو۔

''کہیں یہ لڑکا اس کی راہ میں رکاوٹ نہ بن جائے۔'' پیر نے اپنے دماغ میں آنے والے اس امکان کو رد نہ کیا تھا۔ اس کے لیے بھی جال بچھانا ضروری ہو گیا تھا۔

''ہمیں تمہاری جان کی ضرورت نہیں بیٹا بلکہ پرواہ ہے اور ہاں تمہاری جان تمہیں ضرور ملے گی۔'' پیر صاحب نے اندھیرے میں تیر چلایا تو وہ ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔

کیونکہ احمد باؤ نے اس کی بات سن کر شرمندہ ہو جانے والے انداز میں نظریں جھکا لی تھیں۔ جس عمر میں احمد باؤ تھا۔ اس عمر میں تو سبھی لڑکے کسی نہ کسی لڑکی میں دلچسپی لیتے ہیں اور پھر احمد باؤ کالج سٹوڈنٹ تھا۔ سونے پہ سہاگہ یہ کہ وہ ماڈرن فیملی سے تعلق رکھتا تھا۔ کسی

نہ کسی لڑکی میں تو انٹرسٹڈ ہوگا۔ پیر صاحب کے اندازے نے اس بات کی تصدیق کر دی تھی۔ احمد باؤ کے نظریں جھکا لینے سے ہی اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ بھی گھڑے کی مچھلی ثابت ہوگا۔

''شیخ صاحب، آسیب دور کرنے کے لیے ہمیں ایک علیحدہ کمرا درکار ہوگا۔ جس میں ہم اپنا چلہ کریں گے۔ تمہاری طرف کوئی بھی آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ہمیں یہ بتاؤ کہ تمہاری سب سے بڑی خواہش کیا ہے؟'' پیر نے شیخ کو مکمل گرفت میں لینے والے انداز میں کہا تو شیخ کی بتیسی نکل آئی۔

وہ ہاتھ جوڑ کر عاجزی سے بولا۔ ''آپ ایک کمرے کی بات کرتے ہیں یہ سارا بنگلہ ہی حاضر ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ گھر کے جس کمرے کو کہیں گے آپ کا آستانہ بنا دیا جائے گا۔''

''تو ہمیں اجازت دیجئے شیخ صاحب۔'' پیر نے اٹھتے ہوئے اپنے کلف لگے کپڑوں کو درست کیا اور نگاہیں غفران پر جما دیں۔ ''ابھی بہت سے کام کرنے ہیں۔ پھر کہیں آپ پر سے بلائیں دور ہوں گی۔'' اس کا دھیان غفران کی طرف تھا جبکہ مخاطب وہ شیخ عمر حیات اور اس کی فیملی سے تھا۔

''آپ ایسے نہیں جا سکتے۔ میرے غریب خانے پر پہلی بار تشریف لائے ہیں اور ایسے ہی کھانا کھائے بغیر ہی چلے جائیں گے۔'' شیخ عمر حیات ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

''غفران جلدی سے کھانا لگواؤ۔''

''کھانا تیار ہے صاحب۔'' خانساماں نے غفران کی بجائے جلدی سے آواز دی۔

پیر صاحب شیخ صاحب کے اشارہ پر ڈائننگ روم میں چلے گئے۔ ٹیبل پر طرح طرح کے کھانے چن دیئے گئے تھے۔ جو ملیحہ اور احمد باؤ ہوٹل سے تیار کروا کے لائے تھے۔

''تم نے تو کافی تکلف کر لیا۔ ہماری اتنی خوراک تو نہیں ہے۔'' پیر کے منہ میں پانی بھر آیا تھا لیکن ازراہِ مروت اسے کہنا پڑا۔ ٹیبل پر اس کا پسندیدہ مشروب بھی موجود تھا۔ پیر صاحب نے کرسی پر بیٹھ کر کھانا شروع کیا تو باقی تمام افراد ہاتھ باندھ کر احترام سے کھڑے ہو رہے۔

غفران باہر لان میں ہی دل جلا رہا تھا۔ وہ جلد یا بدیر اس پیر کو ننگا کرنا چاہتا تھا، لیکن بغیر ثبوت کے شیخ کو مطمئن نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت پیر کا جادو سر چڑھ کر بولنا شروع ہو گیا تھا اور اس جادو کا توڑ ڈھونڈنا تھا۔ وہ انہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ گیٹ سے ایک سوٹڈ بوٹڈ

آدمی اندر داخل ہوا۔ غفران نے اسے پہچان لیا تھا وہ چوبیس پچیس سالہ نوجوان شیخ صاحب کی فرم میں منیجر تھا۔ وہ بھی غفران سے اچھی طرح واقف تھا۔ کیونکہ غفران شیخ صاحب کے ساتھ ان کے آفس جاتا رہتا تھا۔ وہ پریشانی کی حالت میں سیدھا غفران کی طرف بڑھا رسمی علیک سلیک کے بعد بولا۔

''غفران کیا بات ہے۔ آج شیخ صاحب آفس نہیں آئے اور موبائل بھی بند ہے۔ گھر کے تمام فون مصروف مل رہے ہیں۔ میں کب سے کوشش کر رہا ہوں۔''

غفران نے اس کی بات سن کر کوئی ردِعمل ظاہر نہ کیا بلکہ الٹا اس سے سوال کر دیا۔

''کیا بات ہے مظہر صاحب آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟''

''پریشانی ہی کی تو بات ہے۔ آج شیخ صاحب کی جاپانی صنعتکاروں سے میٹنگ تھی۔ وہ آفس میں دو گھنٹے انتظار کر کے چلے گئے ہیں۔ بلکہ ناراض ہو کر گئے ہیں۔ شیخ صاحب کا کروڑوں کا فائدہ ہوتے ہوتے رہ گیا ہے۔'' مظہر نے آخری فقرہ غفران کے کان میں سرگوشی کے انداز میں کہا تو غفران بے اختیار ہنس پڑا۔ جبکہ مظہر حسین اس کا منہ دیکھنے لگا۔

''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟ مجھے تمہاری یہ حرکت بُری لگی ہے۔''

''اچھا جی مظہر صاحب۔ بُری ہے تو بُری ہی سہی۔ دیکھو جی ہم آپ کی بہت عزت کرتے ہیں آپ کا پیغام میں شیخ صاحب کو پہنچا دیتا ہوں۔ آپ تب تک لان میں تشریف رکھیں۔''

اسی اثناء میں انہوں نے دیکھا کہ شیخ صاحب پیر صاحب کے ساتھ باہر نکل رہے تھے۔ گاڑی پورچ سے نکال کر ڈرائیور گیٹ کے پاس لے گیا تھا اور باہر نکل کر مؤدبانہ انداز میں کھڑا تھا۔ مظہر حسین اور غفران یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

''شیخ صاحب میری ایک درخواست ہے کہ آپ مجھے سرکار نہ کہا کریں۔ بلکہ مجھے صرف ''باباجی'' کہا کریں۔ میرے لیے یہی لفظ کافی ہے۔'' پیر صاحب نے شیخ فیملی کے دل میں گھر بنانے کے لیے ایک اور تیر چھوڑا۔ جو شیخ فیملی کے سینے میں پیوست ہو گیا۔

''کیوں شرمندہ کرتے ہیں سرکار، آپ حکم کیجیے۔ درخواست تو مجھ جیسے کمینے لوگ کرتے ہیں۔ آپ کا تو بڑا امان مرتبہ ہے۔'' شیخ عمر حیات کو اس طرح عاجز اور مسکین دیکھ کر مظہر کو لگا کہ وہ کسی غلط گھر میں کسی غلط آدمی کو دیکھ رہا ہے۔ یہ تو شیخ عمر حیات نہیں ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں مل مل کر دیکھا، لیکن وہ خود غلط تھا اور جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا۔ وہ حقیقت ہی تھی بلکہ تلخ حقیقت۔

باباجی کی گاڑی روانہ ہو گئی تو غفران کے ہونٹوں سے سیٹی کی صورت میں اطمینان بھری سانس نکلی۔ جسے مظہر نے بھی محسوس کیا۔

☆======☆======☆

شیخ عمر حیات کا ایک نام نہاد پیر میں اس حد تک دلچسپی لینا اسے کھٹک رہا تھا اور پھر ملیحہ اور احمد باؤ کی جہالت کی انتہا بھی بُری طرح پھانس بن گئی تھی۔ مگر وہ تو مجبور تھا۔ کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ وہ تو صرف خادم تھا، غلام تھا، حکم کا غلام۔ وہ جانتا تھا کہ شیخ عمر حیات ایک بلا کا نام ہے۔ کیونکہ اس کے دوسرے چہرے کو صرف غفران ہی جانتا تھا۔

جس طرح زندہ رہنے کے لیے ہر شخص کے دو روپ ہوتے ہیں۔ ایک اچھا اور دوسرا بُرا بالکل اسی طرح شیخ کے بھی دو چہرے تھے۔ ایک چہرہ غریبوں کا ہمدرد، ایک اعلیٰ صنعت کار، کاروباری، سچا اور کھرا بندہ۔ لیکن دوسرا روپ جو کہ بُرا ہونا چاہیے تھا۔ وہ صرف بُرا ہی نہیں بلکہ بہت گھناؤنا بھی تھا۔ اتنا گھناؤنا تھا کہ اس کے تعلقات منسٹر اور ان اعلیٰ افسران تک تھے جو خود تو اسمگلنگ اور منشیات فروخت کرنے جیسے دھندوں سے منسلک تھے، لیکن شیخ عمر حیات کے ساتھ بھی کاروباری شراکت داری تھی۔ وہ جو نام نہاد منسٹر بن کر عوام کی فلاح و بہبود پر کروڑوں خرچ کرنے کے زبانی دعوے ہی کرتے تھے۔ وہ بھی شیخ عمر حیات کے ساجھے دار تھے۔ دوسرے شہروں اور ملکوں سے مال منگوانا اور اسے اپنے عظیم وطن کی رگ رگ میں ناسور بنا کر پہنچانا ہی شیخ عمر حیات اور ان اعلیٰ عہدیداروں کا ''مشغلہ'' تھا۔

شیخ عمر حیات جو کہ والدین کا اکلوتا وارث تھا۔ ان کی وفات کے بعد تمام منقولہ وغیر منقولہ جائیداد کا وارث تھا۔ کوئی فکر نہ تھی۔ اللہ نے عالیہ بیگم جیسی ہم خیال بیوی دی تھی اور پھر ایک بیٹا اور بیٹی بھی نعمت خداوندی تھی۔ ہوزری گارمنٹس کا بزنس تھا۔ گھر میں اچھی خاصی آمدنی تھی۔ نوکر چاکروں کی کمی نہ تھی۔ ''احمد ٹریڈرز'' کے نام سے شیخ صاحب کی اچھی خاصی پہچان تھی۔ یورپ اور وسطی ایشیائی ریاستوں میں شیخ صاحب کا بنایا ہوا ٹراؤزر اور اپر انتہائی اچھے داموں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ ایک یونٹ میں انتہائی ایمانداری سے یہ کام ہوتا تھا۔ جبکہ دوسرا یونٹ ایسی جگہ تھا جس پر صرف ''مال'' باہر بھیجا جاتا تھا۔ ٹراؤزر اور اپر کے اندر منشیات کی پڑیاں سلائی کر کے سپلائی کر دی جاتی تھی۔ آدھی شپمنٹ یونٹ نمبر 1 سے اور آدھی شپمنٹ یونٹ نمبر 2 سے مکمل کر کے بذریعہ شپ تمام مال متعلقہ ممالک کو بھجوا دیا جاتا تھا۔ یہ تمام امور بخوبی انجام دینے والا فرد واحد غفران تھا۔ جو کہ شیخ صاحب کے اصلی اور نقلی تمام دھندوں سے اچھی طرح واقف تھا اور اپنا حصہ وصول کر لیتا تھا۔

احمد باؤ کو باپ کے دونمبر دھندے کی خبر نہ تھی۔ وہ تو صرف یہ جانتا تھا کہ اس کا مہربان باپ دن رات محنت کرتا ہے۔ وہ باپ کے کام میں اس کا ہاتھ بٹانے کے لیے آفس جوائن کر چکا تھا۔ جبکہ باقی تمام امور اسے منیجر مظہر حسین نے سمجھا دیئے تھے۔ احمد باؤ جو کہ ایم بی اے تھا۔ کام کو جلد ہی سمجھ کر اس پر حاوی ہو گیا تھا۔ اس نے بہت تیزی کے ساتھ کام کو ترقی دی تھی۔ جس کی وجہ سے شیخ صاحب کو مزید تین یونٹ لگانے پڑے تھے۔ ان کی دیکھ بھال بھی احمد باؤ ہی کرتا تھا۔ وہ خاصے وضع دار اور کاروباری ذہن کا مالک تھا۔

ملیحہ نے گزشتہ برس ایف ایس سی کی تھی اور اب ڈاکٹری کرنے کا ارادہ تھا۔ والدین کی لاڈلی ہونے کے ناطے اپنی ہر ضد منواتی تھی اور شیخ صاحب بھی اس کی زبان پر پھول چڑھاتے رہتے تھے۔

عالیہ بیگم ایک مغرور اور نک چڑھی عورت تھی۔ ملازموں اور چھوٹے لوگوں کو منہ لگانا اس کے خیال میں اپنی بدنامی کرنا تھا، لیکن ملازموں کے بغیر گھر چلانا خاصا مشکل تھا۔ اس لیے ملازم ان کی مجبوری تھے۔ ورنہ وہ ان کمی کمین لوگوں کو بلانا اور ان کی طرف دیکھنا بھی اپنی توہین سمجھتی تھی۔ ایک غفران ہی تھا جو اپنے رعب دار لہجے اور ڈیل ڈول سے اس کو اس کی اوقات یاد دلاتا تھا۔ وہ غفران سے دبتی بھی تھی۔ مگر ظاہر نہ کرتی تھی۔ کچھ بھی تھا۔ غفران تھا تو ان کا ملازم ہی۔

ملیحہ غفران میں خاصی دلچسپی لیتی تھی۔ کیونکہ شیخ صاحب کی غیر موجودگی میں بھی غفران کا آنا جانا لگا رہتا تھا، لیکن غفران اسے کوئی خاص لفٹ نہ کراتا تھا۔

''میں تو غریب اور ان پڑھ آدمی ہوں بی بی۔ میری جان کی خلاصی کر۔'' وہ ملیحہ کے پیار بھرے انداز کے جواب میں ہاتھ جوڑ کر کہتا تو ملیحہ اس کے اس انداز پر ہزار جان سے قربان ہو جاتی۔

وہ جانتی تھی کہ غفران گھڑے کی مچھلی ہے۔ جب بھی دولت کی کنڈی ڈالوں گی۔ اسے پکڑ کر اپنے دل کے مرتبان میں قید کرلوں گی۔

جبکہ دوسری طرف غفران کے خیالات یکسر مختلف تھے۔ وہ ہر غلط کام کر سکتا تھا، لیکن کبھی بھی مالک کے ''چھابے'' میں ہاتھ نہ مار سکتا تھا۔ غفران میں خامیاں ہی خامیاں تھیں۔ کوئی بھی ایسی بات نہ تھی جو خوبی ہوتی اور جو نیکی ہوتی۔ لوحِ یزداں پر اس کی خوبیوں اور نیکیوں کی تعداد نظر پڑتے ہی شمار ہو جاتی تھی۔

دولت کی فراوانی اور مضبوط ''کنڈ'' نے اس کو عیاش بھی بنا دیا تھا۔ تمام تھانوں میں

اس کا ریکارڈ تھا۔ نماز، روزہ اور دین اسلام سے وہ اتنا ہی دور تھا۔ جتنا ایک پرہیزگار اور نیک آدمی گناہ کی سوچ سے دور ہوتا ہے۔

پیار محبت اور عشق اس کی کوئی بھی گنجائش نہ نکلتی تھی کہ وہ غفران کے دل میں اپنی جگہ بنا سکیں۔ وہ اکثر راتوں کو باہر رہتا۔ جبکہ اس کی ماں گھر میں رات کو دروازہ کھول کر اس کی راہ دیکھتی رہتی تھی۔ ماں جی اور اس کی یہی لڑائی تھی کہ وہ تمام غلط کام چھوڑ کر کوئی معمولی نوکری کر لے، لیکن غفران نے جو دنیا دیکھ لی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ دو وقت کی روٹی کمائی نہیں جاتی بلکہ چھینی جاتی ہے اور چھیننے کے لیے طاقت ضروری ہے۔ کئی وزراء اور اعلیٰ عہدیدار اس کے شناسا ہو گئے تھے۔ کیونکہ وہ شیخ عمر حیات کے ساتھ بطور باڈی گارڈ کئی اہم پارٹیز اور فنکشنز میں جا چکا تھا۔ کسی بھی غلط کام میں ملوث ہونے پر متعلقہ تھانے کا عملہ اس کی معمولی سرزنش کرتا اور پھر اسے چھوڑ دیا جاتا تھا۔

غفران نے بھی شیخ عمر حیات کی نگاہوں سے اوجھل اپنا ایک اڈہ بنا رکھا تھا۔ جس پر اس کا جگری یار اور مخبر ''جانی'' رہتا تھا۔ یہ بہترین اور پُرسکون جگہ تھی۔ جو شہر سے چند میل کے فاصلے پر تھی لیکن شیخ عمر حیات کو اس کا علم نہ تھا۔

جانی ایک یتیم اور لاوارث نوجوان تھا لیکن اس کی جوانی اور خوبصورتی نے اسے کوئی اضافی فائدہ نہ دیا۔ بلکہ غربت اور بے بسی نے اس کے نمبر مزید کم کر دیے تھے۔ یہ غربت اور مفلسی اس دنیا کے انوکھے جرم ہیں۔ جن کی سزا اس ملک کا قانون نہیں بلکہ امراء کے بنائے ہوئے قوانین دیتے ہیں۔ حق حلال کی روزی کمانے کے لیے بہت سے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، لیکن پاپڑ بیلنے کے لیے بھی غریب کو کچھ نہ کچھ سرمائے کی شکل میں درکار ہوتا ہے جو ہمیشہ درکار ہی رہتا ہے۔ جبھی تو غریب کسی نہ کسی امیر کے در کا ''کتا'' بن کر رہ جاتا ہے اور اپنی ساری عمر اپنے امیر مالک کے تلوے چاٹتے ہی گزار دیتا ہے اور پھر ایک دن اپنے ڈربے میں موت کو گلے لگا لیتا ہے۔

جانی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی تھا، لیکن بروقت غفران نے اس کو سنبھال لیا تھا۔ اسے کسی امیر آدمی کا بے بس کتا نہ بننے دیا تھا۔ بلکہ اپنا جگری یار بنا لیا تھا۔ تبھی تو جانی بھی اس کا دم بھرتا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ غفران کیا دھندہ کرتا ہے اور کس کے ساتھ کیا کام کرتا ہے۔ بس اس نے کبھی بھی غفران سے کوئی سوال نہ کیا تھا۔ یہ اس کا احساس محرومی تھا۔ یا پھر غفران کی عزت کرتا تھا۔

ہزار برائیوں کے باوجود جانی کی ایک خوبی بھی تھی کہ وہ کبھی کبھار اپنے رب کے

حضور سجدہ ریز ہو جاتا تھا۔ اس کے اس سجدے میں رب تعالیٰ کا شکر شامل ہوتا تھا۔ وہ بڑے انہاک سے نماز پڑھتا تھا، لیکن جب وہ درندہ بنتا تھا تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ اس روئے زمین پر اس سے ظالم انسان کوئی ہے ہی نہیں۔ شاید یہ غفران کی صحبت کا اثر تھا۔ بس اس کے اندر جو تھوڑی سی انسانیت زندہ تھی۔ وہ کبھی کبھی یہاں سے نکلنے اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگنے پر مجبور کرتی تھی، لیکن وہ جانتا تھا کہ یہاں سے نکلنے کے بعد اس زمانے میں دردر کی ٹھوکریں اور نفرتیں اس کا مقدر بن جائیں گی۔ کوئی بھی اسے نوکری نہ دے گا اور حلال کمانے کے لیے اسے کسی امیر کا کتا بننا پڑے گا۔ وہ یہ سب نہ چاہتا تھا۔ بس یہ خیالات اس کے اندر جاگنے والی انسانیت کو پھر سلا دیتے تھے۔

غفران نے اسے کبھی بھی سخت نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ بعض دفعہ تو وہ جانی سے کوئی نہ کوئی مشورہ بھی لے لیا کرتا تھا اور جانی کے مخلصانہ مشورہ پر عمل کرتے ہوئے وہ کئی بار اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہوا تھا۔ اب بھی اسے شیخ عمر حیات کے اس نام نہاد 'باباجی' سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے جانی سے پُرخلوص مشورہ درکار تھا۔ وہ جلد از جلد جانی کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔ اسے باباجی کا ہر قدم اور ہر زاویہ ہی غلط نظر آ رہا تھا۔ وہ تمام بات جانی سے کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اسے بہت کچھ مشکوک نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنے اس شک کے کانٹے کو نکالنا چاہتا تھا۔ بس انہی خیالوں میں غلطاں وہ اپنی موٹر سائیکل پر جانی کے پاس اپنے اڈہ پر پہنچ گیا تھا۔ دروازہ حسبِ معمول کھلا ہوا تھا۔ آبادی سے ہٹ کر اس مکان میں کسی غیر یا اجنبی کے آنے کا ڈر نہ تھا اور پھر "چوروں کے گھر سے مور" کیا لے جاتے۔ اسی لیے جانی بھی ہر وقت دروازہ کھلا ہی رکھتا تھا۔

اس وقت جانی پر کبھی کبھار پڑنے والا دورہ پڑا تھا۔ وہ اس وقت نماز پڑھ رہا تھا۔ غفران خاموشی سے صحن میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا تھا اور جانی کے نماز سے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ کتنا بڑا ڈرامہ باز ہے۔ کبھی نماز پڑھنے لگتا ہے اور کبھی شراب و شباب کے مزے لینے لگتا ہے۔ چلو کچھ بھی ہے مجھ سے تو اچھا ہے۔ میں تو کبھی مسجد میں نہیں گیا۔ اسی اثناء میں جانی نماز سے فارغ ہو گیا تھا۔ غفران نے غور سے دیکھا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے دھلی ہوئی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ جانی جب بھی اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوتا تھا تو پورے خشوع کے ساتھ نماز پڑھتا تھا اور اللہ کی وحدانیت بیان کرتے وقت اس کی آنکھیں ساون بھادوں کی جھڑی لگا دیتی تھیں۔ جبھی تو غفران نے اس کی شفاف اور متورم

آنکھوں کو دیکھ کر کوئی تبصرہ نہ کیا تھا۔ دعا سے فارغ ہونے کے بعد جانی بھی غفران کے پاس بچھی ہوئی چارپائی پر آ کر بیٹھ گیا۔

"آج میرے سرکار کیسے راستہ بھول گئے؟" جانی نے اس کے ہاتھ ملانے پر کہا۔

غفران نے اس کی طرف بڑے غور سے دیکھا۔

"میرے ایک سوال کا جواب سوچ کر دینا۔ اگر جواب غلط ہوا تو "چھتر" بھی پھیروں گا۔"

"تجھے تو پتہ ہے غفران بھائی کہ جانی نے کبھی بھی تجھے جواب نہیں دیا اور نہ ہی کبھی کوئی سوال کیا ہے۔" جانی بھی خوشگوار موڈ میں تھا۔ "جو بھی بولنا ہے۔ جلدی سے بول دے، میں جو بھی کہوں گا سچ ہی کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا۔" جانی نے آخری فقرہ ہاتھ اٹھا کر ایسے لہجے میں کہا کہ غفران کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔

"یہ تُو جو اللہ کے آگے جھکتا ہے۔" غفران نے کہنا شروع کیا تو جانی غفران کے منہ سے پہلی بار اللہ کا نام سن کر حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر دل و جان سے متوجہ ہو گیا۔ کیونکہ آج تک غفران نے کبھی بھی اللہ رسول کا ذکر نہ کیا تھا۔ وہ اپنی مستی میں ہی مست رہنے والا بندہ تھا۔ جبھی تو جانی کی حیرت دوچند تھی۔

"مجھے بتا کہ اللہ کے سوا کسی انسان کے آگے جھکنا جائز ہے؟"

"غفران بھائی بہت مشکل سوال کر دیا ہے تم نے، بہرحال میں اپنی ناقص عقل کو استعمال کرتے ہوئے اپنے علم کے مطابق اس کا جواب دینے کی کوشش کرنے لگا ہوں۔"

جانی غفران کے منہ سے سوال سن کر ہی پریشان ہو گیا تھا۔

"اللہ تعالیٰ نے کائنات، ملائکہ اور جنوں کو تخلیق کرنے کے بعد انسان کو بنایا۔ پہلے انسان کو بنانے کے بعد اس نے فرشتوں سے اس انسان کو سجدہ کرنے کے لیے کہا تو ابلیس نے انکار کر دیا۔ رب کائنات کے سامنے انکار کی گنجائش نہیں ہوتی، لیکن ابلیس کی دلیل تھی کہ وہ کسی انسان کو سجدہ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اللہ نے انسان کو کھنکتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا ہے۔ جبکہ جنوں کو خداوند کریم نے پیدا کرتے وقت آگ کا استعمال کیا تھا۔

ابلیس کا انکار سن کر رب واحد نے اسے جنت سے نکل جانے کا حکم دیا۔ تو ابلیس نے بھی اس کے بنائے ہوئے انسانوں کو بہکانے کا چیلنج دے دیا۔ تبھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جن کو تُو بہکائے گا۔ دوزخ ان کا ٹھکانہ ہو گی اور جو تیرے بہکانے پر بھی سچا ہو گا سیدھا میری راہ پر چلے گا، جنت اور طرح طرح کے پھل دار میوے اس کے منتظر ہوں گے۔ جو اللہ کے

بتائے ہوئے راستے پر چلتے ہیں وہ خداوند کریم کی نعمتوں سے مالا مال ہو جاتے ہیں اور جن کو ابلیس بہکا کر اپنے راستے پر لگا لیتا ہے۔ وہ بھی مالا مال ہو جاتے ہیں، لیکن ان کی زندگی کے پلڑے میں گناہوں کا بوجھ بڑھتا رہتا ہے اور پھر زندگی میں ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے کہ گناہوں کا پلڑہ اتنا بھاری ہو جاتا ہے کہ زندگی بوجھ لگنے لگتی ہے۔ موت مانگنے سے بھی نہیں ملتی۔ انسان در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو جاتا ہے، لیکن جب وہ ایک بار سچے دل اور خلوص سے غفور و رحیم کی طرف دیکھتا ہے، تو وہ بھی ستر ماؤں کے پیار جتنے پیار سے اپنے اس بندے کی طرف دیکھتا ہے۔ اس پر آخری وقت تک توبہ کے دروازے بند نہیں کرتا۔''

جانی یہ کہہ کر کچھ دیر کے لیے رکا۔ اس نے محسوس کیا کہ غفران بڑے انہماک سے اس کی گفتگو سن رہا تھا۔ غفران جانی کے اچانک اس طرح رک جانے پر مضطرب و بے چین نظر آ رہا تھا، لیکن وہ تب پُرسکون ہو گیا۔ جب جانی نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

''اس نے بخشش کے لئے وسیلے پیدا کیے ہیں۔ وہ تو اتنا غفور و رحیم ہے کہ بندہ گناہوں سے لتھڑا ہوا بھی ہو، بس ایک مرتبہ سچے دل سے اس کی طرف رجوع کرے۔ وہ دس درجے اپنے بندے کی طرف بڑھتا ہے۔ جو کوئی بھی سچے دل سے کلمہ طیبہ کا ورد کرتا ہے، رب کریم اس کلمہ میں آنے والے دوسرے حصے کی نسبت اور مناسبت سے ہی اس کی بخشش کر دیتا ہے۔ نہیں کوئی معبود لائق عبادت کے سوائے اللہ تعالیٰ کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ بس وہ اپنے نام کے ساتھ اس چیز کی گواہی مانگتا تھا کہ اس کے بنائے ہوئے انسان ''اشہد ان محمد عبدہ ورسول'' کہتے ہوئے اس بات کا اعادہ ہو کہ اللہ بے شک ایک ہے۔ وہی وحدہٗ لاشریک ہے وہی عبادت کے لائق ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ اتنا مقام اور درجہ کسی بھی نبی کو نہ ملا تھا اور نہ ہی ملنا تھا۔ کیونکہ تمام بشریت اور جن و ملک، چرند، پرند، پہاڑ، دریا، شجر اور کائنات کی تخلیق سے پہلے ہی اس رب واحد نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تخلیق کر دیا تھا۔ بس وہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کے محبوب کی قدر و قیمت اس کی بشریت بھی کرتی ہے یا نہیں۔'' وہ کچھ دیر توقف کے بعد پھر بولا۔'' اگر نہیں تو انسانیت کی بخشش نہ ہو گی۔ کیونکہ اس نے اپنی مقدس کتاب میں فرما دیا ہے کہ۔''اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے آپ (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر درود و سلام بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو تم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام بھیجو۔''

جو شخص اللہ کی اطاعت کرے گا۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت بھی واجب ہے۔ کیونکہ صرف اتنا ہی کہنے سے کوئی مسلمان نہیں ہو گا کہ ''لا الہ الا اللہ'' بلکہ اس عظیم کلمہ کو

مکمل پڑھنے والا دائرہ اسلام میں داخل ہو گا۔ اس عظیم اور بابرکت ذات نے سجدہ صرف اپنی ذات پر ہی واجب قرار دیا ہے۔ کیونکہ جس معبود کی عبادت کی جائے۔ سجدہ بھی صرف اسی کو کیا جاتا ہے۔ اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی سجدہ کرنے سے منع کیا ہے۔ یعنی کہ بے شک وہ انسان میری بخشش اور رحمت کا حق دار ہو گا جو میرے محبوبؐ پر درود و سلام پڑھے گا، لیکن ایک انسان ہونے کے ناطے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بے شک تمام انسانوں سے اعلیٰ و اولیٰ عظیم سے بھی عظیم تر پیدا کیے گئے ہیں۔ سجدہ ان کو بھی جائز نہیں ہے۔ ان کے سامنے بھی سجدہ کی تعظیم کے لیے جھکنا جائز نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنے محبوب کو سجدہ کے قابل نہیں بنا رہا تو ایک عام انسان کی کیا اوقات ہے کہ اس کو سجدہ کیا جائے۔ اس کے سامنے جھکا جائے۔ لہٰذا میری بات کا حاصل یہ ہے کہ سجدہ صرف اس وحدہٗ لاشریک کو واجب ہے۔ کسی انسان کو نہیں۔ بے شک وہ نبی ہی کیوں نہ ہو۔''

جانی کی تشریح اتنی لمبی تھی کہ غفران کو گمان ہونے لگا کہ وہ بہت بڑا مفکر ہے۔ کوئی بہت بڑا عالم یا پھر مناظر اسلام ہے، لیکن وہ جانی کے کردار سے بخوبی واقف تھا، اس لیے حیران بھی تھا کہ جانی اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اتنا کچھ جانتا ہے۔ اس سے رہا نہ گیا وہ پوچھ ہی بیٹھا۔

''یہ تمہارا کون سا روپ ہے؟'' وہ جانی کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ جس کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔ وہ اپنے آنسوؤں کو چھپاتے ہوئے بولا۔

''غفران بھائی اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہے کہ اس نے ہمیں مسلمانوں کے گھرانوں میں پیدا کیا ہے لیکن ہمیں اپنی ذات پر افسوس ہے کہ اس کے اس عظیم احسان کے بدلے ہم اس کے سامنے جھکنے سے گریزاں ہیں۔ یہ میرا کوئی روپ نہیں ہے۔ بلکہ اللہ کی عطا ہے۔''

وہ خاموش ہوا تو غفران بول پڑا۔

''میں تو کہتا ہوں کہ تمام دھندے چھوڑ کر ہم دونوں ''پیر'' ہی بن جاتے ہیں۔ تمہیں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں معلوم ہیں۔ مجھے لوگوں کو ''گیڑا'' دینا آتا ہے۔ یار کوئی کمائی ہے اس دھندے میں اور پھر خوبصورت سے خوبصورت لڑکیاں۔ ہائے ہائے جانی بادشاہ ذرا تصور کرو کہ ملیحہ جیسی گوری چٹی خوبصورت جوان لڑکی تمہارے پاؤں دبا رہی ہو اور تم اس کے پاس بیٹھے مشروب سے اپنا دل لبھا رہے ہو اور پھر حسن کی تپش تمہارے اندر ارمان جگا رہی ہو۔ میں تو کہتا ہوں وارے نیارے ہو جائیں گے اور پھر کوئی یہ نہیں کہے گا کہ غفران اور جانی غنڈے بدمعاش ہیں۔ بس حق حلال کی روزی کماتے

ہیں۔''

غفران کے بتانے کا انداز نرالا تھا، لیکن ملیحہ کے نام پر جانی چونک گیا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ شیخ عمر حیات کی اکلوتی بیٹی کا نام ملیحہ ہے اور وہ غفران میں دلچسپی رکھتی ہے۔ جبھی تو وہ تمام امور بالائے طاق رکھتے ہوئے غفران سے سوال کر بیٹھا۔

''اس ساری بات میں ملیحہ اور بابا جی کا ذکر کیسے؟ اور پھر تم آج کیسی باتیں کر رہے ہو؟ جو بھی کہانی ہے مجھے کھل کر بتاؤ۔ ہوسکتا ہے کہ میں تمہارے درد کا کوئی مداوا کرسکوں۔''

غفران نے اس کی طرف چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

''یار جانی تُو کتنا بے مروت ہے ابھی تک کوئی ''سیوا'' ہی نہیں کی، ذرا فریج سے کوئی کھانے کی چیز نکال کر لا۔ پھر تمہیں بتاتا ہوں۔''

''میں تو کہتا ہوں غفران بھائی۔ اتنی اچھی باتیں ہو رہی ہیں۔ میرا اٹھنے کو دل ہی نہیں کرتا۔''

''باتیں تو بہت اچھی ہو رہی ہیں۔ پر تجھے تو پتہ ہے کہ یہ عشق محبت میرے بس کے کام نہیں ہیں۔ یہ نمازیں پڑھو، نیک کام کرو، یار چھوڑو یہ سب، یہ سب دکھاوا ہے۔ لوگ لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے سبھی کچھ کرتے ہیں۔'' غفران نے جانی کی بات کا جواب دیا۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ تم آج اتنے دنوں بعد کدھر رستہ بھول پڑے ہو؟''

''خوب یاد دلایا بھئی۔ ذرا غور سے سنو۔'' غفران مسکرا کر تمام بات جانی کو سنانے لگا۔ جانی بڑے انہماک سے سن رہا تھا۔ وہ غفران کی ایک ایک بات پر غور کر رہا تھا۔ جب تمام گفتگو ختم ہوئی تو جانی بول پڑا۔

''غفران بھائی تم کیا چاہتے ہو؟''

''اس بابا جی کا مکمل حدود اربعہ۔ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کیا چاہتا ہے؟ شیخ عمر حیات اس کا اتنا مطیع کیوں ہے؟ ملیحہ اور احمد باؤ جیسے پڑھے لکھے جاہل اس کی جی حضوری کیوں کرتے ہیں؟ ان تمام باتوں کے لیے تمہیں ایک ماہ کا وقت دیتا ہوں۔ بس!'' غفران نے ہاتھ اٹھا کر جانی سے کہا اور باہر کی طرف لپکا، تو جانی بھی اس کے پیچھے ہی آ گیا۔

''باس آج کل جیب خالی ہے اور بھاں بھاں کرتی ہوئی جیب جانی کا وطیرہ نہیں ہے۔''

''تجھے کتنی بار کہا ہے کہ اس گھر میں پڑی ہوئی ہر چیز تمہاری ہے۔ جتنی چاہے رقم استعمال کرو۔''

''آپ کو تو علم ہے غفران بھائی کہ میں نے کبھی بھی آپ کی اجازت کے بغیر اس گھر سے ایک تنکا بھی نہیں اٹھایا۔''

''اچھا جبھی تو میں دیکھ رہا ہوں کہ اس گھر میں کتنا گند پڑا ہوا ہے۔ اللہ کے بندے تنکا تو اٹھا لیا کر۔'' یہ غفران کی طرف سے اشارہ تھا کہ وہ جتنی چاہے رقم استعمال کرسکتا ہے۔ اس گھر میں جسے انہوں نے اڈہ بنایا ہوا تھا۔ پچھلے کمرے میں ایک تہہ خانہ بھی تھا۔ جس کا علم صرف جانی اور غفران کو ہی تھا۔ اس میں غفران نے کافی دولت اور اسلحہ جمع کر رکھا تھا۔ بوقتِ ضرور جانی اور غفران اس حرام کی کمائی سے اپنی ضروریات پوری کر لیتے تھے۔

ماں جی کو اتنا علم تھا کہ شیخ عمر حیات اچھے کردار کا آدمی نہیں ہے اور اس کا بیٹا غفران، شیخ کا ملازم تھا۔ اس کی فیکٹری میں ملازمت کرتا تھا۔ شیخ عمر حیات کے بُرے کردار کی وجہ سے اس کا بیٹا بھی بدنام ہو رہا تھا۔ بس ماں جی کئی بار غفران کو سمجھا کر تھک گئی تھیں، لیکن اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی تھی۔

اب بھی غفران کی موٹر سائیکل اپنے گھر کی طرف اڑی جا رہی تھی۔ وہ کئی دنوں بعد اپنے گھر جا رہا تھا۔ اس نے بابا جی کے پیچھے جانی کو لگا دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جانی کام کا بندہ ہے۔ وہ بہت جلد بابا جی کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دے گا۔ اسے خوامخواہ ہی بابا جی سے نفرت ہو رہی تھی۔ حالانکہ یہ اس کی پہلی ہی ملاقات تھی بلکہ دیکھا ہی پہلی مرتبہ تھا۔

اسے اس شخص کے چہرے پر خباثت ٹپکتی صاف نظر آ گئی تھی، لیکن شیخ عمر حیات جیسا ''خرانٹ'' بندہ اس کی اطاعت کر رہا تھا۔ کچھ نہ کچھ تو غلط تھا۔ بس وہ انہی سوچوں میں مگن اپنے گھر پہنچ گیا تھا۔

وہ کافی دنوں بعد گھر آیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ماں جی سے جھڑکیاں سننی پڑیں گی، لیکن جب وہ اندر داخل ہوا تو حیران ہی نہیں بلکہ پریشان بھی ہو گیا۔ کیونکہ اس کے صحن میں ''بخاری بابا'' اور ان کا خاص مرید اسمٰعیل بھی موجود تھے۔ وہ حسب عادت زمین پر بچھی ہوئی چٹائی پر تشریف فرما تھے اسمٰعیل ان کے پیچھے گھٹنوں کے بل کھڑا ہو کر ان کے کندھے دبا رہا تھا۔ جبکہ ماں جی کہیں نظر نہ آ رہی تھیں۔ اس نے سوچا کہ ہوسکتا ہے کہ ماں جی پچھلے کمرے میں ہوں، لیکن واضح محسوس ہو رہا تھا کہ گھر میں کہیں بھی ماں جی نہیں ہیں۔

شاہ جی اسے خاص طور پر دیکھ رہے تھے۔ وہ لاکھ غنڈہ گردی کرتا تھا مگر اس نے شاہ جی کی ہمیشہ عزت کی تھی۔ کیونکہ اس نے اپنے دادا اور والد کو بھی شاہ جی کے خاندان کی تعظیم اور توقیر کرتے ہوئے زندگیاں گزارتے ہوئے دیکھا تھا۔ بس اس نے کبھی بھی شاہ جی کے

سامنے آنکھ نہ اٹھائی تھی۔

ماں جی نے کئی بار کہا تھا کہ شاہ جی اسے بھی بیعت کرلیں۔ اپنا مرید بنالیں۔ تو شاہ جی کا ایک ہی جواب ہوتا تھا۔ بیعت کرنا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ یہ پیدائشی طور پر ہی ہمارا مرید تھا اور ہم نے بھی اسے دل وجان سے مرید مان لیا ہے، لیکن ابھی کچھ دیر ہے۔ بہت سے کٹھن امتحانات مقصود ہیں۔ جن سے گزر کر ہی یہ کندن بنے گا اور کسی مرید کا ہاتھ ہمارے ہاتھ میں بیعت حاصل کرنے کے لیے تبھی آتا ہے جب وہ زمانے اور حالات کی بھٹی میں تپ تپ کر کندن بن چکا ہو! شاہ جی اس کی طرف دیکھ کر ہمیشہ کی طرح اب بھی مخصوص مسکراہٹ ہونٹوں پہ سجائے منہ ہی منہ میں کچھ کلام الٰہی کا ورد کر رہے تھے۔

غفران نے جوتی اتار کر ایک طرف رکھی اور نگاہیں جھکائے ہوئے چٹائی پر شاہ جی کے قدموں میں دوزانو بیٹھ گیا۔ اسے خاموش بیٹھا دیکھ کر شاہ جی نے لب کشائی کی۔

''السلام علیکم!''

غفران شاہ جی کے منہ سے سلام کی پہل سن کر انتہائی نادم ہوا۔ وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ شاہ جی اس کی اس غلطی کو اس طرح سدھاریں گے۔ یقیناً یہ اس کی غلطی تھی کہ وہ باہر سے آیا تھا اور پھر شاہ جی کے مرتبہ کے مطابق اسے سلام کرنے میں پہل کرنی چاہئے تھی۔ اسے کچھ نہ سوجھا۔ اس نے بھی جھٹ سے سلام کردیا۔

شاہ جی اور اسمٰعیل اس کی اس حالت سے خاصے محظوظ ہو رہے تھے۔

''وعلیکم السلام ورحمتہ اللہ وبرکاتہ'' شاہ جی نے اس کے سلام کا جواب دے کر ایک بار پھر اسے احساس دلایا کہ اسے شاہ جی کے سلام کا جواب دینا چاہئے تھا۔ اسے سمجھ نہ آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ سینکڑوں پولیس والوں کو اپنی انگلیوں پر نچانے والا غفران اس وقت ان کے سامنے بھیگی بلی بنا ہوا تھا۔

''وہ!...... بات اصل میں یہ ہے جی کہ......'' وہ کچھ دیر کے لیے رکا، لیکن شاہ جی نے اثبات میں ایسے سر ہلایا کہ وہ اس کی بات ہمہ تن گوش ہو کر سن رہے ہیں۔ اسے اور تو کچھ نہ سمجھ آیا بس یہی کہہ سکا۔

''معافی چاہتا ہوں شاہ جی۔ پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ اسی لیے ادب وآداب کا لحاظ نہیں رہتا۔''

اس کا خیال تھا کہ شاہ جی اسے تعلیم کی افادیت اور ادب کے موضوع پر ایک طویل لیکچر دیں گے، لیکن وہ تب حیران ہوا۔ جب انہوں نے اس کی بات کو نظر انداز کرکے ایک

اور سوال داغ دیا۔

''کہاں سے آرہے ہو؟''

وہ جانتا تھا کہ شاہ جی اللہ کے نیک بندے ہیں اور پھر آل رسول بھی اور پھر اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ نے شاہ جی کے دادا جی کو بہت ساری علم کی دولت سے نوازا تھا۔ پھر یہ علم ان کی وفات کے بعد ان کے گدی نشین یعنی شاہ جی کے والد محترم کی زیر غلامی رہا اور پھر ان کی زندگی میں ہی انہوں نے اپنا علم اور اسرار خداوندی شاہ جی پر آشکار کرنا شروع کردیئے تھے۔ یعنی علم کی دولت اور اسرار خداوندی، دین اسلام کی سمجھ بوجھ ان کی میراث تھی۔ وہ اسی لیے شاہ جی سے کوئی جھوٹ نہ بولنا چاہتا تھا۔

''جانی کے پاس سے آرہا ہوں۔'' وہ نہایت لجاجت سے بولا تھا۔

''یہ جانی کون ہے؟''

''میرا دوست ہے جی۔''

''کبھی ملوایا تو نہیں تم نے اس دوست سے۔''

''وہ بھی میری طرح کوئی اچھا آدمی نہیں ہے۔ بس اسی لیے میں اسے اس قابل نہیں سمجھتا تھا۔''

''اگر وہ بھی اچھا آدمی نہیں ہے اور تمہاری طرح خراب آدمی ہے۔ تو تم تو میرے پاس بیٹھے ہو۔''

''میں ملوادوں گا جی اس کو آپ سے۔''

''تو پھر کب ملوا رہے ہو؟''

''یہ شاہ جی کو جانی میں دلچسپی کیوں ہونے لگی۔ حالانکہ انہوں نے کبھی اسے دیکھا بھی نہیں تھا اور غفران کو جہاں تک یاد پڑتا تھا۔ اس نے کبھی ماں جی سے بھی اس کا تذکرہ نہ کیا تھا۔ پھر شاہ جی جیسا عظیم انسان ایک غنڈے بدمعاش سے کیوں ملنا چاہتا تھا؟'' غفران سوچ میں ڈوب گیا تھا کہ شاہ جی کی آواز نے اس کے رہے سہے حواس بھی باختہ کردیئے۔

''وہ غنڈہ بدمعاش ضرور ہے۔'' وہ کچھ دیر کے لیے چپ ہوئے۔ شاید غفران کے چہرے پر اپنی کہی ہوئی بات کے تاثرات دیکھنا چاہتے تھے۔

''اس کے اندر بھی تمہاری طرح ایک انسان چھپا ہوا ہے۔ جو نیک تو ہے مگر شیطان کے نرغے میں بُری طرح پھنسا ہوا ہے۔ وہ کبھی کبھار اس چنگل سے نکلنے کی کوشش میں دوچار سجدے خداوند کو ضرور کرتا ہے۔ مگر دل سے بے ایمانی نہیں جاتی۔'' وہ کچھ توقف کے بعد

پھر بولے۔''اس کا دل بھی دھونا پڑے گا۔اس کے گھر بھی جانا پڑے گا۔''

غفران کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ جانی کبھی کبھار نماز پڑھ لیتا ہے اور پھر یہ تو آج کا تازہ واقعہ تھا کہ اس نے سجدہ کے موضوع پر غفران کو طویل لیکچر دیا تھا۔ وہ سجدہ کے موضوع پر رب ذوالجلال کا ذکر کرتے ہوئے رو پڑا تھا، لیکن غفران جانتا تھا کہ وہ کچھ اچھا آدمی نہیں ہے۔ بعض اوقات جب اس کے اندر چھپا ہوا اچھا انسان اسے مجبور کرتا ہے تو وہ نمازیں پڑھنی شروع کر دیتا ہے اور جب اس کے دل سے میل شدہ اور گھٹیا سوچ جنم لیتی ہے تو وہ اپنا دماغ استعمال کرنے کی بجائے دل کا فیصلہ ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بقول شاہ جی اس کے دل پر شیطان کا غلبہ ہے۔ اس کے دل کے میل کو دھونا پڑے گا۔

''مگر کیسے؟ کیا جانی کا دل نکال کر دھوئیں گے؟ اس طرح تو جانی مر جائے گا۔ کیا شاہ جی اس سے اس کا دوست چھین لیں گے؟ نہیں نہیں۔ شاہ جی جیسا عظیم انسان ایسا نہیں کر سکتا۔ کبھی بھی وہ کسی کی جان نہیں لے سکتے۔ نہیں کبھی نہیں۔ نہیں نہیں۔ وہ بے خیالی میں یہی بولنے لگا۔ وہ خیالات کے بھنور میں الجھ کر بہت دور نکل گیا تھا۔ اسے یہ بھی ہوش نہ رہا کہ وہ اپنے گھر میں ہے اور شاہ جی کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے خیالات کی الجھن سلجھانے کے لیے شاہ جی نے اپنی نرم اور میٹھی آواز سے خیالات کی ڈور کا ایک سرا اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے اسے پکارا۔

''کیا تم اپنا دل دھونا چاہتے ہو؟''

''ہاں!'' وہ کہیں دور سے بولا۔

''تو پھر شیطان کا دامن چھوڑ دو۔ اس رب العلمین کا دامن پکڑو جو دونوں جہانوں کا رب ہے۔''

''میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں ایسا نہیں کر سکتا'' وہ بے اختیار بولا۔ شیطان ایک بار پھر اس پر حاوی ہو رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ مزید گفتگو ہوتی۔ بیرونی دروازے سے ماں جی داخل ہوتی دکھائی دیں۔ ان کے پیچھے ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی بھی تھی۔ جس کی عمر تقریباً بیس بائیس سال ہو گی۔ جبکہ اسی نے ایک بارہ تیرہ سالہ لڑکے کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا اور لڑکا اس سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر اسمٰعیل فوراً آگے بڑھا۔ اس نے لڑکی سے لڑکے کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ماں جی غفران کو دیکھ کر خوش بھی ہوئیں اور سہم ان بھی۔ کیونکہ وہ اسی طرح اچانک آتا تھا۔ آج تو شاہ جی ان کے غریب خانہ پر قدم رنجہ

تھے۔ وہ باآسانی غفران کی بات ان سے کر سکتی تھیں۔

''اچھا تو یہ تمہاری چال ہے رشید حسین! میں بھی کہوں کہ یہ کتیا آج مجھے کہاں لے کر جا رہی ہے؟''

بارہ سالہ لڑکے کے منہ سے یہ الفاظ کیا نکلے تھے کہ اسمٰعیل اور غفران کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ انہوں نے چونک کر لڑکے کی طرف دیکھا۔ جس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ وہ اسمٰعیل کے مضبوط ہاتھوں سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ بار بار شاہ جی کی طرف دیکھ رہا تھا اور غصے سے پھنکار رہا تھا۔ وہ بارہ سالہ کمزور سا لڑکا اسمٰعیل کے ڈیل ڈول اور مضبوط وجود کو بھی ہلا رہا تھا۔

غفران نے اس خوبصورت لڑکی کی طرف دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی جگمگا رہے تھے۔ وہ اپنی نرم و نازک انگلیوں سے ان کو صاف کر رہی تھی۔ وہ غفران کی موجودگی سے بے خبر تھی۔ جبھی تو اس نے کوئی پردہ نہ کیا تھا۔ اس کا حسن اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ اگر چاند اسے دیکھ لے تو روشنی اور چاندنی کی بھیک مانگ لے۔ اگر اس کی بکھری ہوئی سیاہ کالی زلفیں بادل دیکھ لیں تو ''گھٹائیں برسنا بھول جائیں۔''

اس سے پہلے کہ غفران اس کے سراپا حسن پر مزید غور کرتا۔ وہ روتی ہوئی ماں جی کے پاس ہی چٹائی پر بیٹھ گئی۔ غفران کبھی شاہ جی کی طرف دیکھتا اور کبھی اس لڑکے کی طرف دیکھتا جو شاہ جی کو مسلسل گھور رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ معاملہ نہ آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کا ذہن مزید الجھتا۔ اس لڑکے کے منہ سے بڑی بھیانک آواز نکلی۔ جو یقیناً اس کی اپنی آواز نہ تھی۔

''رشید حسین! باز آ جاؤ۔ ورنہ تمہاری لاش پر رونے والوں کو بھی نہیں چھوڑوں گا۔''

اس کی آواز میں نہ جانے کیا سحر تھا کہ ماں جی اور وہ لڑکی سرتاپا کانپ کر رہ گئیں۔ جبکہ غفران بھی اپنی جگہ پر پہلو بدل کر رہ گیا، لیکن ان سب کی حالت سے بے نیاز ''رشید حسین بخاری'' مسلسل کچھ پڑھ رہے تھے۔ ان کے ہونٹ متحرک تھے اور یہ لمحات اس لڑکے پر بھاری ہو رہے تھے۔ وہ اسمٰعیل کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ چھڑانے کے لیے تڑپ رہا تھا، لیکن اسمٰعیل نہ جانے کیا بلا تھا کہ اس نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے لڑکے کو قابو کیا ہوا تھا۔ غفران سحر زدہ ہو کر یہ سارا معاملہ دیکھ رہا تھا۔

اسی اثناء میں شاہ جی اپنی جگہ سے اٹھے اور لڑکے پر پھونک مار دی۔ اس پھونک میں نہ جانے کیا اثر تھا کہ وہ لڑکا بے ہوش ہو گیا۔ اسمٰعیل نے شاہ جی کے اشارہ پر اس کا ہاتھ چھوڑ کر اسے آہستگی سے زمین پر لٹا دیا۔ پھر انہوں نے تمام لوگوں کو وہیں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے

رہنے کا کہا اور خود شہادت کی انگلی کے اشارے سے چٹائی کے اردگرد اس طرح دائرہ لگایا کہ اس پر تمام افراد جو بیٹھے ہوئے تھے خود کو دائرہ کے اندر محسوس کرنے لگے۔

رشید حسین بخاری واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئے۔ اس بار اسمٰعیل ان کے ساتھ ہی باادب دوزانو بیٹھ گیا تھا۔ شاہ جی ان کی طرف دیکھتے ہوئے گویا ہوئے۔

''اب کوئی بھی فرد اس چٹائی سے نہ اٹھے۔ چاہے حالات کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ کسی بھی ڈر اور خوف کی بنا پر یا پھر کسی سحر یا شعبدہ بازی کی دہشت سے متاثر ہو کر گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ اَن دیکھا جو دائرہ میں نے لگایا ہے۔ صرف آپ کی حفاظت کے لیے لگایا ہے۔'' وہ کچھ لمحہ کے لیے خاموش ہوئے۔

''اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت سے کوئی بھی شیطانی طاقت آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔'' اس کے بعد وہ خوبصورت لڑکی کی طرف متوجہ ہوئے۔ ''عصمہ بیٹی! گھبراؤ مت۔ خدا نے چاہا تو تمہارا بھائی خالد اچھا بھلا ہو جائے گا۔''

شاہ جی کے اس لڑکی کو مخاطب کرنے پر غفران کو معلوم ہوا کہ اس مجسمۂ حسن کا نام عصمہ اور اس لڑکے کا نام خالد ہے جو اس کا بھائی بھی ہے۔ اللہ جانے اس کو کیا بیماری تھی اور شاہ جی نہ جانے کیا کرنے والے تھے۔ وہ ایک بار پھر عصمہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

''بیٹی جو بھی بات ہے۔ کھل کر بتاؤ تا کہ میں اچھی طرح اللہ کی رضا سے اس کا حل کر سکوں۔''

عصمہ نے پہلی بار اپنے اردگرد ماحول پر نظر دوڑائی تو معاملے کی نزاکت کا احساس اور مشرقی عورت کی حس جاگ اٹھی۔ اس کی آنکھوں کی سرخی اور گلابی ڈورے بتا رہے تھے کہ وہ کئی راتوں سے سو نہیں سکی اور مسلسل رونے سے اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ وہ اب بھی متورم آنکھوں سے سب کو دیکھ کر نظریں جھکاتی ہوئی بولی۔

''والدین کی وفات کے بعد اس اکلوتے بھائی کی ذمہ داری مجھ پر آن پڑی۔ یوں کہیے کہ میرے ناتواں کندھے اس بوجھ کو برداشت کرنے کے لیے مجھے اس بے شرم اور نام نہاد شرفاء کی دنیا میں کوئی کام کرنے پر مجبور کرنے لگے۔ میں حافظ قرآن ہوں۔ میں نے گریجوایٹ بھی کیا ہے۔ اپنا اور اس بھائی کا پیٹ بھرنے کے لیے کئی دفاتر کے چکر لگائے۔ مگر کسی نے بھی اپنی ہوس کو پس پشت ڈال کر میرے ٹیلنٹ اور مجبوری کی قدر نہ کی۔ بلکہ الٹا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔'' یہ کہہ کر وہ رونے لگی اور سامنے پڑے ہوئے بے ہوش بھائی کو دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں کرب اور تکلیف کی جھلک نمایاں ہو گئی تھی۔ وہ اپنے

دوپٹے سے آنسو پونچھ کر پھر گویا ہوگئی۔

''پھر تقدیر کو مجھ پر رحم آ گیا۔ مجھے ایک پرائیویٹ سکول میں ٹیچر کی جاب مل گئی۔ اس تنخواہ سے ہمارا گزارہ ہونے لگا۔ میں نے خالد کو بھی قرآن پاک کی تعلیم دینی شروع کر دی تھی۔ یہ ماشاءاللہ تین پارے حفظ کر چکا ہے۔ ایک دن سکول سے واپسی پر اس نے کسی درخت کے نیچے پیشاب کر دیا۔ بس اسی دن سے اس کی یہ حالت ہوگئی ہے۔ راہ جاتے ہوئے لوگوں کو گالیاں دیتا ہے۔ لوگوں کے دروازوں پر اینٹیں مارنے لگتا ہے۔ کبھی کبھی تو راتوں کو اٹھ کر دیواروں پر چلنا شروع کر دیتا ہے۔'' وہ حسرت سے بے ہوش پڑے ہوئے خالد کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آواز بھرا جاتی تو شاہ جی اسے دلاسا دیتے تھے۔ جبکہ ماں جی، غفران اور اسمٰعیل تمام ماجرا حیرانی اور خاموشی سے سن رہے تھے۔

''میں اس کی حرکتوں سے تنگ آ گئی تھی۔ اسے سنگل سے باندھ کر سکول جاتی اور واپسی پر انتہائی دکھ سے اسے کھولتی تھی۔ کبھی کبھار کھانا کھا لیتا اور کبھی میرے بال نوچ کر میرا سر زمین پر لگا دیتا تھا۔ والدین کی وفات نے میرے غم و آلام کو مزید بڑھا دیا تھا۔ وہ اگر آج زندہ ہوتے تو اس کی مناسب دیکھ بھال کر سکتے تھے۔ میں عورت ذات، اس سنگدل معاشرے میں اس بھائی کو لے کر کہاں جاؤں۔ بس انہی سوچوں اور پریشانیوں میں مبتلا تھی کہ ایک دن ماں جی نے آپ کا ذکر کیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ آپ کی مریدنی ہے۔ بلکہ ماں جی کا تمام گھرانہ ہی آپ کے اعلیٰ خاندان کا مرید رہ چکا ہے اور آپ اللہ کے نیک بندے ہیں۔ میرے بھائی کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ کریں گے۔ بس مجھے اللہ سے بہت امید ہے کہ اس پاک ذات نے آپ کو میری تکالیف کا ازالہ کرنے کے لیے وسیلہ بنا کر بھیجا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ متورم آنکھوں سے اپنے بھائی کو دیکھنے لگی۔

''کوئی اور بات جو رہ گئی ہو؟'' شاہ جی نے پوچھا۔ تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔ وہ تذبذب کا شکار نظر آ رہی تھی۔ جیسے وہ کوئی اہم بات چھپانا چاہتی ہو، لیکن اہل علم سے وہ چھپا نہ سکتی ہو۔

''جو بھی بات ہے بلا خوف و خطر کہہ دو بیٹی!'' اس بار ماں جی عصمہ سے مخاطب ہوئی تھیں۔

شاہ جی پھر گویا ہوئے۔ ''میں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے بھائی کو کچھ نقصان نہیں ہو گا۔''

وہ جیسے گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ کیونکہ اس کے ذہن میں فوراً ہی یہ خیال آیا تھا کہ اگر وہ

تمام بات شاہ جی کو بتا دے گی تو کہیں اس کے بھائی کو نقصان نہ پہنچے۔ شاہ جی نے اس کے دل کی بات فوراً پڑھ لی تھی۔

وہ پڑھی لکھی اور باشعور لڑکی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اب اس ''سیّد بادشاہ'' سے کچھ بھی نہیں چھپانا چاہئے وہ اس انداز میں بولی کہ جیسے زبردستی اس سے کوئی بیان لیا جا رہا ہو۔

''میں ایک دن قرآن حکیم کی تلاوت کر رہی تھی کہ خالد نے باہر سے آ کر میرے ہاتھوں سے قرآنِ کریم چھیننے کی کوشش کی لیکن میں نے ایسا نہ کرنے دیا۔ عصمہ ایک بار پھر رو پڑی، اس کی بات سن کر حاضرین پر سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ غفران کو تعلیم کی کمی اور غنڈہ گردی نے کبھی بھی قرآن حکیم کی طرف رغبت نہ ہونے دی تھی، لیکن وہ اکثر دیکھتا تھا کہ اس کی ماں جی قرآن حکیم کو چوم کر اپنی آنکھوں سے لگاتی تھیں۔ اسے اچھی طرح محبت سے بوسے دے کر پھر انتہائی احتیاط سے کھول کر پڑھتی تھیں۔ وہ یہ جانتا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کی ہوئی وہ کتاب ہے۔ جو اس نے اپنے پیارے محبوب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری تھی۔ اس کا ایک ایک حرف ایک ایک زیر و زبر شد مد جزم نقطہ ہر چیز غرض کہ اس کو لپیٹنے والا جزدان بھی قابل تعظیم اور واجب احترام تھا۔

''اس پر ایک جن کا قبضہ ہے۔'' شاہ جی کی آواز کیا تھی، ان سب کے لیے ایک بم تھا۔

''وہ جن عیسائی ہے۔ اس بچے نے جس جگہ پیشاب کیا تھا۔ وہ جگہ اس کا مسکن تھی۔ اس نے اَن جانے میں ایسا کیا تھا۔ جس وجہ سے جن اس پر قابض ہو گیا۔ اس کے اندر بسنے والا جن اسے چیخنے چلانے پر مجبور کر دیتا تھا۔ وہ اسے مجبور کرتا تھا کہ یہ غلط کام کرے۔ لوگوں کو گالیاں دے۔ لوگوں کے دروازے توڑے تاکہ لوگ اسے اذیت دیں۔ اس کے جسم کو تکلیف پہنچائیں۔ ایسا کر کے وہ جن اپنے خاندان کو تسکین پہنچاتا تھا۔ جس پر اس نے پیشاب کر دیا تھا۔ قرآن حکیم کی بے حرمتی اس کا آخری حربہ تھی اگر خالد اس عظیم اور مقدس کتاب کی بے حرمتی کر دیتا تو یقیناً لوگ اسے مار ڈالتے اور یہی وہ عیسائی جن چاہتا تھا۔ اس طرح اس کا انتقام پورا ہو جاتا۔''

شاہ جی خاموش ہوئے تو ماحول سحر زدہ ہو گیا تھا۔ غفران جو کہ روزانہ پستول اور جدید اسلحہ سے کھیلتا تھا۔ اسے یقین نہ ہو رہا تھا کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی ''جن پریاں'' ہوتی ہیں لیکن یہ بات کوئی عام آدمی نہ کہہ رہا تھا۔ شاہ صاحب کہہ رہے تھے۔ جو آل رسول تھے اور انہوں نے کبھی بھی جھوٹ نہ بولا تھا۔ ان کی کوئی بھی بات اپنی طرف سے نہ ہوتی تھی۔ بلکہ ہر بات میں اللہ تعالیٰ کی رضا شامل ہوتی تھی۔

''تم فکر نہ کرو اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا۔ اس کی مدد اور رضا سے ہم کچھ نہ کچھ ضرور کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر شاہ جی منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگے، لیکن اسمٰعیل کے چہرے پر اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ پہلو بدل رہا تھا۔ یہ بات غفران نے ہی محسوس کی تھی جبکہ عصمہ اور ماں جی سر جھکائے ہوئے بیٹھی تھیں۔ شاہ جی نے تقریباً دس منٹ تک پڑھنے کے بعد بے ہوش پڑے ہوئے خالد کے چہرے پر پھونک ماری تو وہ جھرجھری لے کر اٹھ بیٹھا۔ وہ حیرانگی سے تمام لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس ماحول کو اجنبی سمجھ کر وہ اٹھ کر بھاگنا چاہتا تھا، لیکن اپنی جگہ پر جم کر رہ گیا۔ اس نے جب عصمہ کی طرف دیکھا تو روتا ہوا بولا۔

''آپی ہم کہاں آ گئے ہیں؟ یہ بابا جی کون ہیں؟ مجھے ان سے ڈر لگ رہا ہے۔''

''محمد خالد، میری طرف دیکھو'' شاہ جی کی آواز میں جو کڑک تھی وہ خالد کا رخ بدلنے کے لیے کافی تھی۔

''آپ کون ہیں؟'' وہ شاہ جی سے مخاطب تھا۔

''اللہ کا بندہ ہوں۔''

''مجھے کیوں باندھا ہوا ہے؟'' خالد کا چہرہ آہستہ آہستہ سرخ ہونا شروع ہو گیا تھا۔

''ابھی کھول دیں گے۔'' شاہ جی نرمی سے بولے۔

''تم آگ سے کھیل رہے ہو رشید حسین۔'' خالد کے منہ سے یکایک تیز آواز نکلی۔ اس کا چہرہ آگ کی طرح لال بھبوکا ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے خون نکلتا محسوس ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا ابھی اس کی آنکھیں خون رونا شروع کر دیں گی۔ اس کی آواز بھی تبدیل ہو گئی تھی۔ اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ بارہ سالہ بچہ خالد بات کر رہا ہے۔ عصمہ اپنے بھائی کی حالت دیکھ کر پھر رونے لگی تھی۔ ماں جی اور غفران مضطرب نظر آ رہے تھے۔ جبکہ اسمٰعیل اب پُرسکون ہو چکا تھا۔ خالد کا چہرہ بگڑتا جا رہا تھا۔

''رشید حسین باز آ جاؤ۔ میں تمہاری نسل ختم کر دوں گا۔'' خالد پھر غرایا۔

شاہ جی نرمی سے مسکرائے۔ ''تاریخ گواہ ہے کہ ہمارے اجداد شروع سے ہی آگ سے کھیلتے ہوئے آ رہے ہیں اور میری نسل ختم کرنے کی بات تم نے خوب کہی۔ کیونکہ میری کوئی اولاد نہیں۔ میرے مریدین ہی میری اولاد ہیں۔'' وہ خالد کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ ''اور تم اتنی جرأت نہیں کر سکتے کہ میرے کسی بھی مرید کو بُری نگاہ سے دیکھ سکو۔'' یہ کہہ کر ان کے ہونٹ پھر متحرک ہو گئے۔ وہ پڑھتے جا رہے تھے اور خالد کی جسمانی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ غفران اور عصمہ کو تو ایسا لگ رہا تھا جیسے کہ وہ کوئی الف لیلوی داستان کے کردار

ہوں۔ کیونکہ وہ دونوں ہی اس طرح کی ناقابل یقین باتیں اور عمل پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ جبکہ ماں جی بالکل پُرسکون تھیں۔ کیونکہ وہ بخاری بابا کی پرانی مریدنی تھیں۔ اسی لیے یہ کام اس کے لیے کوئی نیا نہ تھا اور اسمٰعیل، نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ بالکل انجان بنا بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔

''رشید حسین اپنے آپ کو روک لو۔ یہ تمہارے لیے آخری مہلت ہے۔'' خالد بولا۔ کیونکہ شاہ جی نے کلام الٰہی پڑھنے کے بعد اس کے چہرے پر پھونک ماری تھی۔ جس سے وہ تڑپ کر رہ گیا تھا۔ شاہ جی نے اب خالد کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے تھے۔

''لو بھئی اب کر لو جو کچھ تمہیں کرنا ہے۔'' وہ خالد کے اندر موجود عیسائی جن سے مخاطب ہوئے۔

''رشید حسین تم کیا چاہتے ہو؟'' وہ صلح جُو لہجے میں بولا تو شاہ جی مخصوص مسکراہٹ سجائے ہوئے بولے۔

''اس بچے کو چھوڑ دو۔''

''اس نے میرے قبیلے پر اس وقت گند ڈالا ہے جب ہم کھانا کھا رہے تھے۔''

''یہ نادان ہے۔ ذرا یہ تو سوچو کہ یہ تمہیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اسے تم نے بہت ستا لیا ہے۔ اب اس کا پیچھا چھوڑو اور یہاں سے دفع ہو جاؤ۔'' شاہ جی نے آخری فقرہ سخت لہجے میں کہا۔

''میں یہاں سے نہیں نکل سکتا۔ مجھے کافی سکون ہے۔ تم اپنا اور میرا وقت برباد کر رہے ہو۔'' اس کا انداز ایسا تھا۔ جیسے وہ مزید بات نہیں کرے گا۔

خالد نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ شاہ جی نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیے اور جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کاغذ نکالا۔ اس کاغذ پر پین سے کچھ لکھنا شروع کیا ہی تھا کہ خالد کی حالت بگڑنے لگی۔ وہ چیخنے لگا۔

''مجھے چھوڑ دو رشید حسین۔ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے معاف کر دو۔ مت لکھو۔ میں برباد ہو جاؤں گا۔'' وہ تڑپ کر بولا۔ اس نے شاہ جی کے پاؤں پکڑ لیے، لیکن شاہ جی پر اس کی گریہ زاری کا کوئی اثر نہ ہوا تھا وہ مسلسل لکھ رہے تھے جبکہ خالد کے اندر موجود خبیث روح یا جن کافی مضطرب اور بے چین تھا۔

''رشید حسین! تمہیں تمہارے نبی کا واسطہ، مجھے معاف کر دو۔'' وہ لجاجت سے بولا۔ اس کاغذ پر شاہ جی نہ جانے کیا تحریر کر رہے تھے کہ وہ جن یک دم منت آمیز لہجہ اختیار

کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

''ایک شرط پر معاف کر سکتا ہوں۔'' شاہ جی کے ہاتھ رک گئے تھے۔

''مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔ جلدی بولو مجھ سے یہ عذاب برداشت نہیں ہو رہا ہے۔''

''تم اور تمہارا قبیلہ دوبارہ اس ملک میں نظر نہیں آئیں گے۔''

''ایسا نہیں ہو سکتا! میرے قبیلے نے بہت سی جگہوں پر بہت سے جسموں پر ڈیرہ جمایا ہوا ہے۔''

''ٹھیک ہے اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو تڑپتے رہو۔'' شاہ جی یہ کہہ کر ایک بار پھر کاغذ پر کچھ لکھنے لگے اور وہ پھر تڑپنے لگا۔

''میں نے تم سے کہا ہے کہ مت لکھو۔ میں مر جاؤں گا۔ مجھے معاف کر دو۔''

''اسمٰعیل اس کے لیے قید خانے کا گیٹ کھولو۔'' شاہ جی اسمٰعیل سے مخاطب ہوئے تو تمام افراد ان کی بات سن کر حیران ہو گئے کہ کون سا قید خانہ؟ کون سا گیٹ؟ یہ باتیں مافوق العقل ضرور تھیں، لیکن وہ اس تمام کہانی اور چشم دید عمل کے گواہ تھے اور پھر ان کی حیرت مزید دوچند ہو گئی جب اسمٰعیل نے اپنی قمیض کی سائیڈ جیب سے ایک شیشے کی بڑی سی بوتل نکالی۔ اس کا ڈھکن کھول کر اس نے بوتل شاہ جی کی طرف بڑھا دی۔

''اب اس لڑکے کا پیچھا چھوڑ کر خاموشی سے اس بوتل میں آ جاؤ۔ یہی تمہاری نجات کا راستہ ہے۔ ورنہ تم ابھی جل کر خاک ہو جاؤ گے۔'' شاہ جی نے خالد کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں خوف جھلک رہا تھا۔

''مجھے جانے دو رشید حسین۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔'' اس کا انداز ایسا تھا کہ عصمہ کو بے اختیار اپنے بھائی پر بہت ترس آیا۔ مگر وہ کچھ نہ کر سکتی تھی۔ بس دیکھتی ہی رہی۔

''تمہاری جان کی سلامتی اسی شرط پر منحصر ہے کہ تم اس بوتل میں رہنا چاہتے ہو۔ یا پھر جل کر خاک میں مل جانا پسند کرو گے۔'' شاہ جی کے لہجہ میں سختی عود آئی تھی۔

''رشید حسین! تم سیّد زادے ہو۔ اس کائنات کے اعلیٰ ترین خاندان کے چشم و چراغ ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم وعدہ خلافی نہیں کرو گے، لیکن میں نے تمہیں تمہارے نبی کا واسطہ دیا ہے۔ کیا تم اس واسطہ کی لاج نہ رکھو گے؟''

وہ بھی بڑا کایاں تھا۔ اس نے اپنی طرف سے ایک شاندار جال بچھایا تھا، لیکن آلِ رسول کے اس چشم و چراغ پر اس کے کسی مکر کا اثر نہ ہوا تھا۔

انہوں نے کاغذ پر دوبارہ لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ پھر تڑپنے لگا۔ خالد کے ہاتھ

پاؤں ٹیڑھے ہوگئے آنکھیں اُبلنا شروع ہوگئیں تھیں۔ انہوں نے دیکھا کہ خالد کے جسم نے ایک زبردست جھٹکا کھایا اور پھر وہ بیہوش ہوگیا تھا۔ اسمٰعیل نے بوتل کا ڈھکن بند کرلیا تھا۔ شاہ جی کے حکم پر اس نے بوتل واپس اپنی جیب میں ڈال لی تھی۔ شاہ جی کا چہرہ اب پُرسکون تھا۔ انہوں نے مسکرا کر سب کی جانب دیکھا اور بولے۔

''اب تم لوگ اپنی اپنی جگہ چھوڑ سکتے ہو۔ میں نے جن کو بوتل میں بند کردیا ہے۔'' انہوں نے اٹھ کر عصمہ کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

''اب تمہارا بھائی بالکل ٹھیک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنا خاص کرم کیا ہے۔ اسے پھر سے حافظ قرآن بننے کے لیے تعلیم دینا شروع کردو۔ ان شاء اللہ یہ سمندر بھی آسانی سے پار کر جائے گا۔'' اب وہ غفران کی طرف مڑے۔ ان کے کھڑے ہونے پر یہ تمام لوگ بھی کھڑے ہوگئے تھے۔

''غفران میاں!''

''جی شاہ جی!'' وہ نگاہوں کو جھکائے ہوئے ہاتھ باندھ کر کھڑا تھا۔

''گناہوں کی زندگی بہت لمبی ہوتی ہے۔ اس میں لذت اور مزا ہوتا ہے۔ ایسی زندگی انسان چھوڑنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ وہ اس مین مدغم ہو چکا ہوتا ہے۔ قدم قدم پر رنگین مزاجی اور دولت کی فراوانی انسان کو یادالٰہی سے غافل کردیتی ہے۔ انسان غفلت میں اللہ تعالیٰ سے دور ہی دور ہوتا جاتا ہے اور پھر جب اس کی زندگی تمام ہوتی ہے تو نزع کے عالم میں بالکل آخری وقت میں بھی خداوند کریم اپنے اس بندے کی طرف محبت سے دیکھتا ہے۔ کیونکہ اس نے اس وقت بھی اس بندہ پر اپنی رحمت اور توبہ کے دروازے بند نہیں کئے ہوتے۔ سچے دل سے خدا کی راہ میں نکلو۔ اس کے دین کی تبلیغ اور اشاعت کے لیے ایک قدم بھی چلو تو تمہارے پاؤں پر لگنے والی گرد بھی تمہارے لیے دعا کرے گی۔ کیونکہ پیارے آقا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے کہ، یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی کے قدم اللہ کی راہ میں غبار آلودہ ہوں اور پھر جہنم کی آگ اسے چھوئے۔

''اپنے اعضاء پر رحم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو نمازوں کا تحفہ دیا ہے۔ پانچ وقت کی نماز پڑھنے سے تمہارے جسم کے تمام اعضاء اور ان کے جوڑ اچھی طرح کھل جاتے ہیں۔ جو یقیناً تمہارے لیے دعا کرتے ہیں۔'' وہ کچھ توقف کے بعد پھر گویا ہوئے۔

''لوح محفوظ پر اپنی نیکیوں کی تعداد اتنی بڑھاؤ کہ لکھنے والے لکھتے لکھتے تھک جائیں۔ اگر تم قرآن پڑھے ہوئے نہیں ہو تو اس وقت سنا ضرور کرو۔ جب تمہاری ماں جی قرآن کریم کی

تلاوت کررہی ہوں۔'' اب وہ عصمہ کی طرف مڑے اور بولے۔

''اس خبیث شیطان نے خالد کے جسم پر قابض ہوکر قرآن کریم کی بے حرمتی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی سزا اس قدر بھیانک ہوگی کہ اس کا قبیلہ تو کیا آنے والے والی نسلیں بھی عذاب الٰہی سے بچ نہ سکیں گی۔ میں نے اسے بوتل میں بند کرلیا ہے۔ اس کا فیصلہ حویلی جاکر کروں گا۔'' وہ جانے کے لیے مڑے اور پھر کچھ یاد آگیا تو عصمہ سے مخاطب ہوئے۔

''اور ہاں۔ میں ایک تعویذ بھیجوں گا۔ جس پر اللہ رب العزت کا کلام درج ہوگا۔ خالد کے گلے میں باندھ دینا اور کبھی بھی مت اتارنا۔'' یہ کہہ کر وہ باہر کی جانب چلے گئے۔ اسمٰعیل ان کے پیچھے پیچھے ہاتھ باندھ کر چل پڑا تھا۔ ان کے باہر نکل جانے کے بعد ماں جی نے دروازہ بند کیا۔ واپس پلٹ کر صحن میں آئیں تو عصمہ اور غفران گنگ کھڑے تھے۔

''بیٹی! یہ میرا پُتر غفران ہے۔'' ماں جی نے تعارف کروایا۔

عصمہ نے سر کے اشارے سے غفران کو سلام کیا تو اس کے اندر کی دنیا اتھل پتھل ہو گئی۔ جبکہ عصمہ نے نگاہیں جھکالیں۔ ایک بار پھر ماں جی کی آواز ابھری۔

''عصمہ پُتر ایک سکول میں ماسٹرنی ہے۔ بچوں کو انگریجی پڑھاتی ہے۔ یہ خالد اس کا کا بھائی ہے۔ بے چاری کا آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ بس اسی بھائی کو ہی کل کائنات سمجھتی ہے۔'' ماں جی نے عصمہ کا بھی تعارف کروادیا تھا۔ جواب تک اپنے بیہوش بھائی کے پاس بیٹھ چکی تھی۔

''ماں جی کوئی روٹی وغیرہ بھی ہے کہ ''بھکھ'' سے پیٹ میں دوڑنے والے چوہے باہر نکل آئیں۔''

غفران نے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر کہا تو عصمہ اس کی اس بے ساختگی پر مسکرائے بنا نہ رہ سکی اور ویسے بھی اب پریشانی دور ہوگئی تھی۔ وہ ماں جی سے مخاطب ہوئی۔

''ماں جی! میں اپنے گھر جانا چاہتی ہوں اور یہ خالد ابھی تک ہوش میں نہیں آیا۔''

''پریشان نہ ہو پُتر۔ اس پر پانی کے چھینٹے مار، یہ ابھی بھلا چنگا اٹھ کر کھڑا ہوجائے گا۔ تُو دیکھ لے۔ ایسا ہی ہوگا۔'' ماں جی یہ کہہ کر اندر باورچی خانے کی طرف بڑھ گئیں۔

''آپ ماں جی کی بات مان کر دیکھ لیں جی۔ یہ بھی پہنچی ہوئی عورت ہے۔'' غفران کا انداز ایسا تھا کہ عصمہ نے بے اختیار اس کی طرف دیکھا اور کھل کر ہنس پڑی۔ وہ نہ جانے کتنے مہینوں بعد کھل کر ہنسی تھی اور اس کے مسکرانے پر غفران کو ایسا لگا تھا کہ کتنے پھول اس

کے گھر میں آسمان سے آگرے ہوں۔ عصمہ کی نقرئی ہنسی سے وہ بھی محظوظ ہوا تھا۔

''میں خالد کو اٹھا کر چھوڑ آؤں۔'' غفران نے عصمہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''نہیں۔ آپ کو بلاوجہ ہی تکلیف ہوگی۔'' وہ غالباً نہیں چاہتی تھی کہ غفران اس کے گھر میں جائے اور پھر اس طرح کہ خالد بھی ہوش میں نہ تھا۔ اس لئے وہ جلدی سے بولی۔ ''میں ماں جی کے ساتھ چلی جاؤں گی۔ یہ پاس ہی تو میرا گھر ہے۔ آپ کھانا کھائیں۔''

اتنی دیر میں ماں جی اندر سے پانی کی بوتل لے آئیں۔ ''یہ شاہ جی کا پڑھا ہوا پانی ہے۔'' ماں جی نے ڈھکن کھول کر خود ہی اس میں سے تھوڑا سا پانی لے کر اس کے چھینٹے بے ہوش خالد کے چہرے پر پھینکے تو وہ کسمسا کر آنکھیں کھول کر بیٹھ گیا۔ وہ حیرانگی سے اردگرد دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ وہ آسیب کے تابع تھا جب یہاں لایا گیا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی، لیکن عصمہ پر نگاہ پڑتے ہی وہ اس سے لپٹ گیا۔

بہن بھائی کا پیار بھی قدرت کا انوکھا تحفہ ہوتا ہے۔ یہ رشتہ بے لوث اور ہر قسم کی غرض سے پاک ہوتا ہے۔ عصمہ اس کی بڑی بہن تھی۔ وہ بھائی کو تازہ دم اور ٹھیک ٹھاک دیکھ کر خوشی سے بہنے والے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکی تھی۔ دونوں بہن بھائی جب رو رو کر اپنا جی ہلکا کر چکے تو عصمہ کو یاد آیا کہ واپس گھر بھی جانا ہے۔ کیونکہ کافی دیر ہوگئی تھی گھر سے آئے ہوئے۔ اس نے اجازت طلب نظروں سے ماں جی کی طرف دیکھا۔

''بیٹی! میں تو کہتی ہوں کھانا کھا کر چلی جانا۔'' ماں جی کے لہجے میں خلوص اور محبت کو محسوس کر کے وہ ایک بار پھر آبدیدہ ہوگئی، لیکن خود پر قابو پاتے ہوئے فوراً بولی۔

''آپ خالد کے لیے دعا کریں۔'' وہ غفران کی طرف بھی کنکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ ''شاہ جی سے اس کا تعویذ لا کر مجھے ضرور پہنچا دیجئے گا۔ آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ زندگی نے موقع دیا تو اس کا بدلہ ضرور اتارنے کی کوشش کروں گی۔'' وہ منہ سے پھول گرا رہی تھی۔

''نہ پتر!'' ماں جی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''کیوں ہم کو گناہگار کرتی ہو۔ یہ تو سب کچھ اللہ کے فضل و کرم سے ہوا ہے۔ بس اس نے شاہ جی کو وسیلہ بنانا تھا۔ سو بنا دیا! بھلا وہ خود تھوڑا زمین پر آتا ہے۔ اس نے اپنے بندے پیدا کیے ہیں۔ جو اس کے حکم سے اس کی مرضی سے غلط کو صحیح کرتے رہتے ہیں۔'' ماں جی اب غفران کی طرف مڑیں۔

''ایسے ہی ''دیلا'' کھڑا ہے۔ جا جا کر عصمہ اور خالد کو ان کی دہلیز تک چھوڑ آ۔''

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں کے مصداق غفران نے فوراً ہی ہاں کہہ دی۔ اس نے

دیکھا ہی نہیں کہ عصمہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا۔ اس نے فوراً ہی خالد کو اٹھایا اور باہر کی جانب لپکا۔ جبکہ عصمہ کو بھی اس کی پیروی کرنی پڑی۔

عصمہ کو بڑا عجیب لگ رہا تھا کہ وہ غفران کے ساتھ چل رہی تھی۔ گو کہ غفران نے اپنے گریبان کے کھلے ہوئے تمام بٹن بند کر لئے تھے۔ مگر پھر بھی اس کی چال اور لباس سے اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ غفران کوئی اچھی قماش کا آدمی نہیں ہے، لیکن مجبوری تھی۔ اپنے گھر کے دروازے پر پہنچ کر اس نے غفران کو اندر آنے کے لیے بھی نہیں کہا۔ وہ اس گلی اور محلہ میں شرافت کی زندگی گزار رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ لوگ اس کے خلاف باتیں کریں۔ لہٰذا اس نے غفران کا باہر ہی سے شکریہ ادا کر دیا جس کا مطلب تھا کہ اب وہ جا سکتا ہے، لیکن غفران تو غفران تھا حُسن اس کی کمزوری تھا۔

''کبھی بھی گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وہ نظریں نیچی کئے ہی بات کر رہا تھا۔ جبکہ عصمہ تالا کھولنے میں مصروف تھی۔ ''کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو خالد کو ماں جی کے پاس بھجوا دیا کریں۔'' اس نے جان بوجھ کر ماں جی کا ذکر کیا تھا۔ وہ براہِ راست اپنا نام نہ لینا چاہتا تھا، کیونکہ وہ اس لڑکی کو اچھا بن کر دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پتہ نہیں اس امر کی ضرورت کیوں تھی۔ وہ عصمہ اور خالد کے اندر داخل ہو جانے کے بعد اپنے گھر کی طرف واپس چل پڑا تھا۔

☆======☆======☆

ڈاکٹر شارق رضا۔ ایم، بی، بی ایس اور نہ جانے کون کون سی انگریزی الٹی سیدھی کر کے لکھی ہوئی تھی۔ اس وقت کلینک کے بورڈ پر جانی کی نظریں ٹکی ہوئی تھیں۔ جبکہ کلینک ابھی بند تھا۔ وہ غفران کی ہدایت پر اس نام نہاد ''پیر'' کا حدود اربعہ معلوم کرنے نکلا تھا۔ غفران نے اسے یہ بتایا تھا کہ وہ ابتدائی کام اس کلینک سے کرے۔ کیونکہ اس کی معلومات کے مطابق ناسور اسی جگہ سے پھیلنا شروع ہوا تھا۔ اسے کلینک کے ٹائم ٹیبل کا علم نہ تھا۔ اس نے پڑھ لیا تھا کہ شام سات بجے سے رات گیارہ بجے تک ڈاکٹر شارق مریضوں کو چیک کرتے ہیں اور جو بھی دوا ان کے لیے مناسب ہوتی ہے، تجویز کرتے ہیں۔ ابھی تک تو جانی فارغ ہی تھا۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا تو صرف پانچ ہی بجے تھے۔ کلینک میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ وہ یہ وقت کہیں گھوم پھر کر گزارنا چاہتا تھا۔ اس کے پاس اچھی خاصی رقم تھی۔ اس نے سوچا کیوں نہ پیٹ پوجا کر لی جائے۔ وہ کلینک سے چند قدم کے فاصلے پر بنے ہوئے ایک اچھے ریستوران کی طرف چل پڑا۔ شہر کے بارونق علاقے میں کلینک تھا۔ اچھی خاصی

آمدنی ہوتی ہوگی، لیکن غفران نے ڈاکٹر شارق کے کلینک سے ہی باباجی کو چیک کرنے کا کیوں کہا تھا۔ ڈاکٹر ایک اچھا خاصا تعلیم یافتہ بندہ ہوتا ہے۔ یہ بابے، جن، بھوت یہ پریاں وغیرہ تو کم عقل اور بے شعور لوگوں کی سوچ میں شامل ہوتی ہیں۔ سائنس اس بات کو نہیں مانتی۔ پھر اگر ڈاکٹر شارق جن بھوت اور پریوں کا علاج کروانے کے لیے مریضوں کو باباجی کا پتہ بھی دیتا تھا تو اس کا کیا مفاد تھا۔ اس طرح تو اس کے کلینک کی آمدنی کم ہوتی ہو گی۔ یہ غفران بھائی بھی سٹھیا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کے دماغ کو سکون پہنچانے کے لیے کسی ''دعوت'' کا انتظام اور بندوبست کرنا پڑے گا۔

جانی اپنی سوچوں اور خیالوں کے ساتھ چلتا ہوا ریستوران میں داخل ہوا۔ اپنی چیزوں کا آرڈر دے کر اس نے ادائیگی کی تو خوبصورت سیلز کاؤنٹر گرل نے اس کا آرڈر چند منٹ بعد سرو کر دیا۔ وہ اپنی چیزیں اٹھائے ایک خالی ٹیبل کی طرف بڑھ گیا۔ جس کے ساتھ والی میز پر ایک نوجوان جوڑا خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ وہ کبھی کبھی سامنے پڑی ہوئی پلیٹ میں سے فرنچ سلائیس کے دو ایک ٹکڑے لے کر منہ میں رکھ لیتے اور پھر ٹھہر کر کسی بات پر مسکرانے لگتے۔ جانی نے چکن برگر پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا تو تیسرے نوالے پر ہی اس کے ہاتھ رک گئے۔ اس کے کانوں میں بات ہی ایسی پڑی تھی۔ ساتھ والی میز پر بیٹھا ہوا جوڑا باتوں باتوں میں شیخ عمر حیات کا تذکرہ چھیڑ کر بیٹھ گیا تھا اور شیخ عمر حیات کا نام سن کر جانی کے ہاتھ رک گئے، لیکن کان کھڑے ہو گئے تھے۔ اب وہ مشروب کے ہلکے ہلکے سپ لینے لگا تھا تا کہ ان کی باتیں غور سے سن سکے۔ اس نے ارد گرد میزوں پر نگاہ دوڑائی تو ہر کوئی مصروف نظر آیا۔ اس جوڑے کو گمان بھی نہ تھا کہ کوئی ان کی باتیں سننے کے لیے اپنا کھانا ترک کر چکا ہے اور پوری توجہ سے اور انہماک سے ان کی طرف متوجہ ہے۔

''دیکھیے ڈاکٹر صاحب!'' یہ سریلی آواز لڑکی کی تھی۔ ''شیخ عمر حیات کوئی معمولی آسامی تو ہے نہیں جو آپ اس طرح انکار کر رہے ہیں۔ اس پارٹی سے جتنی بھی آمدنی ہو گی۔ وہ ہم تینوں میں تقسیم ہو گی کیونکہ یہ پارٹی میں نے ڈھونڈی ہے۔'' وہ یہ کہہ کر خاموش ہوگئی تو ڈاکٹر بول پڑا۔

''دیکھو میری جان! روپیہ پیسہ آنے جانے والی چیز ہے۔ تم نے آسامی ڈھونڈی۔ اس کا معاوضہ تمہیں مل جائے گا۔ باقی رہ گئی تین حصوں والی بات تو یہ میرا اور ''تجمل'' کا معاملہ ہے۔ وہ مجھے کیا دیتا ہے؟ میں اس سے کیا لیتا ہوں؟ لیتا بھی ہوں یا نہیں۔ یہ تمہارا سردرد نہیں ہے۔ اوکے!''

''ڈاکٹر صاحب میں اس طرح آسانی سے ٹلنے والی نہیں ہوں۔'' لڑکی بھی ضد کی پکی تھی۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تجمل نے آپ کو میرے ساتھ ڈیلنگ کے لیے بھیجا ہے اور آپ آج ''ٹک مکا'' کر کے ہی جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے!'' ڈاکٹر کی آواز جانی کے کانوں میں پڑی۔ ''اپنی ڈیمانڈ بتاؤ۔''

''صرف دس لاکھ۔'' لڑکی نے مختصر سا جواب دیا۔

''صرف تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے کہ ہمارا واقعی کسی ''شیخ'' کے سلوکے میں ہاتھ پڑ گیا ہے۔'' ڈاکٹر کی آواز میں طنز تھا۔ ''وہ اس ملک کا شیخ عمر حیات ہے۔ کوئی عربی ''شیخ'' نہیں ہے۔ لہٰذا منہ تھوڑا کھولو۔ تا کہ آسانی سے بھر سکو۔''

''اوکے! اب میرا منہ کسی مناسب موقع پر ہی کھلے گا۔'' غالباً لڑکی نے جانے کے لیے کرسی کھسکائی تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر کی آواز آئی۔

''بیٹھ کر بات کرو! تا کہ معاملہ نپٹ سکے۔''

''صرف دس لاکھ۔''

''میں صرف آٹھ لاکھ دے سکتا ہوں۔''

''تم نے کون سا اپنی جیب سے ادا کرنے ہیں۔''

''میرا باپ کوئی ڈکیت نہیں ہے۔ پتہ نہیں کب اس شیخ کے نیچے سے کوئی موٹی رقم برآمد ہوتی ہے۔ میرا مشورہ ہے اسی پر قناعت کرو، کیونکہ قناعت پسندی اچھی چیز ہے۔''

''یہ کتابی باتیں اپنے پاس ہی رکھو۔ میں کوئی روتی ہوئی بچی نہیں ہوں جو آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کو دیکھ کر بہل جاؤں گی۔ ہاں یا ناں۔''

''ٹھیک ہے! رقم کل تمہارے اکاؤنٹ میں جمع ہو جائے گی۔ اب معاہدے کے مطابق تم ایک ماہ تک یہاں نظر نہیں آؤ گی۔'' ڈاکٹر کی شکست خوردہ آواز آئی تو کرسیاں کھسکنے کی آواز پر جانی نے بھی اپنا باقی کھانا زہر مار کرنا شروع کر دیا۔ اس نے ڈاکٹر اور لڑکی کو غور سے دیکھ لیا تھا۔ جبکہ ان دونوں کے گمان میں بھی نہ تھا کہ کسی نے ان کی گفتگو سنی ہوگی۔ لڑکی کافی خوبصورت تھی اور جانی کے خیال میں کنواری بھی ہوگی، لیکن اس کی چال ڈھال اور گفتگو سے پتہ چلتا کہ وہ کافی چالاک بھی ہوگی۔ جبھی تو اتنی بڑی ڈیل اکیلے اکیلے ہی طے کر کے چلتی بنی۔

جانی نے سوچا کہ ان میں سے کسی کا تعاقب کرنا چاہئے، لیکن پھر اپنا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ وہ سب سے پہلے ڈاکٹر شارق سے ملنا چاہتا تھا۔ لڑکی اس لڑکے کو بھی ڈاکٹر کہہ رہی

تھی۔ کہیں یہی ڈاکٹر شارق تو نہیں ہے؟ طرح طرح کے سوالات اسے پریشان کر رہے تھے۔ اسے اس عام معاملے سے کوئی ذاتی دلچسپی نہ تھی، لیکن غفران کو دلچسپی تھی۔ وہ شیخ عمر حیات کا نمک خوار تھا۔ جبکہ جانی غفران کا نمک خوار تھا۔ غفران کو عالیہ بیگم کا ''بابا جی'' کے سامنے جھکنا اچھا نہ لگا تھا اور ویسے بھی غفران خود جس قماش کا بندہ تھا۔ بابا جی بھی اسے اپنا ہی کوئی ''پیٹی بھائی'' لگا تھا۔ وہ جاننا یہ چاہتا تھا کہ یہ بابا کہاں سے آیا ہے اور کیوں آیا ہے۔ بس اسی تجسس نے جانی کی ڈیوٹی لگوا دی تھی۔ یا یوں کہہ لیں کہ جانی غفران کا کام کرنے کے لیے مجبور تھا۔ وہ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا، لیکن اب اس سلسلے کی زنجیر کی پہلی کڑی اس کے سامنے تھی۔ وہ لڑکی اور وہ ڈاکٹر جو لڑکی کے ساتھ تھا۔

جانی انہی سوچوں میں مگن اپنا وقت گزار رہا تھا۔ چھ بج چکے تھے۔ اس نے سوچا کہ کلینک پر جا کر بیٹھنا چاہیے، بعد میں مریضوں کا رش زیادہ نہ ہو جائے۔ وہ ریستوران سے باہر نکلا اور شارق کلینک کی طرف چل پڑا۔

اس کے ٹوکن کا نمبر بولا گیا تو وہ اٹھ کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی اسے جھٹکا لگا۔ سامنے کرسی پر وہی ڈاکٹر بیٹھا ہوا تھا جو ریستوران میں لڑکی سے ڈیل کر چکا تھا۔ جانی نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ڈاکٹر کے سامنے رکھے ہوئے سٹول پر بیٹھ گیا۔

ڈاکٹر شارق اپنے اسٹیتھ سکوپ کو سنبھالتے ہوئے جانی سے مخاطب ہوا۔

''جی کہیے کیا پرابلم ہے آپ کو؟''

جانی کو سمجھ نہ آ رہی تھی کہ کیا بیماری بتائے۔ کیونکہ وہ کوئی بھی بیماری بتاتا تو ڈاکٹر اسے چیک کر لیتا اور تندرست ہونے کی صورت میں ظاہر ہے وہ واجبی سی دوائی لکھ دیتا اور جانی کے دوبارہ اس کلینک پر آنے کا جواز ختم ہو جاتا۔ بہت سوچ سمجھ کر جانی بولا۔

''دراصل ڈاکٹر صاحب۔'' وہ کچھ دیر کے لیے رکا جیسے الفاظ جمع کر رہا ہو۔ ''میرا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے۔ میرے دل پر کبھی کبھار درد ہونے لگتا ہے۔ درد کی شدت اس قدر تیز ہوتی ہے کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کروں۔ پھر ایک پانی کے گلاس یا ٹھنڈی بوتل سے ایسے ہو جاتا ہے جیسے کوئلوں پر پانی پڑ گیا ہو۔''

ڈاکٹر شارق نے بغور اس کا معائنہ کیا اور اسٹیتھ سکوپ کو اس کی چھاتی پر مختلف جگہوں پر رکھ کر چیک کرتا رہا۔ ''بظاہر تو کوئی نقص معلوم نہیں ہو رہا۔'' جانی نے ڈاکٹر کی مایوسی بھانپتے ہوئے ایک اور پتہ پھینکنے کا سوچا۔

''کئی دنوں سے مجھے اپنی کوٹھی سے انجانا سا خوف آتا ہے۔'' وہ ڈاکٹر کی آنکھوں

میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ایسا لگتا ہے جیسے کوئی مجھے قتل کر دے گا۔ بس اسی وجہ سے میں ڈپریشن کا شکار رہتا ہوں۔'' اس کا تیر نشانے پر لگا تھا۔ ڈاکٹر کی آنکھوں میں مخصوص چمک نے اسے بات آگے بڑھانے کا حوصلہ بخشا۔

''بیوی اور بچوں کو میں نے امریکہ بھجوا دیا ہے۔'' جانی بظاہر لاتعلقی سے بات کر رہا تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ ڈاکٹر ہمہ تن گوش ہے۔ ''میں انہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے لگتا ہے کہ کوئی آسیب ہے جو کہ میری جان کا دشمن ہے، لیکن پھر خود ہی مسکرانے لگتا ہوں کہ آج کل کے ترقی یافتہ دور میں یہ تو کتابی باتیں ہیں......!''

''نہیں یہ محض کتابی باتیں نہیں ہیں۔'' ڈاکٹر نے اس کا ڈالا ہوا دانہ چگنا شروع کر دیا تھا۔ جبھی تو اس نے جانی کی بات کاٹ دی تھی۔ ''آسیب کہیں بھی اپنا گھر بنا لیتا ہے، لیکن ہر بیماری کی دوا ضرور ہوتی ہے۔ اسی طرح آسیب کا توڑ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کوئی نہ کوئی وسیلہ آدمی کی صورت میں بنایا ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر پرچی پر کچھ لکھتے ہوئے کچھ توقف کے بعد پھر بولا۔ ''میں نے کچھ دوائیاں لکھ دی ہیں۔'' اس نے پرچی جانی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو چند دن اور آنے کی زحمت ہو گی۔''

''آپ کی دوائیں میرے سینے کی جلن اور دل کا درد تو ختم کر دیں گی۔'' جانی نے پرچی کو کر تہہ کرتے ہوئے اسے جیب میں ڈال لیا تھا۔ ''لیکن میرے اندر جو خوف بیٹھ گیا ہے۔ اس کا کیا بنے گا؟''

''دیکھیں جی ہم تو سائنس کی رو سے آپ کا علاج کرتے ہیں۔'' ڈاکٹر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو روحانی علاج کی ضرورت ہے۔ کسی پیر کامل سے ملنا پڑے گا۔''

''آج کل تو مرید کامل نہیں ملتے۔ پیر کامل تو نایاب ہیں۔'' جانی اسے ایک بار پھر پٹڑی پر لا رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ڈاکٹر کے دماغ کا انجن ایک مرتبہ اس کی بچھائی ہوئی پٹڑی پر چل پڑے۔ پھر کسی بھی لال بتی پر رکنے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ کیونکہ لڑکی نے بھی اسے کسی عامل کا خاص مرید ثابت کیا تھا۔

''میرے ایک جاننے والے ہیں۔'' بالآخر وہی ہوا جو وہ چاہتا تھا۔ ڈاکٹر اس کی بچھائی ہوئی پٹڑی پر اپنے لالچی اور طمع زدہ دماغ کے ساتھ اپنے دل کے انجن کو لے کر چڑھ گیا تھا۔ ''میں ان سے بات کروں گا۔ امید ہے کہ بات بن جائے گی، لیکن ان سے وقت ذرا مشکل سے ہی ملتا ہے، لیکن آپ میرے ''مریض'' ہیں تو آپ کے لیے کوشش ضرور کروں گا۔'' ڈاکٹر جانی کو اور جانی ڈاکٹر کو اپنے اپنے ذہن کے مطابق شیشے میں اتار چکے تھے۔ جانی نے اٹھتے

ہوئے ہاتھ ملایا اور اگلے دن آنے کا وعدہ کر کے کلینک سے باہر نکل آیا۔

☆======☆======☆

''بڑا نورانی پتھر'' چھوٹے چھوٹے نورانی پتھروں کے سامنے حضور اقدس معطر ومطہر حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری پیاری میٹھی میٹھی صفات بیان کیا کرتا تھا۔ جبلِ نور کا یہ بے زبان کنبہ جو کہ بظاہر تو انسانوں کے لیے بے زبان ہی تھا۔ مگر اپنی زبان میں اپنے انداز سے اپنے اطوار سے غرض کہ جس طرح بھی ممکن تھا نبی آخر الزمان، شافع محشر، پیارے آقا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت اور محبت کا جذبہ رکھتا تھا۔ وہ مدینہ شریف کی طرف سے آنے والی بھینی بھینی خوشبو کو معطر ومطہر و پاکیزہ ہوا کو اپنے بے جان وجود سے ٹکراتے ہوئے محسوس کرتے تھے۔ ایسا لمحہ ان کے لیے ایسا ہی تھا۔ جیسے کسی قریب المرگ مریض کو ڈاکٹر وقتِ آخری زندگی کی نوید سنا دے۔ وہ اپنے طور پر اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کے لیے ہر روز آدھی رات کے بعد آقائے نامدار تاجدارِ مدینہ کی محفل سجایا کرتے تھے۔

ایک چھوٹا نورانی بڑی عقیدت اور محبت سے آقائے مدینہ پر گلہائے عقیدت نچھاور کیا کرتا تھا۔ کیونکہ پیارے آقا تاجدارِ مدینہ پر نعت ہمیشہ سے پڑھی آ رہی ہے اور ان کی مدح سرائی میں فرشتے تو فرشتے، اللہ تعالیٰ خود بھی ہدیہ عقیدت پیش کرتا ہے۔ یہ انسان ہی ہے جو ان کو اپنے طور پر کئی طریقوں سے عقیدت واحترام اور محبت کے ساتھ ساتھ کئی فرقوں اور مسلکوں میں بانٹ رہا ہے۔ یہ سراسر غلطی اور گناہِ کبیرہ ہے کیونکہ ایک عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم بیان کرتے ہیں:

''وہ شخص اللہ کو نہیں مانتا جو اللہ کا حکم نہیں مانتا۔ کیونکہ اللہ کا دعویٰ ہے کہ 'وما ارسلنک الا رحمتہ للعلمین'' ترجمہ: (اس نے اپنے حبیب کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے)۔ اس دعوی کو یاد رکھنا چاہئے۔ اگر کبھی یوم محشر اپنے اعمال کی کمی کی وجہ سے جلالت اور خوفِ کبریا سے لرزہ طاری ہو تو یہ ضرور یاد رکھیں کہ حبیب کبریاؐ کا نام ہی وسیلہ بخشش اور رحمت ہوگا۔ کیونکہ عاقبت خیر والوں کے ساتھ ہے اور اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے والے دوزخ میں نہیں جا سکتے۔ عشق الٰہی دراصل عشق محبوب الٰہی ہے۔ کیونکہ اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی محبت عطا کرتے ہیں اور اللہ اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت عطا کرتا ہے۔ اگر اللہ کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ بس صرف اللہ ہی ہوتا۔ اگر صرف اللہ ہی ہوتا تو کیا ہوتا؟ حاصل یہ کہ ہمیں اللہ اور اللہ کے حبیب صلی اللہ

علیہ وسلم کے مقام پر بحث نہیں کرنی چاہئے۔ کیونکہ اللہ کا مقام اللہ کا حبیب جانے اور حبیب اللہ کا مقام اللہ جانے۔''

چھوٹے نورانی نے بڑی خوش الحانی سے اپنی نعت ختم کی تو تمام نورانی پتھر درود وسلام پڑھنے میں مشغول ہو گئے۔ یہ سلسلہ نہ جانے کب سے شروع ہوا تھا، لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ سلسلہ تا قیامت چلتا رہے گا۔ کیونکہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم رحمتہ للعلمین ہیں اور تا قیامت تمام جہانوں کے لیے رحمت ہی رہیں گے۔ جس طرح کلام الٰہی (قرآن مجید) اللہ رب العزت کی مکمل اور جامع کتاب ہے۔ اس میں کسی بھی چیز کا اضافہ نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی کسی چیز کو نکالا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کتاب میں لفظ اللہ کا اضافہ بھی ناممکن ہے اور لفظ شیطان کو نکالنا بھی ناممکن ہے۔ لہٰذا نتیجہ یہ ہوا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رحمت ہی رحمت ہیں۔ کیونکہ یہ اللہ کا فرمان ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدس سے جڑے ہوئے اس عظیم لقب کو جدا نہیں کیا جا سکتا۔

بڑا نورانی محو مدح سرا تھا اور تمام نورانی پیارے آقاؐ اور رب ذوالجلال کی پیاری پیاری باتیں سن کر سر دھن رہے تھے۔

☆======☆======☆

ماں جی اس وقت حاجی عبداللہ کی عظیم الشان کوٹھی کے کچن میں موجود تھیں۔ وہ اس کوٹھی میں ایک فرد کی حیثیت اختیار کر چکی تھیں۔ ماں جی کے ہاتھوں میں عجیب سی لذت تھی۔ ایک بار جو بھی ان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھا لیتا تھا۔ بس انہی کے گن گاتا تھا۔ گھر کا ہر فرد خواہ وہ چھوٹا تھا یا بڑا وہ ماں جی کا احترام کرتا تھا۔ حتیٰ کہ حاجی عبداللہ بھی ماں جی کو ''آپاں'' کہہ کر بلاتے تھے اور نسرین بیگم وہ تو ماں جی کو سر آنکھوں پر بٹھاتی تھیں۔ کیونکہ ماں جی نے ان کے گھر کو سنبھال کر بیگم صاحبہ کو روز روز کے پکوان سے نجات دلا دی تھی اور دوسری بات یہ کہ یہ گھرانہ بھی بخاری بابا کا مرید تھا۔ وہ تمام لوگ شاہ جی پر ہر لمحہ جان چھڑکنے پر تیار رہتے تھے، لیکن وہ جانتے تھے کہ شاہ جی ایک نفیس طبیعت کے مالک ہیں۔ وہ اپنے مریدوں کو خواہ مخواہ بھی تکلیف نہ دیتے تھے۔ حاجی عبداللہ کا بھی ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے بڑی فرمانبردار اولاد دی تھی حاجی صاحب کو، وہ اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتے تھے۔

کوٹھی کے گیٹ پر ہر لمحہ دو تین پولیس والے چوکنے انداز میں کھڑے رہتے تھے۔ کیونکہ حاجی عبداللہ حکومتی ایم این اے تھے۔ وہ بہت با اصول آدمی تھے۔ لوگ ان کی عزت

کرتے تھے۔ وہ بھی عزت کروانا جانتے تھے۔ تبھی تو وہ بھی اپنے حلقہ میں بلکہ تمام ملنے والوں سے انتہائی خلوص اور محبت سے ملتے تھے۔ ان کی سیٹ کی معیاد ختم ہو رہی تھی اور حاجی عبداللہ عوام کے پُر زور اصرار پر اگلا الیکشن بھی لڑنا چاہتے تھے۔ اس وقت وہ اپنے گھر پر موجود اپنی فیملی کے ساتھ کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ ماں جی کھانا ٹیبل پر سجا کر خود ایک طرف کھڑے ہو کر تمام افراد کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جو بڑے انہماک سے کھانا کھا رہے تھے۔

''آہاں جی کیا بات ہے؟'' حاجی عبداللہ ماں جی سے مخاطب ہوئے۔ ''آپ بڑی خاموش ہیں۔''

''بس حاجی صاحب! غفران کی وجہ سے پریشان ہوں۔'' ماں جی دل کی بات زبان پر لے آئیں۔

''کیا پریشانی ہے؟'' حاجی عبداللہ کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ اب وہ ہمہ تن ماں جی کی طرف متوجہ تھے۔

''وہ جی.....'' وہ کچھ توقف کر کے بولی۔ ''شیخ عمر حیات کے ساتھ کام کرتا ہے اور مجھے وہ بندہ ٹھیک نہیں لگتا۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس کی کرنی میرے پتر کو نہ بھرنی پڑے۔''

''ہر بندہ اپنی اپنی طبیعت کے مطابق کام کرتا ہے۔ جیسا تمہارا بیٹا ہے۔ قدرت نے اسے ویسا ہی کام دے رکھا ہے۔'' حاجی عبداللہ نے ماں جی کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''اگر وہ دو چار جماعتیں پڑھا ہوتا تو میں کہیں بلدیہ میں ہی لگوا دیتا۔ مجھے تو ہر روز اس کے دنگے فساد کی خبریں ملتی رہتی ہیں۔ بہر حال پھر بھی آپ گھبرائیں نہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت ہوئی تو ضرور بتائیں۔'' کھانا کھانے کے بعد حاجی صاحب باہر کی جانب نکل گئے۔ جبکہ نسرین بیگم ''جویریہ'' اور ''عاصم'' نے اپنا کھانا کھانے کا پروگرام جاری رکھا تھا۔

☆======☆======☆

''اس سفید پاؤڈر کو میں ہر گھر کے نوجوان میں منتقل ہوتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔'' شیخ عمر حیات اس وقت یونیورسٹی کے غنڈہ ٹائپ سٹوڈنٹ کو سمجھا رہا تھا۔ جو اس کا خصوصی آلہ کار تھا۔ ''کسی بھی قسم کی کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟''

''نہیں سر!'' سٹوڈنٹ نے مختصر سا جواب دیا تو اس کے دوسرے ساتھی نے اٹھ کر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا، لیکن پہلے والے سٹوڈنٹ نے اسے آنکھ کے اشارے سے ہی سمجھا دیا تھا کہ وہ خاموش رہے۔ مگر اس کی یہ حرکت شیخ عمر حیات سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' شیخ عمر حیات اس لڑکے سے مخاطب ہوا۔ ''تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟''

''سر! میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ آج کل پرنسپل صاحب نے بہت سختی کی ہوئی ہے۔'' وہ ڈرتے ہوئے انداز میں بول رہا تھا۔ کیونکہ شیخ عمر حیات کس بلا کا نام ہے، وہ جانتا تھا۔ ''اس وجہ سے تھوڑی سی پریشانی ہو رہی ہے۔'' بالآخر اس نے اپنی بات مکمل کر دی۔

شیخ صاحب کی پیشانی پر بل پڑ گئے تھے، لیکن کچھ ہی دیر بعد اس نے اپنے آپ کو نارمل کر لیا تھا۔ وہ اس وقت اپنے خفیہ تہہ خانہ میں موجود تھا۔ جس میں ایک کلاس روم کی طرح کافی تعداد میں کرسیاں رکھی ہوئی تھیں اور ایک بڑی کرسی پر شیخ عمر حیات براجمان تھا۔ جبکہ غفران اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ اس طرح لگ رہا تھا کہ شیخ صاحب ایک پروفیسر ہیں اور باقی تمام لڑکے اس کے سٹوڈنٹ ہیں۔ بات تو ٹھیک تھی۔ سٹوڈنٹ تو وہ تھے ہی، لیکن شیخ پروفیسر نہ تھا۔ اس تہہ خانہ سے غفران کے ذریعے تمام سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہیروئن جیسا مہلک زہر پھیلایا جاتا تھا۔ یہ وہ تمام سٹوڈنٹ تھے جو شیخ کے خاص کارندے تھے۔ اپنی اپنی جگہ پر ہر کارندہ چوکنا اور مستعد تھا۔ شہر بھر کی مختلف درسگاہوں میں یہ زہر سرِ عام فروخت ہوتا تھا۔ شہر کے تمام تھانوں میں ''مٹھائی اور چائے'' کے نام پر ماہانہ رقوم پہنچا دی جاتی تھیں۔ اگر کوئی کارندہ پکڑا بھی جاتا تو وہ دس پندرہ منٹ بعد ہی رہا ہو جاتا تھا۔ کیونکہ پولیس محض کارروائی کے لیے درخواست گزار کی تسلی کر دیتی تھی۔ وہ شیخ صاحب کے ''اعلیٰ تعلقات'' سے بخوبی واقف تھے۔ ان سب کو سپلائی غفران نے ہی کرنا ہوتی تھی۔ شیخ عمر حیات مہینہ میں صرف ایک بار ان کے ساتھ میٹنگ کیا کرتا تھا۔ دوسرے ملکوں کو زہر بھیجنا تو اس کا معمول تھا ہی، لیکن اپنے ملک کے ہر نوجوان کی رگ رگ میں بھی وہ خون کی جگہ اس زہر کو دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ہر کسی کو اپنا محکوم دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ لوگ اس کی چوکھٹ پر کتا بن کر بھونکیں۔ اس کے تلوے چاٹیں۔ وہ ان تمام بے حس لوگوں کا حاکم بننا چاہتا تھا اور اپنی کوشش میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی تھا۔

ان تمام لوگوں سے رقم کی وصولی سے لے کر ''مال'' کی سپلائی تک تمام کام غفران کو کرنا ہوتا تھا۔ جو وہ بخوبی کر رہا تھا۔ کتنی زندگیاں، کتنے گھر اجڑ گئے تھے۔ کوئی حساب کرنے والا نہ تھا۔ کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ محافظ ہی لیٹرے تھے۔ انسان درندے بن گئے تھے۔

''تم کسی بھی پرنسپل کی فکر نہ کرو۔'' شیخ عمر حیات نے اس سٹوڈنٹ کو بیٹھنے کا اشارہ

کیا۔ ''یہ کام مجھے مت بتایا کرو۔ ایسے کام غفران کرتا رہتا ہے۔ پہلے بھی کئی پرنسپلز کے ایکسیڈنٹ ہو چکے ہیں۔ ایک اور سہی۔'' اس کے چہرے پر خباثت مزید بڑھ گئی تھی۔

ابھی یہ باتیں جاری تھیں کہ شیخ صاحب کے موبائل پر گھنٹی بجنا شروع ہو گئی۔ اس نے نمبر دیکھا تو گھر سے کال کیا جا رہا تھا۔

''ڈیڈی فوراً گھر پہنچیں بابا جی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔'' دوسری طرف سے احمد باؤ کی آواز تھی۔

''غفران، یہ تمام حساب کتاب سیٹ کر کے کوٹھی پہنچ جانا۔'' شیخ عمر حیات نے بابا جی کا سن کر فوراً ہی سارا کام غفران کے ذمہ ڈال دیا تھا۔ ''مجھے گھر پر بابا جی نے بلوایا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ باہر جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

غفران کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ ایک تو یہ خبیث لوگوں کے گھر اجاڑ رہا تھا۔ دوسری طرف نام نہاد بابا جی کا چیلا بنا ہوا تھا۔ دیکھنا شیخ عمر حیات ایک دن یہ بابا ہی تمہاری تباہی کا سبب بنے گا۔ غفران نے ذہن میں سوچا۔ وہ تمام لڑکوں سے رقوم لے رہا تھا، لیکن اس کا ذہن بابا جی میں الجھا ہوا تھا۔

☆======☆======☆

شیخ عمر حیات کوٹھی میں داخل ہوا تو ملازم نے بتایا کہ بابا جی اپنے خاص کمرے میں ہیں جو شیخ صاحب نے بابا جی کے کہنے پر مخصوص کروا دیا تھا۔ اس کمرے میں ٹی وی، فریج، وڈیو، کمپیوٹر سسٹم اور دیگر ضروریاتِ زندگی مہیا کر دی گئی تھیں۔ جو بابا جی کی فرمائش تھیں۔

شیخ صاحب نے فخر سے اپنی بیٹی کو دیکھا جو بابا جی کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔ احمد باؤ پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ جبکہ عالیہ بیگم کچن میں بہ نفسِ نفیس موجود تھی۔ حالانکہ اس کو کچن اور دوسرے کاموں سے نفرت تھی۔ مگر ''جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے'' بابا جی نے اپنے کلام سے اس گھرانے کو اچھا خاصا طابع بنا لیا تھا۔

شیخ عمر حیات دبے پاؤں ''آستانے'' میں داخل ہوئے تو بابا جی کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر شیخ صاحب کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے بابا جی کو یہ کہتے سنا کہ ''آیئے شیخ صاحب۔'' بابا جی کی اس کرامت پر شیخ جیسا گھاگ انسان بھی مزید گرویدہ ہو گیا۔

اس نے بابا جی کے قدموں میں جھک کر انہیں سلام کیا اور کتنی ہی دیر ان کے قدموں میں اپنے سر کو جھکائے رکھا۔ بابا جی نے خاص شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو شیخ نے بھی سر اٹھا لیا۔

''حکم کیجیے سرکار!'' شیخ عمر حیات کے لہجے کی عاجزی دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ایک ظالم، عیار اور مکار شخص ہے۔ اس نے کئی گھرانوں کے چراغ گل کر دیے ہیں۔ بس اس کے چہرے پر تو اس وقت معصومیت اور بیچارگی نظر آ رہی تھی۔

انسان نے اپنے چہرے پر کئی نقاب چڑھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ماحول اور موقع کی مناسبت سے وہ چہرے پر نقاب بدلتا رہتا ہے اور اپنا کام نکالتا ہے۔ یہی حال شیخ کا تھا۔ وہ اس وقت لاچار اور بے چارا نظر آ رہا تھا، لیکن بظاہر بے چارا نظر آنے والا شیخ ایک خطرناک اسمگلر تھا۔

''ہمارے اس طرح تمہارے گھر میں چلے آنے سے تمہیں تکلیف تو کافی ہو گی۔'' بابا جی نے اپنا پہلا پتہ پھینکا۔ ''کیونکہ ہمارے مریدین کی خصوصی طور پر آمد تمہاری فیملی کے لیے زحمت ہو گی۔''

''آپ نے تو مجھے شرمندہ کر دیا ہے بابا جی۔'' شیخ عمر حیات کے انداز میں مزید بے چارگی در آئی تھی۔ ''یہ گھر تو آپ ہی کا ہے۔ اس طرح غیریت برتیں گے تو میں کہیں کا نہ رہوں گا۔'' شیخ نے اپنا سر ایک بار پھر بابا جی کے قدموں میں ڈال دیا تھا۔

بابا جی نے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ ساتھ ہی ساتھ کہتے بھی جا رہے تھے۔ ''اللہ تمہیں بہت دے گا۔ تم میرے مرید ہو۔ کوئی غلط چیز تمہیں چھو بھی نہ سکے گی۔''

بابا جی نے شیخ کو کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے سامنے خاموش بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود منہ میں کچھ پڑھنے لگا۔ بابا جو کہ خود ایک فراڈ تھا۔ ''کالے علم'' کے دس بارہ حرف جانتا تھا۔ جس سے انسان کو اپنے قابو میں کیا جا سکتا تھا۔ اب وہ وہی علم پڑھ کر شیخ عمر حیات پر پھونک رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ گھر کے تینوں افراد پر اپنا اثر جما چکا تھا۔ اس پھونک نے شیخ کی دنیا ہی بدل دی تھی۔ وہ دل کی گہرائیوں سے بابا جی کا ''مطیع'' ہو گیا تھا۔

''شیخ صاحب! کوئی بھی بات دل میں نہ رکھنا۔ بلکہ اپنے دل کو آئینے کی طرح صاف شفاف رکھنا۔'' بابا جی نے اندھیرے میں تیر چلانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تم اس مرتبہ پھر الیکشن لڑنا چاہتے ہو، پچھلے الیکشن میں تو حکومتی دھاندلی نے حاجی عبداللہ کا ساتھ دیا تھا، لیکن اب میرا ساتھ تمہارے لیے فتح اور کامیابی کی نوید بن جائے گا۔''

بابا جی کا اندھیرے میں پھینکا ہوا تیر ٹھیک نشانے پر جا لگا۔ شیخ، بابا جی کی اس چال کے آگے اپنا سب کچھ ہار گیا تھا۔ وہ اس بات کا گرویدہ ہو گیا تھا کہ بابا جی کو تمام حالات کا

علم ہو چکا ہے اور آگے کیا ہوگا وہ سب جانتے ہیں۔ پس شیخ بابا جی کے جال میں پوری طرح پھنس چکا تھا۔ ملیحہ اور احمد باؤ بھی باپ سے مختلف خیالات نہ رکھتے تھے۔ وہ بھی جانتے تھے کہ شیخ صاحب گزشتہ شکست کا بدلہ حاجی عبداللہ سے لینا چاہتے ہیں، لیکن کوئی بھی ترکیب کارآمد نہ ہو رہی تھی۔ اب بابا جی کی مدد اور ساتھ یقیناً ان کے والد کے لیے فتح اور کامیابیوں کی نوید ہوگی۔ کیونکہ وہ جان گئے تھے کہ بابا جی بہت ''پہنچ'' والے ہیں۔

☆======☆======☆

''گریٹ جناح بوائز ہائی سکول'' کی پُرشکوہ عمارت کے گیٹ سے اس وقت بچے باہر نکل رہے تھے۔ انہوں نے ہلہ گلہ مچا رکھا تھا۔ کیونکہ چھٹی ہو گئی تھی۔ بچے اپنے اپنے گھروں کو جانے کے لیے مچل مچل کر گیٹ سے باہر آ رہے تھے۔ کئی والدین اپنے بچوں کو لینے کے لیے گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں پر آئے ہوئے تھے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد ہی تمام کلاسز خالی ہو گئی تھیں۔ اب باری باری تمام ٹیچرز بھی رخصت ہو رہی تھیں۔ اس سکول کو دو سیکشنوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک میں اول تا پنجم اور دوسرے میں ششم تا دہم کے لڑکے تعلیم حاصل کرتے تھے۔

عصمہ اس سکول کے پہلے سیکشن میں ٹیچر تھی۔ وہ لڑکوں کو اسلامیات اور انگلش کی تعلیم دیتی تھی۔ بس اسی تنخواہ سے وہ اپنا اور اپنے بھائی خالد کا پیٹ پالتی تھی۔ یہ ایک عزت دار روزگار تھا۔ خالد ایک سرکاری سکول میں چھٹی جماعت کا ہونہار طالب علم تھا۔ شاہ جی کے علاج کے بعد اس نے دوبارہ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بڑی دلجمعی سے پڑھائی میں مگن تھا۔ جبکہ رات کو وہ عصمہ سے قرآن کریم کی تعلیم بھی حاصل کر رہا تھا۔ اس کا سکول گھر کے پاس ہی تھا۔ جبکہ عصمہ کو ایک دو بازار کراس کرنے پڑتے تھے۔ خالد خود ہی گھر پہنچ جاتا تھا۔ اس کے آنے تک عصمہ نے کھانا تیار کر کے رکھا ہوتا تھا۔ وہ دونوں بہن بھائی اکٹھے کھانا کھاتے تھے۔ پھر کچھ دیر آرام کے بعد خالد ٹیوشن پڑھتا اور بعد میں تھوڑا وقت کھیل کود میں گزار کر واپس گھر کو آ جاتا۔ اسی طرح شب و روز گزر رہے تھے۔ ڈھائی مرلہ کا ڈبل سٹوری مکان تھا۔ جو والدین کی وفات کے بعد ان دونوں بہن بھائیوں کی کل وراثت تھا۔

عصمہ نے بھی دوسری ٹیچرز کی طرح اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا اور گیٹ سے باہر نکل گئی۔ کچھ دنوں سے عصمہ کے ساتھ عجیب سا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ وہ جونہی سکول سے گھر جانے کے لیے نکلتی۔ ایک موٹر بائیک پر نوجوان اس کا پیچھا کرنا شروع کر دیتا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی رہتی۔ جبکہ موٹر سائیکل والا بھی کبھی آگے کبھی پیچھے چلتا رہتا۔ اس لڑکے نے کبھی بھی

عصمہ کو مخاطب نہ کیا تھا۔ عصمہ نے بھی کبھی نظریں اٹھا کر اسے نہ دیکھا تھا۔ بس وہ کنکھیوں سے ہی دیکھتی تھی کہ وہ لڑکا اس کے آگے پیچھے چکر لگاتا ہے۔ وہ نیک اور وضع دار لڑکی تھی۔ پردہ کی پابند اور اب بھی وہ نقاب کئے ہوئے تھی۔

ابھی وہ سکول کے گیٹ سے باہر ہی نکلی تھی کہ اس نے موٹر سائیکل کی مخصوص آواز سنی۔ وہ سمجھ گئی کہ وہی لڑکا ہوگا۔ وہ اب اس کے گھر تک جائے گا۔ عصمہ کو بہت خوف آتا تھا۔ اگر کسی محلّہ دار کو علم ہو جائے تو کتنی بدنامی ہوگی۔ وہ تمام محلّہ میں ایک اچھی اور باکردار لڑکی سمجھی جاتی تھی۔ محلّہ کی کئی لڑکیاں اس کے پاس قرآن مجید کی تعلیم کے لیے آتی تھیں۔

وہ اس لڑکے کی وجہ سے بدنام نہ ہونا چاہتی تھی۔ وہ اس سے صاف صاف کہہ دینا چاہتی تھی کہ وہ اس کا پیچھا چھوڑ دے۔ کیوں اسے بدنام کرنے پر تلا ہوا ہے؟ لیکن اس کی طرف سے ابھی تک کوئی ایسا اشارہ نہ ملا تھا کہ جس سے وہ سمجھتی کہ واقعی اس کے لیے آتا ہے۔ یا پھر اس نے کبھی بھی ظاہر نہ کیا تھا کہ وہ عصمہ کو بدنام کرنا چاہتا ہے۔ یہ عصمہ کی اپنی سوچ تھی اور سوچ پر پابندی تو نہیں لگائی جا سکتی تھی۔

''اَن دیکھے حسن کو محبت بھرا سلام'' لڑکے نے موٹر سائیکل اس کے بالکل ساتھ کرتے ہوئے کہا اور آگے نکل گیا، لیکن اسی لمحہ عصمہ کی آنکھیں اس کی آنکھوں سے چار ہو چکی تھیں۔ دل دھڑک کر سینے سے باہر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''یہ کیا کہہ گیا تھا؟''

''اسے زبان کیسے مل گئی؟''

اس نے تو پچھلے ایک ماہ سے کبھی بھی عصمہ سے کوئی بات نہ کی تھی۔ مگر آج اس کی جرأت اور کمال پھرتی نے عصمہ کو ٹھہر جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ سارے شکوک و شبہات دور ہو گئے تھے۔ وہ اسی کے لیے آتا تھا۔ تبھی تو اس نے یہ فقرہ کہا تھا۔ کیونکہ اس نے کبھی بھی عصمہ کو بے نقاب نہ دیکھا تھا۔ آج اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ہوگا۔ جبھی تو وہ اپنے دل اور اپنی زبان پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس کا ضبط جواب دے گیا۔ اس نے یونہی نہیں کہا تھا۔

''اَن دیکھے حسن کو محبت بھرا اسلام۔'' واقعی وہ اگر عصمہ کو دیکھ لیتا تو یقیناً وہیں اس کے قدموں پر ہی گر پڑتا۔ اس نے اس کی چال اور پتلی کمر اور جھیل سی گہری آنکھیں ہی دیکھی تھیں۔ وہ اس کا دیوانہ لگتا تھا۔ عصمہ انہی سوچوں میں مگن گھر پہنچی تو ایک اور آفت اس کی منتظر تھی۔

اس نے جونہی گھر میں قدم رکھا تو خالد ایک گلدستہ پکڑے دروازے کی طرف ہی

دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہ اسی کا منتظر ہو۔ اس نے آپی کو اندر آتے ہی وہ گلدستہ پکڑا دیا اور ساتھ میں ایک کاغذ بھی جو تہہ کیا ہوا تھا۔

"یہ کہاں سے لائے ہو؟" عصمہ نے گلدستہ اور کاغذ خالد کے ہاتھوں سے لیتے ہوئے پوچھا۔

"مجھ سے کیا پوچھ رہی ہیں؟" خالد نے اپنی سمجھ اور معصومیت سے جواب دیا۔ "یہ تو وہ موٹر سائیکل والا دے کر گیا ہے۔ اس نے کہا کہ اس کی بھتیجی تمہاری آپا کے پاس پڑھتی ہے اور وہ اس بار اس کی کوششوں سے فرسٹ پوزیشن لے سکی ہے۔ بس اسی خوشی میں وہ شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔"

خالد یہ کہہ کر باہر نکلنے لگا تو عصمہ نے آواز دی کہ وہ کھانا تو کھا لے۔

"مجھے بھوک نہیں ہے۔ رات کو ہی اکٹھا کھا لیں گے۔" یہ کہہ کر خالد باہر نکل گیا۔

"اس کی اتنی جرأت ہو گئی ہے کہ وہ میرے گھر پھول بھیجے۔" عصمہ نے گلدستے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔

"میں کیوں رکھوں اسے؟ میں باہر پھینک دوں گی۔ وہ سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو؟ اور تو اور یہ کاغذ بھی۔ نہ جانے کیا الا بلا لکھی ہو گی اس میں؟"

اس نے پھول اٹھا کر سامنے دیوار پر دے مارنے چاہے، لیکن یہ کیا؟ وہ ایسا نہ کر سکی تھی۔ پھول اس کے ہاتھ میں تھے۔ وہ بھلا ان کو کیوں پھینکے۔ ان سے تو پیار کیا جاتا ہے۔ محبت کی جاتی ہے۔ عقیدت کی جاتی ہے۔ نفرت ہی کرنی ہے تو اس کے بھیجنے والے سے کرنی ہو گی۔ پھولوں کا کیا قصور؟

وہ عجیب شش و پنج میں مبتلا ہو گئی تھی۔ وہ کبھی کاغذ کو دیکھتی جو تہہ شدہ تھا اور ابھی تک اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ اس نے غور سے کاغذ کو دیکھا تو وہ ایک بچھو کی صورت میں اس کے ہاتھ پر رینگنے لگا۔ اس نے تڑپ کر اسے دور پھینک دیا۔ مگر یہ کیا وہ زمین پر پڑا ہوا اسے ایک ایسا پھول نظر آ رہا تھا جس کی ہر ایک پنکھڑی اسے اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔ اس نے ارد گرد ڈری اور سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ کوئی اس کی ان حرکات کو دیکھ تو نہیں رہا؟

اس نے فوراً جا کر باہر والا دروازہ بند کر دیا۔ اب وہ گھر میں اکیلی تھی۔ کاغذ اور پھول اس کے منتظر تھے۔ اسے چاروں طرف ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس لڑکے کی آنکھیں اسے دیکھ رہی ہوں۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کاغذ اٹھایا، اور کھولنا شروع کیا۔ لرزتے ہاتھوں اور کانپتے دل کے ساتھ کاغذ کھل کر اس کے سامنے تھا۔

"ان دیکھے حسن کو محبت بھرا سلام"

"اس گستاخی اور غلطی کی معافی چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میری یہ حرکت آپ کو ناگوار ضرور گزری ہو گی، لیکن میری مجبوری کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس پہلی غلطی کو ضرور معاف کر دیں۔ کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا اور آپ کو متوجہ کرنے کا کوئی بہانہ بھی نہ تھا۔ میرے پھول اگر کل باہر پڑے ہوئے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی بھی آپ کو پریشان نہ کروں گا۔ اگر پھول مجھے باہر پڑے ہوئے نہ ملے تو......

تیرا ساتھ ہو جو کبھی چاندنی رات میں
پھر کیوں نہ بکھریں جلوے اس کائنات میں

شب و روز عروج ملے تجھے اس دور میں
کہ ذکر تیرا ہی ہو زمانے کی ہر بات میں

تیرا ساتھ ہو نہ گھبراؤں گردشِ دوراں سے
کہ پوشیدہ ہو جیت میری، ہر مات میں

بکھری زلفیں جو تیری دیکھیں تو خیال آیا
چاند پہ قابض ہو ناگن جیسے سیاہ رات میں

محفل کیوں جھوم اٹھی تُو نے سوچا ہی نہیں
تیری بات چھڑ گئی تھی بات ہی بات میں

بہک جائیں فرشتے بھی جو حسن تیرا دیکھ لیں
خدا کی تو رکھتا تیری ذات میں

سنا ہے بہت مہربان صیاد ہے تُو
یہی دیکھنے آن پھنسے ہیں تیری گھات میں

"ان دیکھے حسن کی خدمت میں میرا محبت بھرا سلام"

فقط

"ان دیکھے حسن کا ایک منتظر"

☆======☆======☆

"میں بات کر چکا ہوں۔ آپ آج شام ہی ان سے مل سکتے ہیں۔" ڈاکٹر شارق نے جانی سے کہا۔ وہ اس وقت اس کے کلینک میں موجود تھا۔ تیسری مرتبہ آنے پر ڈاکٹر شارق نے "پلہ" پکڑایا تھا۔ وہ بھی بڑا کایاں تھا۔ جانی نے اپنی کروڑوں کی جائیداد بتائی تھی۔ غفران کی طرف سے اسے فل ہینڈ فری مل گیا تھا۔ وہ باباجی کی اصلیت معلوم کرنے کے لیے تہہ خانہ میں پڑی ہوئی دولت میں سے بہت کچھ خرچ کر سکتا تھا۔ ویسے بھی ایسی کمائی کون سی گن کر رکھی جاتی ہے۔ جانی نے کئی مرتبہ خواہ مخواہ ہی جیب سے دوائیوں والی پرچی نکالنے کے لیے ہاتھ مارا تو کافی سارے نوٹ اس پرچی کے ساتھ ہی باہر آ جاتے تھے۔ جو ڈاکٹر شارق کو پھنسانے کے لیے کافی تھے۔ پھر بھی اس نے جانی کے متعلق تسلی کرنے کے لیے دو چار آدمی پیچھے بھیجے، لیکن نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ کیونکہ علم ہونے پر جانی ان کو غچہ دے کر نکل جاتا تھا۔

اب ڈاکٹر شارق نے اس کے دل کی بات کہہ دی تھی۔ وہ آج شام ہی باباجی سے ملنا چاہتا تھا کیونکہ بقول ڈاکٹر، اس نے باباجی سے بہت مشکل سے وقت لیا ہوا ہے۔ اس کے لیے اسے شیخ عمر حیات کی کوٹھی پر جانا تھا۔ جانی اور غفران کی ملاقات کو تقریباً دس روز ہو گئے تھے۔ اب وہ کچھ نہ کچھ کرنے کے بعد ہی غفران سے ملنا چاہتا تھا، لیکن اس کی ملاقات جلد ہی اس سے ہونے والی تھی۔ وہ ڈاکٹر کا شکریہ ادا کرتے کے بعد اس کے کلینک سے نکلا اور بظاہر ڈاکٹر کے سمجھائے ہوئے ایڈریس پر جانے کے لیے چند قدم پیدل چلتا رہا۔ اپنی گاڑی تو اس کے پاس تھی نہیں۔ اگر وہ وہیں سے ٹیکسی میں بیٹھتا تو ڈاکٹر کو شک ہو جاتا تھا۔ وہ کسی بھی بات کا رسک نہ لینا چاہتا تھا۔ چوک میں آ کر وہ گاڑیوں کی پارکنگ کی طرف بڑھ گیا۔ وہ احتیاط برت رہا تھا کہ اگر کہیں سے بھی ڈاکٹر کے جاسوس اسے چیک کر رہے ہوں تو انہیں یہی معلوم ہو کہ وہ پارکنگ ایریا سے اپنی گاڑی لینے جا رہا ہے۔

لیکن وہ سڑک کراس کر کے دوسری طرف سے آنے والی ٹیکسی میں اس پھرتی سے بیٹھا کہ وہ ڈرائیور کے ساتھ ساتھ خود بھی حیران رہ گیا۔

ڈاکٹر شارق نے باباجی سے تمام بات کر لی تھی۔ باباجی بھی شیخ کی کوٹھی کے لان میں کرسی پر بیٹھے ہوئے نئی آسامی کا انتظار کر رہے تھے۔ اسے ایک محفوظ جگہ مل گئی تھی۔ جہاں بیٹھ کر وہ اپنی "دکانداری" چمکا سکتا تھا۔ شیخ عمر حیات اور اس کی فیملی ہاتھ باندھ کر باباجی کے سامنے گھاس پر ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ جبکہ غفران پورچ میں گارڈ کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔

جانی کو گیٹ سے اندر داخل ہوتا دیکھ کر غفران حیرت و استعجاب کے سمندر میں غوطے کھانے لگا لیکن اس کی حیرت ایک بار پھر دوچند ہو گئی۔ جب جانی نے اس کی طرف دیکھ کر منہ دوسری طرف کر لیا۔ جانی جب باباجی کی طرف بڑھتا گیا تو غفران نے سکون کی سانس لی، کیونکہ وہ جانی کو سمجھ نہ سکا تھا۔ جبکہ جانی نے اس سے کوئی بھی تعلق ظاہر نہ کر کے اس پر ثابت کر دیا تھا کہ وہ ایک اچھا اور مستعد جاسوس ہے۔ جانی نے جا کر باباجی کے پاؤں پکڑ لیے۔ یہ منظر دیکھ کر غفران بھی اٹھ کر لان میں ان کے پاس چلا آیا تھا۔ شیخ عمر حیات، عالیہ بیگم، اور ملیحہ نے بھی جانی کے چہرے پر دکھ کی غمازت دیکھ لی تھی۔ احمد باؤ اس لمحہ وہاں موجود نہ تھا۔ وہ فیکٹریوں کی تعداد بڑھانے کی تگ ودو میں لگا ہوا تھا۔

جانی چالاک اور ہوشیار جاسوس تو ثابت ہو گیا تھا، لیکن اب جو غفران نے اس کی اداکاری دیکھی تو دل باغ باغ ہو گیا اور وہ جانی کی بے ساختہ ایکٹنگ پر اسے داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ منظر کچھ یوں تھا کہ جانی، باباجی کے قدموں میں پڑا زار و زار رو رہا تھا۔ جبکہ باباجی اس کی پشت تھپتھپا رہے تھے۔ جب اس کا جی ہلکا ہو گیا اور اس نے قدموں سے سر اٹھایا تو باباجی نے اسے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ بھی شیخ صاحب کی طرح دوزانو بیٹھ گیا۔ اس نے بھی ہاتھ باندھ لیے۔ باباجی اس کی طرف متوجہ تھے۔ وہ نئی آسامی آنے پر دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے۔

"میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ تم میرے پاس کس لیے آئے ہو؟" باباجی نے جانی کو مخاطب کرتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔ "لیکن اتنا ضرور پوچھوں گا کہ جس تکلیف اور پریشانی نے تمہیں یہاں آنے پر مجبور کیا ہے۔ اس کا تھوڑا سا حال تو بیان کرو۔ تاکہ میں اس کی کاٹ کر سکوں۔"

اسی اثنا میں ملازم جانی کے لیے مشروب لے کر آ گیا۔ اس نے باباجی کے اشارہ پر شربت کے گلاس کو حلق سے نیچے اتارا تو کافی سکون محسوس ہوا۔ غفران نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سوج گئی تھیں۔ وہ باباجی کے قدموں کو ہاتھ سے پکڑ کر دبانے لگا اور ساتھ ہی ساتھ اپنی تباہی کی داستان بھی شروع کر دی جو کہ غفران ہی جانتا تھا کہ یہ سراسر جھوٹی ہے، لیکن جانی کی بار بار رونے کی اداکاری نے اس جھوٹ کو حقیقت کا روپ دے دیا تھا۔ باباجی اور عالیہ بیگم تو کافی متاثر دکھائی دے رہے تھے۔ وہ کسی کردار کی ٹانگ پکڑ لیتا اور کسی کا بازو۔ اس کے گھر میں آسیب اور جنات کا بسیرا بھی تھا۔ وہ کروڑوں کا مالک ہونے کے باوجود بھی اکیلا اور تنہائی محسوس کرتا تھا۔ ملیحہ اس کہانی کے مرکزی کردار کو غور سے دیکھ

رہی تھی۔ جبکہ عمر حیات کو اس بات کا فخر ہو رہا تھا کہ اس شخص کے دکھ دور کرنے والی عظیم ہستی اس وقت اس کے غریب خانہ پر موجود تھی۔ اس طرح اس کی مزید پبلسٹی ہونے والی تھی اور وہ خود کو اگلے الیکشن میں واضح برتری سے فاتح ہوتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر شارق اور اس لڑکی کا ممنون تھا۔ جنہوں نے بابا جی جیسی عظیم شخصیت سے ان کا رابطہ کروایا تھا۔

جانی کا رونا دھونا ختم ہوا تو بابا جی نے اپنی جیب سے ایک تعویذ نکال کر جانی کی طرف بڑھایا۔

''اسے اپنی جیب میں رکھ لو۔'' انہوں نے جانی سے کہا تو اس نے وہ تعویذ ان کے ہاتھ سے لے لیا۔

''اس تعویذ کو اپنے گھر کی دہلیز پر رکھ کر سات مرتبہ اس پر جوتیاں مارنی ہیں۔''

''جی بہتر۔'' جانی نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

''اس کے بعد پھر اس تعویذ کو جلا دینا۔ پھر اس کی راکھ کسی گندی جگہ پر بہا دینا۔ ایسا کئی مرتبہ کرنا پڑے گا۔ تمام آسیب اور جنات تمہارے گھر سے دفع ہو جائیں گے۔'' بابا جی نے اپنی جیب سے سپاری نکال کر پیکٹ کھولا۔ اس میں سے آدھی شیخ عمر حیات کو بطور ''تبرک'' دی اور آدھی اپنے منہ میں ڈال لی۔ جبکہ شیخ نے بھی عقیدت سے وہ سپاری اپنے منہ میں ڈال لی تھی۔ جانی نے اپنی جیب سے نوٹوں کی گڈی نکال کر بابا جی کو نذرانے کے طور پر پیش کی تو انہوں نے شکریے کے ساتھ لوٹا دی۔

''ہمیں روپے پیسے کی طلب نہیں ہے۔ اس طرح روپیہ پیسہ لینے سے کام میں برکت نہیں رہتی۔''

جانی بھی بضد تھا۔ ''نہیں جی! یہ تو حقیر سی رقم ہے یہ کوئی کام کا ہدیہ تھوڑی ہے۔ اس کام کا تو میں احسان نہیں اتار سکتا۔ بس آپ مجھے اپنی غلامی میں لے لیں۔'' اس نے نوٹ بابا جی کو پکڑا دیئے تھے۔

''ہوں...... ہم تمہارے گھر ایک چکر لگانا چاہتے ہیں۔'' بابا جی کے منہ سے یہ الفاظ سنتے ہی جانی کے پیروں تلے سے زمین کھسکنا شروع ہو گئی تھی۔ جبکہ اسے آسمان سر پر آتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ پھر بھی اس نے اپنی دگرگوں ہوتی ہوئی حالت کو سنبھالا۔

''میں گستاخ کہاں اور میرا غریب خانہ کہاں حضور کے قابل ہے۔'' وہ ایک بار پھر مسکین بن گیا تھا۔ ''میں اس کی صفائی ستھرائی کروا دوں گا۔ پھر سرکار جب جی چاہے تشریف لے آئیں۔''

''ٹھیک ہے۔ ابھی ہمیں بھی بہت سے کام کرنے ہیں۔'' بابا جی نے اپنا ہاتھ جانی کی طرف بڑھایا تو جانی نے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ چوم لئے۔ ''اب تمہیں اجازت ہے۔''

جانی نے اٹھتے ہوئے تمام حاضرین کی طرف دیکھا تو ملیحہ سے آنکھیں چار ہو گئیں۔ جبکہ عالیہ بیگم کے کھلے ہوئے گریبان سے چھلکتی ہوئی جوانی کی ایک جھلک بھی اس نے دیکھ لی تھی اور شیخ صاحب کی بے غیرت بن کر دو زانو بیٹھے رہنے والی تصویر اس کی آنکھوں میں ٹھہر گئی تھی۔

☆======☆======☆

سکول اور کالج کی ہر سطح پر ہیروئن کا نیٹ ورک بچھانے کے بعد شیخ عمر حیات بظاہر تو مطمئن تھا، لیکن اور بہت کچھ کرنے کی خلش اس کے دل میں باقی تھی۔ نامور وزراء اور حکومتی ارکان کی توجہ خاص اور مضبوط بیک گراؤنڈ کے باوجود بھی وہ حاجی عبداللہ کو زچ نہ کر سکا تھا۔ وہ دونوں ایک ہی حلقہ سے الیکشن لڑتے تھے۔ دونوں کو سپورٹ اچھی خاص تھی، لیکن حاجی عبداللہ کے نظریاتی ووٹر بہت زیادہ تھے۔ شیخ عمر حیات اپنے حلقہ کی ناپسندیدہ ہستی تھی۔ کیونکہ وہ کبھی کسی غریب کی دادرسی کے لیے نہ پہنچا تھا۔ بلکہ وہ نفرت سے انہیں دھتکار دیتا تھا۔ جبکہ حاجی عبداللہ اس سے قطعی مختلف طبیعت کے درویش طبع آدمی تھے۔ وہ غریبوں کے دکھ سے دکھی ہو جاتے تھے اور ہر ممکن ان کی مدد کرتے تھے۔

اب بھی آئندہ الیکشن میں شیخ عمر حیات کو معلوم ہو گیا تھا کہ حاجی عبداللہ کے چاہنے والے بہت زیادہ ہیں، لیکن اس نے جو بابا جی پکڑ رکھے تھے۔ ان کی ذات پر اعتماد تھا۔

الیکشن ابھی کافی دور تھے اور ملکی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے گورنمنٹ نے اعلان کیا تھا کہ الیکشن کے لیے ابھی کوئی بھی شیڈول مقرر نہیں کیا گیا ہے۔ کوئی بھی پلاننگ طے کرنے کے بعد عوام اور امیدواران کو بذریعہ اخبار اور الیکٹرونک میڈیا الیکشن سے تین ماہ قبل مطلع کر دیا جائے گا۔

شیخ اس وقت اپنے خفیہ سٹور میں تمام ''مال'' سمیت موجود تھا۔ غفران بھی بدستور اس کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ زہریلے پوڈر کی مخصوص طریقے سے ٹراؤزرز اور اپرز میں پیکنگ ہو رہی تھی۔ شیخ نے چند ایک پیک شدہ بنڈل دیکھے اور اطمینان کا اظہار کیا۔ وہ ایک طرف بنے ہوئے کیبن میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد غفران کو بلوایا۔

''تمہارے خیال میں یہ مال کتنے روز میں سنگاپور پہنچ جائے گا؟'' شیخ نے اسے اپنے سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جبکہ تم بتا رہے ہو کہ پارٹی بھی کوئی نئی ہے۔''

کسی قسم کا رسک تو نہیں ہے؟"

"شیخ صاحب۔ یہ پارٹی میں نے نہیں پھنسائی ہے۔" غفران، شیخ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا "بلکہ آپ کے "پیر بھائی" ڈاکٹر شارق نے ان سے کوئی لمبی ڈیل کی ہے، جبکہ آپ کے بابا جی کو بھی اس بات کا علم ہو چکا ہے کہ آپ منشیات کا دھندہ بھی کرتے ہیں۔"

"ڈاکٹر شارق کو تو کافی پہلے ہی علم تھا۔" شیخ کے چہرے پر تھوڑی سی پریشانی نمایاں ہوئی تھی۔ "بابا جی کو علم نہیں ہونا چاہئے تھا۔ وہ اللہ والے ہیں۔ میرے بارے میں کیا سوچیں گے؟"

"معاف کرنا شیخ صاحب!" غفران تھوڑا سا آگے جھکتے ہوئے بولا۔ "مجھے تو یہ بابا جی بھی کوئی فراڈ ہی"......

غفران!...... اگر بابا جی کے متعلق کوئی غلط لفظ بھی زبان سے نکالا تو جانتے ہو کہ یہ زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔" شیخ عمر حیات نے غفران کی بات درمیان میں ہی کاٹ دی تھی۔ "تمہیں شرم آنی چاہئے۔" شیخ اپنے غصہ کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "ایسا توہین آمیز الزام لگاتے ہوئے تمہارا دل ذرا نہیں کانپا؟"

"آپ کو پتہ ہے شیخ صاحب کہ غفران جو کچھ دیکھتا ہے۔ وہی کچھ بولتا ہے۔" غفران بھی اپنے غصہ پر ضبط نہ رکھ سکا تھا۔ وہ آج کھل جانا چاہتا تھا، لیکن اس کی جاہلیت اور تعلیم کی کمی نے موقع اچھا نہ چنا تھا۔ ابھی اس کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ جس سے وہ ثابت کر سکتا کہ بابا جی ایک ڈھکوسلہ ہے۔ ایک فراڈ اور دھوکا ہے۔

"اپنے تجربے اور سچ کو اپنے پاس ہی رکھو۔" شیخ کا پارہ ایک بار پھر چڑھ گیا تھا۔ "روٹی کا جو ٹکڑا اپنے منہ میں ٹھونستے ہو۔ یہ سب میری بدولت ہے اور یہ سب مجھے کسی کے باپ نے نہیں دیا۔ سب کچھ ان بابا جی کے توسط سے ملا ہے۔"

"آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ یہ سب تو خدا کی عطا ہوتی ہے۔ وہ کسی کو غلط راہ کے لئے مجبور نہیں کرتا۔ اس نے بشر کے لیے دونوں ہی راستے بڑے صاف اور واضح الفاظ میں بیان کر دیئے ہیں۔ اب اچھے اور برے راستے کی تمیز بشر نے خود کرنی ہے۔" غفران کو نہ جانے کہاں سے اتنا حوصلہ آ گیا تھا کہ وہ آج نیکی کی تبلیغ کرنے لگ گیا تھا۔ مگر اس کی یہ بات شیخ عمر حیات کو انتہائی ناگوار گزر رہی تھی۔

"غفران!" وہ بڑا ضبط کر کے بولا تھا۔ "میں کہتا ہوں خاموش ہو جاؤ۔ اگر تم

تمہیں آج یہاں سے نکال دوں تو پتہ ہے کیا ہوگا۔ اس روٹی کے ایک ٹکڑے کی خاطر تمہیں کتے کی طرح دم ہلانی پڑے گی۔ در در پر جا کر، ہر ایک چوکھٹ پر جا کر اس ایک نوالے کو ترسو گے۔ پھر میں دیکھوں گا کہ یہ تمہاری اور تمہارے نیک ارادوں کی استقامت کہاں تک تمہارا ساتھ دیتی ہے؟"

"اک در بند تو سو در کھلا۔" غفران بھی اس گناہ آلود زندگی سے اکتایا ہوا لگ رہا تھا، لیکن وہ اپنی اس جرأت پر بھی حیران تھا۔ کیونکہ اس نے کبھی بھی شیخ کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات نہ کی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کوئی نادیدہ قوت اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو گئی ہے۔ اس کی زبان اس کے قابو میں نہ لگ رہی تھی۔ وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تو شیخ بھی غصہ سے لال پیلا ہو رہا تھا۔

"کتا جب مالک پر بھونکنا شروع کر دے تو اسے گولی مار دینی چاہئے۔" شیخ عمر حیات نے غفران کو یاد دلایا کہ وہ اس کا ملازم ہے اور ایک ملازم کی اوقات ایک کتے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اب اس کی موت گولی سے ہی ہوگی۔

"کتا اپنے مالک پر تبھی بھونکتا ہے جب وہ محسوس کرے کہ اس کا مالک بھی کتا بن گیا ہے۔" غفران نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ جواب کیا تھا۔ شیخ عمر حیات کی ذات پر ڈائریکٹ حملہ تھا۔ اس پر بھی وہ چپ نہ ہوا تھا۔ اس کے اندر کا لاوا ایک بار پھر ابل پڑا تھا۔ حالانکہ شیخ کے تعلقات کی نوعیت اور پہنچ سے اچھی طرح واقف تھا۔ وہ آج اپنے دل کا غبار نکال لینا چاہتا تھا۔

"خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ چھوڑ کر ایک گھٹیا اور فراڈیئے پر اعتقاد کر رہے ہو تم۔" وہ اب آپ سے تم پر آ گیا تھا۔ "یاد رکھنا شیخ جس رزق کو تم نے اللہ کی بجائے اس بابا جی کا توسط اور فضل بتایا ہے۔ ایک دن اسی رزق کے لیے گلیوں میں بھونکتے پھرو گے۔ اس کی بے آواز لاٹھی سے ڈرو، اس کے قہر سے ڈرو۔ میں نے لوگوں کے گھر اجاڑنے میں تمہارا ساتھ دیا ہے لیکن آج میں یہ ذلت کی نوکری چھوڑ کر جا رہا ہوں۔" وہ یہ کہہ کر کیبن سے باہر نکلنے کے لیے مڑا تو شیخ کی آواز نے اسے رکنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو شیخ کے ہاتھ میں پستول تھا۔ جس کا رخ ظاہر ہے کہ غفران کی طرف ہی ہونا تھا۔

"یہاں سے زندہ جانے کے لیے ایک ہی راستہ ہے غفران۔" وہ پستول غفران پر تانے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس کا چہرہ غصے کی شدت سے لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ "وہ راستہ ہے شیخ عمر حیات کی دوستی کا۔"

اس نے بات تو کہہ دی مگر غفران پستول سے ڈرنے کی بجائے قہقہے لگانے لگا۔

''شیخ صاحب! میں نے کہا تھا نا کہ کتا اپنے مالکوں پر تبھی بھونکتا ہے جب وہ محسوس کرے کہ اس کا مالک بھی کتا بن گیا ہے۔'' وہ اپنی ڈب سے ریوالور نکالتا ہوا بولا۔ ''تم تو کبھی کبھار اس جگہ پر آتے ہو۔ یہ کیبن اور تمام کارندے میرے استعمال میں رہتے ہیں۔ اس پستول میں کبھی بھی کوئی گولی نہ بھری جا سکی تھی۔ کیونکہ اس کی ضرورت اور نوبت ہی نہ آئی تھی۔'' غفران کے اس انکشاف پر شیخ کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔

''لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔'' غفران پھر بولا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے اس تمام کاروبار سے جڑی ہوئی ہر بات یہیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اس بات کا بھی وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی بھی کسی کو تمہاری ذات سے متعلق کوئی بھی بات نہ بتاؤں گا۔'' وہ کچھ دیر کے لیے رکا۔ پھر بولا۔

''اس بات کا بھی وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے اس کاروبار اور خفیہ اڈوں کے بارے میں کسی کو نہیں بتاؤں گا کیونکہ حق نمک ادا کرنے کے لیے میرے پاس اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔''

''مگر ہاں!'' وہ اب شیخ کی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ''اگر تمہاری طرف سے میری ذات پر کوئی مجرمانہ حملہ ہوا تو!''...... اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور شیخ کو حیران پریشان چھوڑ کر باہر نکل گیا۔ کسی بھی کارندے کو اندر ہونے والی کسی بھی بات کا علم نہ تھا کیونکہ کوئی بھی ان کی گفتگو میں واخل اندازی کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ غفران خفیہ اڈے سے باہر نکل کر کسی محفوظ جگہ جانا چاہتا تھا۔ وہ ہنس رہا تھا کہ جب شیخ پستول چیک کرے گا تو گولیوں سے بھرا ہوا ملے گا۔ تب اس کی حالت دیدنی ہو گی۔ یہ ایک بہت بڑا نفسیاتی داؤ جو غفران نے شیخ کو اس لمحہ مات دینے کے لیے استعمال کیا تھا۔

☆======☆======☆

غفران دروازہ کھٹکھٹایا جانے پر چونک اٹھا۔ اس کے سامنے چلنے والی تمام فلم ختم ہو گئی تھی۔ وہ فوراً چارپائی سے اٹھنا چاہتا تھا۔ مگر اس کے جسم سے اٹھنے والی ٹیسیں اس کا دماغ ماؤف کر رہی تھیں۔ وہ ہمت کر کے آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے کے پاس آیا تو اسے دروازہ کھٹکھٹانے والے پر سخت غصہ آیا۔ کیونکہ ایسا لگتا تھا کہ دروازہ توڑ دیا جائے گا۔

''کہیں پھر تو پلس نہیں آ گئی؟'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ مگر تب تک وہ دروازہ کھول چکا تھا۔ سامنے عصمہ کو دیکھ کر اس کا سارا غصہ کافور ہو گیا تھا۔ عصمہ بھی شرمندہ دکھائی دے رہی تھی۔ اسے شاید غفران کے دروازہ کھولنے کی توقع نہ تھی۔

''جی کہیے۔'' غفران نے مختصر سا سوال کیا۔ وہ بھی عصمہ سے نظر ملا کر بات نہ کر سکا۔

''میں ماں جی سے ملنے آئی تھی۔'' وہ بڑی نزاکت سے بول رہی تھی۔ ''انہوں نے کہا تھا کہ دوپہر کو تم آ جانا۔ شاہ جی کے پاس چلیں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے نظریں جھکا لیں۔

''آپ اندر آ کر انتظار کرنا چاہیں تو ست بسم اللہ!'' وہ دروازے سے ایک طرف ہٹ گیا۔ ''ماں جی گھر پر نہیں ہیں۔ وہ کسی کے گھر گئی ہوئی ہیں۔'' غفران کی نگاہیں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔

''نہیں!'' وہ اپنے دوپٹے کو بل دے رہی تھی۔ ''میں پھر آ جاؤں گی۔'' یہ کہہ کر وہ واپس چلی گئی غفران اس کی گردِ راہ ہی دیکھتا رہ گیا۔ وہ واپس چارپائی پر آ کر لیٹ گیا۔ اس نے جانی کے پاس جانے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ وہ ماں جی کے آنے سے پہلے ہی نکل جانا چاہتا تھا۔ مگر چوٹوں کی شدت نے اسے لیٹے رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔

شیخ عمر حیات کی کوئی بھی کاٹن فیکٹری نہ تھی۔ اس نے محض ایک گھٹیا چال چل کر غفران کو پٹوایا تھا۔ تھانیدار اشرف چاولہ بھی کسی نئے اور پہلے ہی کیس سے ترقی کرنا چاہتا تھا۔ وہ یقیناً شیخ کے خصوصی تعلقات کی بنا پر یہاں ٹرانسفر کروایا گیا تھا۔ کیونکہ تھانوں کا پرانا تمام عملہ غفران سے اچھی طرح واقف تھا۔

''شیخ عمر حیات، تجھے اب سبق سکھانا پڑے گا۔ میں نے کہا تھا کہ میری آزادی میں رکاوٹ مت بننا میں بھی گھر کا بھیدی ہوں۔ دیکھ، تجھے اب سڑکوں پر خاک چھاننے کے لیے کیسے مجبور کرتا ہوں۔ تم نے غفران کو صرف اپنی انگلیوں پر ہی نچایا ہے۔ اب غفران کیا کرتا ہے تم دیکھنا۔'' وہ خود ہی بڑبڑا رہا تھا۔ جانی بے چارے کو تو علم بھی نہ ہو گا کہ وہ ایک رات حوالات میں اور پُرتشدد ماحول میں گزار کر آیا ہے۔

اسے اتنا یقین تھا کہ شیخ عمر حیات اسے قتل نہیں کروا سکتا تھا۔ کیونکہ اس کے کافی راز غفران کے پاس تھے اور غفران نے ان رازوں کی بدولت ہی شیخ عمر حیات کو قابو کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔

☆======☆======☆

''پھولوں کو پسند کرنے اور باہر نہ پھینکنے کا بہت بہت شکریہ۔'' اس نے آج پھر موٹر سائیکل عصمہ کے انتہائی قریب [illegible]

کھڑی رہ گئی جبکہ وہ کبھی کا جا چکا تھا۔ اسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے۔ اپنی سوچوں کا بھاری بوجھ اٹھائے وہ گھر تک پہنچ گئی تھی۔ خالد اس کا منتظر تھا۔

آج بھی خالد نے کھانا نہ کھایا تھا۔ عصمہ کو کچھ تشویش ہوئی، لیکن خالد باہر جا چکا تھا۔ کئی دنوں سے خالد کی عادت بن گئی تھی کہ وہ دوپہر کو کھانا نہ کھاتا تھا۔ گھر کا سودا سلف ختم ہونے کو آیا تھا۔ عصمہ کو کل ہی تنخواہ ملی تھی۔ اس نے سوچا کہ ماہانہ راشن لے آنا چاہئے۔ جب اس نے الماری کھول کر اس میں سے پیسے گنے تو پیسے کم تھے۔ وہ یاد کرنے لگی کہ اس نے تنخواہ میں سے کوئی بھی پیسہ خرچ نہ کیا تھا۔ بلکہ اس کے پاس تو پچھلے ماہ کی تنخواہ سے کچھ رقم بھی بچ گئی تھی۔ پھر پیسے کہاں گئے۔ اگر چوری ہو گئے ہوتے تو چور اتنا مہربان تو نہ تھا کہ پوری تنخواہ میں سے باقی رقم چھوڑ جاتا۔ کیا خالد نے چرائے ہیں؟ لیکن خالد کو چرانے کی کیا ضرورت ہے؟ اسے تو منہ مانگے پیسے میں دے دیتی ہوں۔ وہ پریشانی کے عالم میں تھی۔ اس نے نقاب کیا اور اپنے خوبصورت وجود کو ایک چادر میں لپیٹا اور گھر کو تالا لگا کر بازار چل دی۔ تالے کی ایک چابی خالد کے پاس ہوتی تھی تاکہ اگر وہ کبھی سکول سے جلدی آ جائے تو باہر کھڑا رہ کر عصمہ کا انتظار نہ کرتا رہے۔

عصمہ بازار سے ایک دکاندار سے گھریلو ضروریات زندگی کی اشیاء خرید چکی تو اپنا تھیلا اٹھا کر واپس مڑی۔ ابھی وہ بازار کے چوک میں ہی پہنچی تھی کہ تین موٹر سائیکل سواروں نے اسے گھیر لیا۔ وہ تعداد میں پانچ تھے۔ ان کے پاس تین موٹر سائیکلیں تھیں۔ جو کہ بھاری بھرکم انجن کی بدولت کافی شور مچا رہی تھیں۔ عصمہ نے ان سے کترا کر گزرنا چاہا۔ تو ایک نے اس کی کلائی پکڑ کر کھینچ لیا۔ جھٹکا اتنا شدید تھا کہ عصمہ کے ہاتھ سے تھیلا دور جا پڑا۔ جبکہ کئی ایک راہ گیروں نے انہیں شرم دلانے کی کوشش کی تو انہوں نے ان کی بھی پٹائی کر دی۔ بلکہ ریوالور نکال کر دو نے تو ہوائی فائرنگ کر دی۔ جس سے بازار کا ماحول سنسان ہو گیا۔ وہ اب موٹر سائیکلوں سے اتر آئے تھے۔ عصمہ کے اردگرد چکر لگا رہے تھے۔ وہ بے چاری معصوم ہرنی کی طرح اپنے گرد گھومنے والے خونخوار بھیڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔

ایک نے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف کھینچا۔ تو دوسرے نے اس کی بھرپور مزاحمت کے جواب میں اس کا نقاب نوچ لیا۔ وہ چیخنے چلانے لگی۔ مگر اسلحہ کے سامنے سبھی بے بس نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک بھاری بھرکم وجود کا مالک تھا۔ اس نے اس نازک خوفزدہ ہرنی کو کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ وہ بلند آواز میں قہقہے لگا رہے تھے۔ عصمہ ان کے گھیرے میں پھنس چکی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو برسات کی مانند رواں تھے۔ وہ

کے سامنے گڑگڑانے لگی۔ منتیں، واسطے دینے لگی، لیکن وہ خونخوار درندوں کا روپ دھار چکے تھے۔

''میرے خدا تجھے اس قرآن کا واسطہ میری لاج رکھنا۔ جو قرآن تُو نے میرے سینے میں محفوظ کیا ہے..... میری آبرو کی حفاظت فرما۔''

اس کی آواز عرش سے جا ٹکرائی تھی۔ اللہ پاک کی رحمت جوش میں آ گئی تھی۔ پتہ نہیں کہاں سے ایک فرشتہ آیا۔ اس نے بھاری بھرکم غنڈے کو ایک ہاتھ سے پکڑ کر زوردار جھٹکا دیا تو اس کا بازو کندھے سے اکھڑ گیا۔ وہ شدید درد سے بے ہوش ہو گیا۔ اس کے باقی ساتھیوں نے نووارد پر حملہ کر دیا۔ مگر ایک ایک گھونسا ان سب کے لیے کافی تھا۔ کسی کا جبڑا ٹوٹ گیا تھا۔ کسی کی ناک اور کسی کی آنکھ پھوٹ گئی تھی۔ وہ پانچوں ہی بازار کے بیچوں بیچ پڑے ہوئے تڑپ رہے تھے۔ کوئی ان کی فریاد سن کر پاس آنے کی جرأت نہ کر رہا تھا۔ نووارد نے آگے بڑھ کر عصمہ کو اس کا تھیلا پکڑایا اور اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا تو اس نے نگاہیں اٹھا کر نووارد کی طرف دیکھا تو حیران رہ گئی۔

کیونکہ وہ اس چہرے کو کبھی نہ بھول سکتی تھی۔ وہ اسمٰعیل تھا۔ شاہ جی کا خاص مرید اور ان کا خدمت گار۔ وہ یقیناً عصمہ کے لیے رحمت خداوندی کے فرشتے کا روپ تھا۔ اس نے چادر سے اچھی طرح عصمہ کو ڈھانپ دیا تھا۔ پانچوں غنڈے بے ہوش پڑے ہوئے تھے۔ اسمٰعیل نے مجمع کی طرف دیکھا جو ہونق بنے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ اس کی طاقت کا اندازہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ جبکہ عصمہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اسمٰعیل نے بھی ایک کپڑے کا تھیلا پکڑا ہوا تھا۔ جس میں سبزی وغیرہ تھی۔ غالباً وہ بھی شاہ جی کے لیے ضروریاتِ زندگی خریدنے کے لیے نکلا ہوا تھا۔ رب کریم نے اسے ایک وسیلہ بنا کر بھیجا تھا۔ عصمہ کی عزت بچ گئی تھی۔

اس نے عصمہ کو گھر چلنے کے لیے کہا۔ وہ ہچکچاہٹ کا شکار لگتی تھی۔ اسمٰعیل سمجھ گیا کہ اس کے ذہن میں خوف بیٹھ گیا ہے۔ وہ اس کے تذبذب کے عالم کو جانتے ہوئے اس کے آگے آگے چل پڑا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو عصمہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔

اسمٰعیل نے اسے اس کے گھر تک چھوڑا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اسمٰعیل کو اندر آنے کا کہہ رہی تھی۔

''آپ نے میری عزت بچائی۔'' وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ اسمٰعیل بول پڑا۔

''اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اس نے اس مقدس کتاب کی حفاظت اپنے ذمہ لی ہے۔

چند صفحات اور سیاہی سے مزین ایک خوبصورت کتاب کی حفاظت اگر وہ کرتا ہے تو اس کو کیسے رسوا ہوتے دیکھتا جس نے اس کی روشن اور پاکیزہ کتاب کو حفاظت اور محبت سے اپنے سینے میں محفوظ کیا ہوا ہے۔'' وہ جانے کے لیے مڑا تھا۔ عصمہ اس کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ وہ واپس پلٹ کر صحن میں داخل ہوئی تو خالد کو اندر سوتے ہوئے پایا۔ اس نے جلدی جلدی وضو کیا اور قرآن کریم کو سینے سے لگا کر کتنی ہی دیر اسے عقیدت سے چومتی رہی۔ اس مقدس کتاب اور اس کے خالق نے آج اس کی لاج رکھ لی تھی۔ اسے سرِ بازار رسوا ہونے سے بچا لیا تھا۔ اس کا چہرہ ایک بار پھر اس کے پاکیزہ آنسوؤں سے وضو کرنے لگا تھا۔ وہ نہ جانے کب تک ہچکیاں لے کر روتی رہی۔

☆======☆======☆

شیخ عمر حیات کی فیملی کے علاوہ اب تو بہت سے لوگ بابا جی کے مطیع ہو چکے تھے۔ بابا جی کبھی کبھار شیخ کے گھر پر بھی رات بسر کر لیا کرتے تھے۔ اس کا پھیلایا ہوا نیٹ ورک صرف انہی گھروں تک پھیلا ہوا تھا جو ایمان کے کمزور اور کمزور عقائد کے مالک تھے۔ جن گھروں میں تو جوان اور خوبصورت لڑکیاں ہوتی تھیں۔

ملیحہ بابا جی کے آستانے میں موجود تھی۔ یہ وہی کمرا تھا جو گھر میں الگ تھلگ تھا۔ اس کو آراستہ کرنے کے بعد بابا جی کے لیے وقف کر دیا گیا تھا۔ بابا جی نے سختی سے منع کر دیا تھا کہ کوئی بھی اس کے کمرے کو صرف کمرا نہ کہے۔ بس وہ کمرا ''آستانہ'' کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔

ملیحہ بابا جی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ان کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔ وہ انتہائی جاذب نظر اور پُرکشش لگتی تھی۔ بابا جی جو کہ چالیس سال کی عمر کا پختہ کار مرد تھا، اس رسیلے اور مدہوش حسن کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنے کے لیے جال بچھا رہا تھا۔ ابھی تک ملیحہ کی طرف سے کوئی بھی حوصلہ افزائی اسے نہ ملی تھی۔

وہ اپنے طریقۂ واردات پر مطمئن تھا۔ مرغی ذبح کر کے ایک بار انڈے کھانے کی اسے عادت نہ تھی۔ وہ ہر روز سونے کا انڈہ حاصل کرنے کا قائل تھا۔ جبھی تو آج تک وہ مختلف جگہوں سے ابھرتی ہوئی جوانیوں کا رس چوس کر خاصا موٹا تازہ بھنورا بن چکا تھا۔

جن گھرانوں کو اس نے اپنے ہاتھوں پر بیعت کیا تھا۔ اس کی شرط اور خواہش کے مطابق ان سب گھروں میں ایک کمرا آستانہ بنا لیتا تھا۔ وہ بہت محتاط اور پُرسکون ہو کر طریقۂ واردات پر عمل پیرا ہوتا تھا۔ وہ اس گھر والوں سے علیحدہ علیحدہ ملاقاتیں کرتا تھا۔ ہر ایک

کے دل کی مرضی معلوم کرنے کے بعد وہ انہیں نامعلوم طریقے سے بلیک میل کر کے اپنا کام نکالتا تھا۔ جوان لڑکیاں عموماً کسی نہ کسی کو پسند کرتی ہیں۔ وہ ایسی لڑکیوں کی حوصلہ افزائی کرتا اور ان کی شادی ان کی پسندیدہ جگہ پر اپنے عمل کے ذریعے کروا دیتا تھا۔ جو کہ چند ماہ بعد یا پھر چند سالوں بعد ناکام ہو کر طلاق پر ختم ہو جاتی تھی، لیکن ان تمام معاملات میں بابا جی بالکل بے قصور ہوتے تھے۔ بلکہ ان کے احسان تلے دب کر وہ ''کلی'' تمام عمر ان کے سامنے آنکھ نہ اٹھاتی اور اسے مزید کھل کھیلنے کا موقع ملتا تھا۔

اس نے ہر مرید کی ڈیوٹی لگائی ہوتی تھی کہ وہ روزانہ علیحدہ علیحدہ کسی بکس میں یا اپنی ذاتی خفیہ جگہ پر پانچ دس روپے پھینکتا رہے۔ سال کے آخر میں وہ تمام رقم لے کر کراچی اپنے مرشد کے دربار پر پہنچ جاتا تھا۔ امیر لوگوں کے لیے یہ انتہائی مشکل کام ہوتا ہے کہ وہ روزانہ یہ معمولی سا کام یاددھانی سے کریں۔ لہٰذا وہ سال کے آخر میں ویسے ہی بابا جی کو کافی ''نذرانہ'' دے دیا کرتے تھے۔ جو بقول ان کے ان کی آخرت سنوارنے کے کام آئے گا۔

اب بھی وہ ملیحہ کو اپنی لائن پر لانے کے لیے جال بُن رہا تھا۔ یوں تو اس نے بہت ساری کشش عالیہ بیگم میں بھی محسوس کی تھی۔ مگر وہ ذرا چالاک اور عیار قسم کی عورت لگتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ آسانی سے ہاتھ نہ آئے گی، لیکن بابا جی اس پر بھی کوشش جاری رکھے ہوئے تھے۔

''ہمیں پتہ چلا ہے کہ ہماری بچی کسی سے محبت میں مبتلا ہے۔'' بابا جی نے ملیحہ کی طرف دیکھے بغیر کہنا شروع کیا تو ملیحہ کے بابا جی کی ٹانگیں دباتے ہوئے ہاتھ نامعلوم ساعت کے لیے ٹھہر گئے۔ مگر وہ اپنی اطاعت سے، خدمت سے اور وفاداری سے بابا جی کو متاثر کرنے کے لیے بدستور اپنا کام کرتی رہی۔

''اگر کوئی لڑکا پسند ہو تو مجھ سے کہنا۔ اپنے باپ سے کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم جو ہیں۔''

بابا جی نے ملیحہ کے تاثرات جاننے کے لیے آنکھیں کھولیں۔ مگر ملیحہ کی آنکھیں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔ بابا جی اس کے خوبصورت اور نرم و نازک وجود کا اپنی ہوس بھری نظروں سے طواف کرنے لگے۔ اس کے نرم و نازک ہاتھوں کا لمس اس کے جسم میں بھونچال پیدا کر رہا تھا مگر اس لمحہ خود پر قابو رکھنا بہت ضروری تھا۔ کیونکہ اس کا کھیل اور اس کا تجربہ بتا رہا تھا کہ کوئی زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑے گی۔

پچ کیسی بھی ہو۔ جب ایک بار بیٹسمین ٹک کر کھڑا ہو جائے تو مخالف باؤلرز کی تیز و

تند گیندیں بھی اسے آؤٹ نہیں کر سکتیں۔ کوئی آؤٹ سوئنگ، کوئی ان سوئنگ، کوئی ریورس سوئنگ اور کوئی بھی گگلی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ وہ با آسانی ہر گیند کو زبردست ہٹ لگا کر باؤنڈری لائن سے باہر پھینک دیتا ہے اور بالآخر سینچری سکور کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ اس میچ پر تبصرہ نگاروں اور تنقید نگاروں کے منہ اپنی اچھی کارکردگی سے بند کر دیتا ہے۔ ایک لمبی اننگ کھیل کر اپنی ٹیم کو فتح دلوا کر وہ سرخرو ہوتا ہے۔ بابا جی بھی انہی ٹپس کو ذہن میں رکھتے ہوئے ملیحہ کے حسن کی پچ پر لمبی اننگ کھیلنا چاہتے تھے۔ اپنے اندر بیٹھے ہوئے شیطان کی تسلی و تسکین کے لیے وہ باہر جاتی ہوئی گیند کو نہیں چھیڑنا چاہتے تھے۔ مبادا کوئی گیند بلے کا کنارہ لیتی ہوئی وکٹ کیپر یا فرسٹ سلپ میں کھڑے ہوئے فیلڈر کے ہاتھ میں چلی جائے اور وہ بنا لمبی اننگ کھیلے ہی آؤٹ ہو جائے۔ وہ آہستہ آہستہ ہلکے ہلکے سڑوکس کھیل کر ملیحہ کے حسن کی گیند کی شائننگ ختم کرنا چاہتا تھا تا کہ اس کے حسن کی چمک اور تیز آتی ہوئی کوئی بھی گیند بلے کا کنارہ لے کر کسی فیلڈر کے ہاتھوں میں نہ جائے اور نہ ہی وہ کوئی غلط سکور کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے اندر بیٹھے ہوئے شیطان ایمپائر کی کال پر نہ بنتی ہوئی سنگل لے کر رن آؤٹ ہونے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ بس لمبی اننگ اور باؤلر پر حاوی ہونا ہی اس کا مقصد تھا، اور اب تک اس کی کامیابی کا تناسب سو فیصد تھا۔ اس کی بہترین حکمت عملی کی بدولت اس کی سینچریوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ محتاط اور ٹھنڈے دماغ سے بیٹنگ کرنے والا ''کھلاڑی'' تھا۔

''تم سب ہمارے مرید نہیں ہو۔'' بابا جی نے ملیحہ کے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''ہماری اولاد کی طرح ہو اور اولاد کی خواہش پوری کرنا ہمارا اولین فرض ہے۔ اگر کوئی دل میں ہے تو بلا تکلف کہہ دینا۔ ہم کسی کو نہیں بتائیں گے اور تم دیکھنا کہ ہوگا وہی جو ہم چاہیں گے۔''

''میں جس کو پسند کرتی ہوں۔'' ملیحہ نے ڈرے ڈرے انداز میں اپنے ہاتھ بابا جی کے ہاتھوں سے چھڑاتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت پاپا اسے سخت ناپسند کرتے ہیں اور وہ کبھی بھی نہ چاہیں گے کہ میری شادی وہاں پر ہو۔''

''مجھ پر اعتماد کرو اور یقین رکھو۔ اس بات کو بھول جاؤ کہ رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ اپنے مریدوں کی قسمت بھی ہم بناتے ہیں اور ان کی جوڑیاں بھی ہماری مرضی اور پسند سے بنتی ہیں۔''

وہ تذبذب کا شکار ہو گئی تھی۔ ''میں غفران سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔'' اس نے بم

پھینکا تھا۔

''وہ تو تمہارے قابل نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ایک غلام ہے۔ ملازم اور کتے میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔'' بابا جی نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا اور ساتھ ہی اپنا زہر بھی نکال لیا تھا۔ کیونکہ پہلے دن سے ہی غفران انہیں سخت ناپسند تھا۔

''آپ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ میری پسند کی جگہ پر میری مرضی سے شادی کروائیں گے۔'' ملیحہ بھی کھل گئی تھی۔

''ہم اپنے وعدہ سے منحرف نہیں ہوئے ہیں۔'' بابا جی نے پاندان میں پان کی پیک پھینکتے ہوئے کہا۔ ''ہوگا وہی جو ہماری بچی چاہے گی۔ اس کے لیے ہمیں کچھ بھی کرنا پڑے۔ بڑی مشکل اور کٹھن راہوں سے گزرنا ہوگا۔''

وہ بدستور ملیحہ کے وجود کا غلیظ نگاہوں سے طواف کر رہا تھا۔ ''دو چار کام ہماری مرضی سے کرنا ہوں گے۔ خطرناک چلے کاٹنا ہوں گے۔ مگر یہ تو بتاؤ۔ کیا وہ بھی تمہیں پسند کرتا ہے؟''

''میں نہیں جانتی۔''

''یک طرفہ عشق ہے؟'' استفسار کیا گیا۔

''ہاں۔'' وہ اب اپنی انگلیوں کو مروڑ رہی تھی۔ ''لیکن میں اسے پانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ کوئی بھی چلہ کوئی بھی کٹھن کام میں کر سکتی ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ تو پھر ذہنی طور پر تیار ہو جاؤ۔'' وہ ملیحہ کو اپنی باتوں میں الجھا کر کامیابی سے شیطانیت کے مراحل طے کرتا ہوا بولا۔ ''اس کے لیے ہمیں بھی بہت محنت کرنا پڑے گی۔ تمہیں ہمارا ساتھ دینا ہوگا۔''

''آپ فی الحال پاپا کو نہ بتائیں۔'' اس نے منت بھرا لہجہ استعمال کیا تو بابا جی کو بے اختیار اس پر پیار آ گیا۔ وہ اپنے آپ کو روک نہ سکا۔ اس نے آگے بڑھ کر ملیحہ کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتی، کچھ بولتی۔ شاطر کھلاڑی نے اچھی ''تھرو'' پھینک کر ملیحہ کی بولتی کو رن آؤٹ کر دیا۔

''میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ تمام مریدین میرے بچے ہیں۔ ان کا دکھ درد سمجھتا ہوں۔ اب تم عمر حیات کی نہیں بلکہ میری ذمہ داری ہو۔ فکر نہ کرو بچی۔ جو چاہو گی۔ وہی ہو گا۔ بس مرشد کی ناراضی کا خیال رکھنا۔'' وہ ملیحہ کو اپنی لائن اور لینتھ کے مطابق استعمال کرنے لگا تھا۔ ''سیانے کہتے ہیں کہ مرشد ناراض ہو جائے تو اوپر والا قہر برسانے لگتا ہے۔

بس اس کے قہر سے ڈرنا کہیں اس کا قہر تمہارے غفران کو اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔ اب تم جاؤ بچی اور بے فکر ہو کر آئندہ گزارنے والی زندگی کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے تیاری شروع کر دو!''

بابا جی نے گویا اس پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ وہ ان کے قدموں کو چھوتی ہوئی باہر نکلی تو بابا جی کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ رینگ گئی۔ یہ اس کی دوسری کامیابی تھی۔ پہلی کامیابی تو اس نے غفران کو نکلوا کر حاصل کر لی تھی۔ اب دوسری کامیابی اس نے اپنی ہوس کی پیاس بجھانے کے لیے ملیحہ کی جوانی کا رس چوسنے کا بہترین پروگرام بنا کر حاصل کر لی تھی۔

اب عالیہ بیگم کے دل کی بات بھی سننا پڑے گی۔ اس کی آنکھوں میں جو پیاس تھی۔ وہ بابا جی نے اچھی طرح محسوس کر لی تھی۔ شیخ اور عالیہ بیگم کی محبت تو مثالی تھی، لیکن جوانی گزارنے کے لیے صرف محبت ہی کافی نہیں ہوتی۔ بلکہ جذبات اور رشتوں کا احترام بھی ضروری ہوتا ہے۔ شیخ صاحب عالیہ بیگم کو تشنہ ہی رکھتے تھے۔ اس کی دلی کیفیت انہی جذبات کا اظہار کر رہی ہوتی تھی۔ یہ بات بابا جی کی جہاندیدہ نظروں نے واضح طور پر محسوس کر لی تھی۔ کیونکہ وہ اس کھیل کا پرانا کھلاڑی تھا۔ بیٹی کو اپنے جال میں پھنسانے کے بعد اس کو عالیہ بیگم کے لیے بھرپور لائحہ عمل تیار کرنا تھا۔

وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ جادو کے جو کلمات اسے یاد تھے۔ وہ انسان کو اس کا گرویدہ بنا دیتے تھے۔ مگر مضبوط اور پکے عقیدہ کا مسلمان اور سچا عاشق رسول اس کے اس وار کو باآسانی سہہ جاتا تھا۔ بلکہ دوسرے الفاظ میں اسے ناکام بنا دیتا تھا۔

جس طرح کسی بڑے بوڑھے بزرگ کا بچے کو غلط کام سے روکنے کے لئے بس آنکھ کا اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ اسی طرح جب ایک سچا عاشق رسول اور پختہ عقیدہ رکھنے والا شخص کسی جادوگر یا پیر کا لاعلم کرنے والے کے سامنے ہی چلا جائے۔ اس کے تمام وار اور کلام ضائع ہو جاتے ہیں۔ وہ جان گیا تھا کہ غفران کبھی بھی اس کی مریدی میں نہ آئے گا۔ جس طرح غفران نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا اور وہ جان گیا تھا کہ یہ بابا جی ایک فراڈ ہے۔ اسی طرح بابا جی کو بھی علم تھا کہ یہ شخص ایک پختہ ایمان والا اور سچا آدمی ہے، لیکن غفران کا کانٹا نکالنے کے لیے اسے کوئی خاص محنت نہ کرنی پڑی تھی۔

اب اس کے لیے میدان صاف تھا۔ وہ ایک ایک کر کے تمام افراد کو اپنے تابع کر رہا تھا۔ یہ ڈاکٹر شارق بھی کمال کا آدمی ہے۔ کیسی بے وقوف آسامی ڈھونڈی ہے۔ جو خدا

پر کم اعتقاد رکھتا ہے۔ بس اس کا عقیدہ اس بات پر پختہ ہو گیا ہے کہ جو کچھ بھی ملے گا۔ بابا جی سے ہی ملے گا۔ اس سے زیادہ تو ہم پرستی اور دقیانوسی کیا ہو سکتی ہے؟

☆======☆======☆

جانی اس کے زخموں پر مرہم لگا رہا تھا۔ غفران چارپائی پر الٹا لیٹا ہوا تھا۔

''آپ نے اچھا نہیں کیا غفران بھائی۔'' جانی نے اس کے زخموں پر مزید دوائی لگاتے ہوئے کہا۔

''کیا اچھا نہیں کیا؟'' اس نے لیٹے لیٹے ہی پوچھا۔

''آپ کو ابھی تک وہیں رہنا چاہئے تھا'' جانی نے کہنا شروع کیا تو وہ اٹھ کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور جانی کو حیرت سے دیکھنے لگا۔ ''ابھی تو ہمیں بہت کام کرنا تھا۔ اس ڈھونگی پیر کا پتہ کرنا تھا۔ اس کا ''کھرا'' تلاش کرنا تھا۔ آپ وہاں ہوتے تو آسانی ہوتی۔''

''میں وہاں ہوتا تو ایک نہ ایک دن میرے دماغ کی نس پھٹ جاتی۔'' وہ کہنے لگا۔

''تم نہیں جانتے وہ عالیہ بیگم اور ملیحہ کو کیسی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے۔''

''تو تمہیں اس سے کیا؟''

''مجھے واقعی کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے۔'' وہ غصہ میں بولا تھا۔ ''کیونکہ کون سا میری ان سے کوئی رشتہ داری ہے..... لیکن جانی مجھے اس وقت بہت کوفت ہوتی تھی جب شیخ عمر حیات اور ان کی پوری فیملی اس جاہل اور نوٹنکی کے سامنے جھکتے تھے۔''

جانی بھی بحث اور معلومات کے موڈ میں تھا۔

''ابھی تک تو یہ ثابت نہیں ہوسکا کہ وہ جاہل اور نوٹنکی ہے۔''

''اَن پڑھ تو میں ہوں؟'' وہ جانی کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن لگتا ہے تیری ''مت'' ماری گئی ہے۔ کیا کوئی سمجھ دار اور اسلامی اقدار کو سمجھنے اور جاننے والا مسلمان کسی انسان کے آگے جھکے اور وہ آگے سے اسے منع نہ کرے تو اس کا کیا مطلب ہوا؟ بتا مجھے کیا مطلب ہوا؟''

''تم ہی بتاؤ۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ شخص محض فراڈ ہے۔ ایک دھوکا ہے کیونکہ سجدہ صرف رب کریم کی ذات کو واجب ہے بس۔''

''اگر اتنی ہی معلومات رکھتے ہو غفران بھائی تو..... کبھی اس رب کریم کو سجدہ کیوں نہیں کیا؟ میں نے تو کبھی بھی تمہیں ان کی حمد و ثناء کرتے نہیں سنا۔''

''جانی بادشاہ، بس سمجھ لے کہ گناہوں کی اس زندگی کو چھوڑ کر سچے راستے پر چلانے کے لیے کوئی سچا گرو ہی نہیں ملا۔''

''غفران بھائی، میں آپ کو سمجھا تو نہیں سکتا، لیکن اتنا ضرور کہوں گا۔'' غفران سنبھل کر بیٹھ گیا اور جانی کی طرف متوجہ ہو کر سننے لگا۔ ''نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ یہ بات حتمی طور پر تصدیق شدہ ہے۔ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے۔ اس کے بعد بھی کوئی کتاب آسمان سے نہ اتاری جائے گی۔ آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے جب انبیاء کرام کا سلسلہ بند ہو چکا تھا۔ جب نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو رب رحیم نے اپنے پاس بلوا لیا تو اس وقت دین اسلام کی تکمیل ہو چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر مقدس کتاب اور انبیاء کرام کا سلسلہ بند کر دیا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں اور قرآن کریم آسمانی کتب میں سے آخری کتاب ہے۔ ان کی ذاتِ مقدس کے بعد کوئی نبی نہیں آیا۔ مگر ان کی اولاد اور آل نے تبلیغ اسلام سے رب کائنات کی پہچان بتائی۔ لوگوں کو قرآنِ کریم کی تعلیم دی اور بتایا کہ یہ مشرق اور مغرب ایک نہیں ہیں۔ بلکہ وہ رب دونوں مشرقوں اور دونوں مغربوں کا رب ہے۔ اس کا نظام اور اس کے بتائے ہوئے راستے اور بنائے ہوئے قوانین۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی آل میں سے کوئی نہ کوئی اپنا کام اور ڈیوٹی انجام دیتا ہوا ملے گا۔ ان کے کندھوں پر دین اسلام کی اشاعت اور لوگوں کو گمراہی سے بچانے کی جو ذمہ داری رب کریم نے ڈالی ہے۔ وہ اس کو بخوبی و احسن نبھا رہے ہیں۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی آل میں سے کبھی کوئی بھی تمہیں گمراہ نہ ملے گا۔ وہ کوئی عام خاندان سے تعلق نہیں رکھتے۔ بلکہ اس عظیم و مقدس گھرانے سے تعلق ہے جن کی آل اولاد اور اصحاب سے تعلیم حاصل کر کے علماء کرام یہاں تک پہنچے ہیں۔ ان کی ذات مقدس کو سامنے رکھتے ہوئے۔ ان کی سنتوں اور احادیث پر عمل کرتے ہوئے یہ علماء کرام اپنی اپنی ڈیوٹی انجام دیتے ہیں۔ ذرا غور کرو! اگر یہ علماء اور مولوی نہ ہوتے تو کون تھا جو ہمارے نکاح پڑھواتا؟ ہمارے جنازے پڑھواتا۔ ہمیں جھوٹ اور سچ کی تمیز بتاتا؟''

وہ کچھ دیر کے لیے رکا۔ وہ اپنی کہی گئی باتوں کا غفران کے چہرے پر جائزہ لے رہا تھا۔ جس پر ان باتوں کا کافی اثر ہوا تھا۔

''غفران بھائی!'' جانی پھر بولا۔ ''اگر کسی مولوی یا عالم پر تمہارا اعتبار نہیں ہے تو کسی آل رسول کا دامن ہی تھام لو۔''

''جانی بادشاہ! تیری باتوں میں بہت وزن ہے لیکن۔'' وہ توقف کرتے ہوئے

بولا۔ ''جب تک ...... جب تک میں اس ڈھونگی کا مکمل حدود اربعہ نہ تلاش کر لوں۔ میں کسی بھی پیر فقیر سے نہ ملوں گا اور شیخ عمر حیات کی مکمل تباہ کاری تک تو میں چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔ وہ معصوم بچوں کو زہر فروخت کر رہا ہے۔ گھروں کے گھر اجاڑ رہا ہے۔ وہ ایک نام نہاد ''پیر'' کے سامنے سر جھکا رہا ہے۔ اس نے میرے ساتھ بدعہدی کی ہے۔ میں اس کے تمام کاروبار کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔ دیکھنا۔ تم دیکھنا ایک دن میں اسے اسی شہر کی سڑکوں پر بھیک مانگنے پر مجبور کر دوں گا۔ تم دیکھنا۔ تم دیکھنا۔ جانی بادشاہ!'' وہ اس وقت بہت غصے میں تھا اور اسے عقل کی کوئی بات سمجھانا مشکل تھا، لیکن جانی سمجھتا تھا کہ جو سبق اس نے غفران کو آج دے دیا ہے کافی ہے۔ وہ اسے مزید مجبور نہ کر سکتا تھا۔

''دیکھو غفران بھائی!'' جانی اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ''تمہارے احسانات نے اس جانی کو نئی زندگی دی ہے۔ میرے لائق کوئی خدمت بتاؤ۔ اگر تمہاری یہ دی ہوئی زندگی تمہارے ہی کام آ جائے تو میری خوش قسمتی ہوگی۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔

غفران نے اسے بڑھ کر سینے سے لگا لیا تھا۔ ''اوئے بھولے بادشاہ!'' اس نے جانی کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''زندگی اور موت تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ بس تم اپنا کام کرو۔ اس ڈھکوسلے کا مکمل حدود اربعہ معلوم کرو۔ تمہارا یہ کام ہے اور میرا کام مجھے کرنے دو۔ ابھی بہت کام کرنا ہے۔ تم دولت اور وسائل کی پرواہ نہ کرنا۔''

''غفران بھائی! میں ان شاء اللہ اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤں گا اور دولت بھی ضائع نہ ہوگی۔''

''اس دن جو نوٹوں کی گڈی اس حرامی کو دی تھی اس کا کیا بنا؟'' غفران نے مسکراتے ہوئے کہا تو جانی بھی مسکرانے لگا۔

''فکر مت کرو غفران بھائی! تمہارا یہ ہونہار شاگرد تمام رقم سود سمیت واپس لائے گا۔''

''ویسے میں نے تمہیں کیا سکھایا ہے؟ جو تم میرے ہونہار شاگرد ہونے پر اترا رہے ہو۔''

''تم نے مجھے جینا سکھایا ہے۔'' جانی نے اس کے ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''آج کے نفسا نفسی کے دور میں کوئی کسی مرنے والے کا رخ بھرپور زندگی کی طرف موڑنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ بس وہی استاد ہے۔ غفران بھائی! شیخ عمر حیات ایک انتہائی کائیاں آدمی ہے۔ ذرا اس سے بچ کر رہنا۔ کیونکہ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں اور پھر اس کے ''پیر'' کے پاس کالا علم بھی ہے۔ وہ تمہیں پھر نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

''تم فکر نہ کرو جانی بادشاہ! جس شخص کے پیچھے اس کی ماں دعائیں کرے۔ دنیا کے کمینوں کی کمینگی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ بس تو گھبرانہ۔ ستے ای خیراں نیں۔'' یہ کہہ کر غفران باہر نکل گیا۔

☆======☆======☆

ڈاکیے نے عصمہ کو خط پکڑایا تو وہ حیرانگی سے جاتے ہوئے ڈاکیے کو دیکھتی رہی۔ اس کے گھر کے پتہ پر پہلی مرتبہ کوئی خط آیا تھا۔ خط کے باہر صرف خالد کا نام اور پتہ لکھا ہوا تھا۔ وہ حیرت واستعجاب کے سمندر میں غوطے کھاتی ہوئی خط پکڑے اندر داخل ہوئی۔ تو اس نے حسب معمول خالد کو کھانے پر بلوایا۔ مگر خالد بھی حسب معمول ''بھوک نہیں ہے۔'' کا راگ الاپتا ہوا باہر نکل گیا۔ عصمہ کو خالد کی بڑی فکر ہو رہی تھی۔ وہ کھانا اور دودھ پینا بالکل ترک کر چکا تھا۔ جبکہ دودھ اس کی من پسند خوراک تھی۔ اسے فکر لاحق ہوئی کہ کہیں پھر سے تو اس خبیث بدروح نے اس کے جسم پر قبضہ نہ جمالیا ہو۔ مگر خالد کی کوئی بھی حرکت پہلے جیسی نہ تھی۔ وہ نہ تو لوگوں کو گالیاں دیتا تھا اور نہ ہی ان کے دروازوں پر اینٹوں سے دستک دیتا تھا جبکہ بدروح کی اس کے جسم میں موجودگی کے دور میں یہ اس کے محبوب مشاغل ہوا کرتے تھے۔ ایک انہونی تھی جو شاہ جی نے کر دکھائی تھی۔ کافی علاج معالجے سے بھی خالد کو کچھ افاقہ نہ ہوتا تھا۔ شاہ جی نے اللہ کے کلام سے اس موذی کو خالد کے وجود سے نکالا تھا۔ اس نے شاہ جی کا دیا ہوا تعویذ بھی خالد کو پہنا دیا تھا۔ پھر خالد کا رویہ اور کھانا نہ کھانا اسے سمجھ نہ آ رہا تھا۔ اسے ایک بار پھر ماں جی کے توسط سے شاہ جی جیسی مہربان ہستی سے ملنا چاہئے۔ وہ انہی سوچوں میں غلطاں کرسی سے اٹھی تو اس کی جھولی میں رکھا ہوا خط نیچے گر گیا۔

''ہونہ ہو؟ یہ کام اسی شریر لڑکے کا ہوگا۔'' اس نے خود سے ہی کہا، اور ''دیکھوں تو'' کہہ کر لفافہ چاک کیا تو اس میں سے ایک کارڈ نکل کر نیچے گر گیا۔ جبکہ لفافہ کے اندر ایک صفحہ بھی تہہ کیا ہوا تھا۔ جس پر کچھ تحریر تھا۔

عصمہ نے زمین سے کارڈ اٹھایا۔ وہ کسی کمپنی کا وزیٹنگ کارڈ تھا۔ جبکہ اس کے جی ایم کا نام بھی درج تھا۔ کارڈ انگلش میں تھا۔ انتہائی سادہ اور دیدہ زیب پرنٹنگ نے اس کارڈ کی اہمیت بڑھا دی تھی۔

''شیخ عمر حیات انٹرپرائزز'' کے کارڈ پر ہوزری کے متعلق گارمنٹس کی مختلف

ورائیٹیز درج تھیں۔ اوپر والے کونے میں ''محمد احمد'' جنرل منیجر، پرنٹ تھا۔ جبکہ نیچے یونٹ کا ایڈریس اور فون نمبرز درج تھے۔ موبائیل نمبرز بھی درج تھے۔ وہ کچھ دیر تو اس کارڈ کا مقصد نہ سمجھ سکی، لیکن جب لفافہ سے وہ تہہ شدہ کاغذ نکالا تو اس کی تحریر پڑھ کر اسے سمجھ آ گیا تھا کہ موصوف کا نام محمد احمد ہے وہ اس کمپنی کے مالک کے بیٹے ہیں اور عصمہ کو فرم میں جاب آفر کر رہے ہیں۔

''ان دیکھے حسن کو سلام''

ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں کہ بذریعہ خط آپ کی زندگی میں داخل ہو رہا ہوں۔ خط لکھنا میری مجبوری ہے۔ کیونکہ اس ترقی یافتہ دور میں بھی آپ کے گھر فون کنکشن نہیں ہے۔ آپ کے بھائی کا نام اسی سے پوچھا تھا اور آتے جاتے ایڈریس بھی معلوم ہو گیا تھا۔

خط لکھنے کا مقصد آپ کو مطلع کرنا تھا کہ آپ جیسی پڑھی لکھی لڑکی کی ہماری قوم کو ضرورت ہے مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں جسے دل و جان سے چاہنے لگا ہوں۔ وہ سڑکوں پر پیدل چلتی پھرے۔ آپ کو میری فرم میں اسسٹنٹ منیجر کی جاب دی جا چکی ہے۔ آپ کبھی بھی اپنی سیٹ پر آ کر اپنا کام شروع کر سکتی ہیں۔ تجربہ آپ کو خود بخود ہو جائے گا۔

آپ کی آمد کا شدت سے منتظر رہوں گا اور امید کرتا ہوں کہ آئندہ ملاقات مکمل دیدار سے ہو گی کیونکہ میں ادھورا چاند دیکھنے کا عادی نہیں ہوں۔

اب آپ سے آفس میں ہی ملاقات ہو گی۔ کارڈ پر مکمل پتہ درج ہے۔

آپ کی آمد کا شدت سے منتظر

''محمد احمد''

عجیب سی الجھن ہو رہی تھی۔ وہ کیا کرے؟ یہ احمد کہاں سے آ گیا اس کی زندگی میں۔ وہ کیوں بھلا سکول کی جاب چھوڑ کر ''شیخ عمر حیات انٹر پرائزز'' میں جاب کرے۔ اسے تو منیجمنٹ کا کوئی تجربہ بھی نہ تھا۔ نہ ہی اسے بزنس کی ''الف ب'' معلوم تھی۔ پھر بھی یہ احمد اسے کیوں اتنا پرکشش عہدہ آفر کر رہا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ جسے میں دل و جان سے چاہتا ہوں۔ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ وہ سڑکوں پر پیدل گھومتی پھرے۔ اس کا مطلب ہے کہ کوئی سواری کی بھی آفر ہے۔ یقیناً عصمہ اور خالد کا مستقبل تابناک ہو سکتا تھا، لیکن اس نے تو ابھی تک احمد کو نظر بھر کے بھی نہ دیکھا تھا اور احمد کا بھی یقیناً یہی حال تھا۔ اس نے بھی

عصمہ کو دیکھا تو نقاب اور مکمل چادر میں ہی دیکھا تھا۔

یہ احساس بڑا خوشگوار ہوتا ہے کہ کوئی آپ کو چاہے۔ آپ کو احساس ہوتا رہے کہ اس نفرت اور نفسا نفسی کی دنیا میں بھی کوئی آپ کا طلبگار ہے۔ عصمہ جتنی حسین اور خوبصورت تھی، کوئی بھی اسے اپنے دل کی مہارانی بنا سکتا تھا۔ جتنے اس میں گن تھے کوئی بھی ماں اسے اپنے بیٹے کے لیے بہو کی صورت میں چن سکتی تھی۔ مگر وہ کسی کی بہو یا کسی کی بیوی نہیں بن سکتی تھی۔ کیونکہ وہ غریب تھی اور غربت و مفلسی سب سے بڑا اور ناقابل معافی جرم ہے۔

امیر لوگوں کو غربت کی چکی میں پستے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر یقیناً یہ احساس ہوتا ہے کہ اس معاشرے میں مجرم بڑھ گئے ہیں۔ کیونکہ ان کی نظر میں غربت کی سطح سے بھی نیچی زندگی گزارنے والا گندی نالی کا کیڑا ہے۔ جو غربت اور افلاس کی گود میں پل کر جوان ہوتا ہے اور پھر جرائم کی دنیا میں زہر پھیلا کر اس پُر امن معاشرے کے لیے زہریلا ناسور بن جاتا ہے اور ناسور سے ہمیشہ نفرت ہی کی جاتی ہے کیونکہ وہ لاعلاج ہوتا ہے۔

عصمہ خیالات کے تانے بانے بن رہی تھی۔ وہ ادھیڑ بن میں مبتلا تھی۔ ''کیا کرے؟''

اگر خالد کے مستقبل کی طرف دیکھتی تو سوچتی کہ احمد صاحب کی نوکری کر لینا چاہئے۔ کیونکہ اصل میں ''یتیم'' تو وہ تھا۔ عصمہ تو سمجھدار اور ماشاءاللہ اس کا بار اٹھا سکتی تھی۔ بس زندگی کے کسی بھی موڑ پر خالد یہ نہ کہے کہ اگر اس کے والدین زندہ ہوتے تو اسے کسی چیز کی کمی محسوس نہ ہوتی۔

اب خالد کی ماں اور باپ سبھی کچھ عصمہ تھی اور والدین بننے کے بعد ہر ماں باپ اپنی اولاد کی بہتری کے لیے ہی سوچتے ہیں اور ان کی خاطر اپنے جذبات و احساسات کی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ لہٰذا عصمہ نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے بھائی کے مستقبل کے لئے اپنی انا کو پس پشت ڈال کر ہر قربانی دے گی۔ وہ احمد کی فرم میں جاب کرنے کے لیے تیار ہو گئی تھی، لیکن سکول کی جاب ابھی نہ چھوڑنا چاہتی تھی۔ پتہ نہیں احمد کو کام پسند آئے یا نہ آئے۔ کیونکہ وہ تو اس فیلڈ میں بالکل اناڑی تھی۔

لیکن کام ناپسند والی بھی کوئی بات نہ تھی۔ کیونکہ احمد یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ عصمہ کو بزنس منیجمنٹ کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ پھر بھی اس نے عصمہ کو آفر کر دی تھی۔ وہ شاید ہر لمحہ اسے اپنے قریب دیکھنا چاہتا تھا، لیکن ابھی تک عصمہ کے دل میں کوئی جذبہ نہ جنم لے سکا تھا۔ جسے احمد کی ہمدردی کا ووٹ مل سکتا۔ یہ تو فاصلے کم ہونے پر ہی معلوم ہو گا۔

"میرے خیال میں ماں جی سے مشورہ کر لینا چاہیے۔" اس نے خود ہی خود سے بات کی۔ کیونکہ انہوں نے خالد کے سلسلہ میں اس کی بہت مدد کی تھی اور ویسے بھی وہ جہاندیدہ عورت تھیں۔

"لیکن ہر معاملے میں انہیں تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے؟" اس نے خود ہی اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ "ہر کسی کے اپنے بھی کئی مسائل ہوتے ہیں۔ اپنا کام ہے۔ خود ہی کرنا چاہیے۔" اس نے فرم میں جاب کرنے کی ٹھان لی تھی۔

اگلے دن اس نے سکول میں ایک ماہ کی چھٹی کی درخواست دے دی کہ وہ ضروری کام سے کہیں جا رہی ہے۔ لہٰذا اسے ایک ماہ کی رخصت مل گئی۔

وہ تیار ہو کر ایک عجیب سی گھبراہٹ کے ساتھ آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔

"یہ سب کچھ کس کے لیے کر رہی ہو؟" آئینے کے اندر بیٹھی ہوئی عصمہ نے باہر کھڑی عصمہ سے پوچھا۔

"خالد کے لیے۔" اس نے مختصر سا جواب دے کر اسے ٹرخانا چاہا۔ مگر پھر سوال کیا گیا۔

"اس نے تو تم سے کوئی تقاضا نہیں کیا۔ پھر یہ اتنی لمبی پلاننگ کیوں؟"

"وہ ابھی اتنی ہمت نہیں رکھتا۔"

"تمہارا احمد سے کیا رشتہ ہے؟"

"وہی جو ایک باس کا اپنے ورکر سے ہوتا ہے۔"

"ابھی تو وہ تمہارا باس نہیں بنا ہے۔ پھر اپنے آپ کو ورکر کیوں کہہ رہی ہو؟ ہو سکتا ہے وہ تمہیں ری جیکٹ کر دے۔"

"وہ مجھے ری جیکٹ نہیں کر سکتا۔" اس بار اس کا لہجہ کمزور سا تھا۔

"تم تو کبھی بے نقاب باہر نہ نکلی تھی؟"

"اس نے کہا ہے۔"

"صرف اس کے کہنے پر احکام سنت کی خلاف ورزی کرنے جا رہی ہو؟"

"میں ایسا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ مگر آج کے دور میں مجبوری ہے۔ خدا میری اس مجبوری کو اپنی رحمت سے دور کرے گا۔" وہ آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔ اتنے مہینوں بعد اس نے خود کو غور سے دیکھا تھا۔ حالانکہ جس کے لیے وہ خود کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ ابھی تک اس نے غور سے نہ دیکھا تھا۔

وہ گھر کو تالا لگا کر باہر نکل آئی۔ کارڈ اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ پتہ ایک بار پھر پڑھنے

کے بعد اس طرف جانے والی بس پر سوار ہو گئی اور متعلقہ بلڈنگ کے سامنے اتر کر دھڑکتے دل کے ساتھ اوپر کی جانب دیکھا۔ تقریباً دس منزلہ عمارت نے اس کی گردن ٹیڑھی کر دی تھی۔ وہ سنگ مرمر کے زینے طے کر کے مین گیٹ پر پہنچی تو چوکیدار نے اس کے لیے المونیم سے بنا ہوا شیشے کا دروازہ کھول کر اسے اندر جانے دیا۔ اندر داخل ہوتے ہی سامنے سنگ مرمر سے بنا ہوا کاؤنٹر تھا۔ جس کے پیچھے ایک نوجوان اور خوبصورت لڑکی کھڑی تھی۔ وہ سیدھی اس کی طرف بڑھ گئی اور کارڈ اس کے سامنے رکھ دیا۔

"فرمائیے میں آپ کیا خدمت کر سکتی ہوں؟" لڑکی نے خوبصورت مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا تھا۔

"مجھے احمد صاحب سے ملنا ہے۔" اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ وہ گھر سے مستقبل سنوارنے کے لیے جی کڑا کر کے نکل تو آئی تھی۔ مگر اتنی بڑی فرم اور پھر باس کا یہ دعویٰ کہ وہ اسے چاہتا ہے اسے نروس کرنے کے لیے کافی تھا۔

"آپ کا نام۔" مختصر سا عام سا سوال۔

"عصمہ۔" مختصر سا عام سا جواب تھا۔

"آپ ایسا کریں۔ یہاں سے دائیں ہاتھ راہداری میں چلی جائیں۔ آخری سرے پر بائیں ہاتھ پر احمد صاحب کا آفس ہے اور وہ اس وقت فارغ ہی ہوں گے۔" لڑکی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بتایا۔ وہ کارڈ پکڑے راہداری میں چل پڑی۔ بلڈنگ باہر سے جتنی خوبصورت تھی۔ اندر سے بھی اتنی ہی شاندار تھی۔ بنانے والے کی نفاست ہر رنگ سے جھلک رہی تھی۔ وہ ڈری ڈری اور سہمی ہوئی راہداری کے آخر میں پہنچی تھی۔ اس نے بائیں ہاتھ کے آخری کمرے کو دیکھا جسے آفس کی شکل دی گئی تھی، لیکن شیشے ہی ایسے تھے کہ باہر سے کچھ بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے پر دستک دی، لیکن اندر سے کوئی آواز نہ پا کر وہ مزید پریشان ہو گئی۔ اس نے دوسری بار دستک دی۔ مگر ہنوز جواب ندارد والی بات تھی۔ وہ کانپتے ہاتھوں سے دروازے کے ہینڈل کو گھما کر اندر داخل ہوئی۔ اس کی حیرت سے زبان اور ذہن ماؤف ہو کر رہ گئے کمرا گلاب کے پھولوں سے مہک رہا تھا۔ خوبصورت ٹیبل پر رکھے گئے گلدان میں تازہ پھولوں کی مہک نے اور کمرے کی خوبصورتی سے سجی ہوئی ہر چیز نے عصمہ کو سحر میں مبتلا کر دیا تھا۔ نفاست اور ہر اچھی چیز کی قدردانی نے اس کمرے کے مکین کو بہت واضح طور پر عصمہ کے سامنے واضح کر دیا تھا، لیکن ہنوز کمرے میں کوئی بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ ریوالونگ چیئر بھی خالی پڑی ہوئی تھی۔

لیکن نہ جانے اسے یہ احساس کیوں ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی ابھی ابھی اس کمرے سے اٹھ کر گیا ہو، اور دو آنکھیں مسلسل اسے دیکھ رہی ہوں۔ مگر ایسا کچھ بھی نہ تھا۔ اس نے کمرے کے چاروں طرف دیکھ لیا تھا۔ کوئی ذی روح اسے نظر نہ آ رہا تھا۔ ٹیبل کے داہنی طرف ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ جو کہ غالباً ٹوائلٹ ہوگا، ہو سکتا ہے کمرے والا ٹوائلٹ میں ہو۔ وہ اِدھر اُدھر نظر دوڑاتی ہوئی۔ ٹیبل کے سامنے پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی گھبراہٹ اور پریشانی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

اسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ اتنی دیر میں کمرے سے ملحقہ دروازہ کھلا اور اندر داخل ہونے والے کو وہ پہچان گئی۔ وہ وہی لڑکا تھا جو اسے موٹر بائیک پر دیکھنے آتا تھا اور خط بھی لکھتا تھا۔ آج تو عصمہ اس کی شخصیت دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ وہ گرے سوٹ میں ملبوس پرکشش اور باوقار لگ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ٹیبل کے دوسری طرف رکھی ہوئی ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گیا۔ اب عصمہ اور وہ ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ مگر عصمہ کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ جبکہ اس کی نگاہیں مسلسل عصمہ کے خوبصورت چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔ کتنے لمحات ایسے ہی گزر گئے۔ وہ شرم و حیاء سے دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ وہ سمجھ نہ پا رہی تھی کہ کیا بات کرے حالانکہ وہ سائل بن کر آئی تھی، لیکن کسی کی نگاہوں کا مرکز بن کر رہ گئی تھی۔

اس کے کھنکارنے کی آواز پر وہ بھی سنبھل کر بیٹھ گئی۔

میری سوچ میری طلب کا محور ہے تُو
منزلیں قریب ہیں کہ میرا ہمسفر ہے تُو

روشنی تجھ سے مانگیں یہ سورج چاند ستارے
ایسی چمک اور ایسا روپ نگر ہے تُو

فقط آنکھوں کی گہرائی ہی مات جھیل کو دیدے
اے مجسمہ حسن خود سے ہی بے خبر ہے تُو

احمد کی آواز نے اس کے گالوں پر مزید سرخی بکھیر دی تھی۔ اس کی شاعری کا مرکز اور محور عصمہ ہی تھی۔ گھر پوسٹ کیے جانے والے خط میں بھی اس نے عصمہ کے حسن کی تعریف کی تھی اور اپنی خواہشات کا بھی اظہار کیا تھا۔ وہ ایک بڑا بزنس مین تھا اور شاعری بھی کرتا تھا۔ کرتا تو چاہے نہ ہو۔ مگر شغف ضرور تھا۔

اَن دیکھے حسن کو دیکھا تو دیکھا نہ گیا
وہ بھی چاہتے تھے کچھ پر بولا نہ گیا

''جی! فرمائیے۔ میں آپ کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' غالباً احمد کی سمجھ میں بھی نہ آ رہا تھا کہ وہ بات کہاں سے شروع کرے۔ حالانکہ اس نے خود ہی عصمہ کو جاب کے لیے آفر کیا تھا۔ اسے گمان بھی نہ تھا کہ وہ اتنی حسین ہوگی۔ اس کا بھی نروس بریک ڈاؤن ہو رہا تھا۔

عصمہ نے وہ کارڈ اور اپنی اسناد احمد کے سامنے رکھ دیں۔ ''مجھے اس فرم میں جاب کے لیے آفر کیا گیا ہے۔'' اس نے ہمت کر کے بات کہہ دی۔

''جس نے آپ کو آفر کیا ہے۔ اس نے آپ کی اسناد اور قابلیت کی بنا پر آفر نہیں کیا۔'' احمد نے اس کی اسناد اور کارڈ کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا اور ہاتھ سے اس کی طرف دھکیل دیا۔ ''نہ ہی آپ کو کام کے لیے آفر کیا گیا ہے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ کو مارکیٹنگ اور بزنس مینجمنٹ کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔''

''لیکن میرے آفر لیٹر میں اس چیز کی کسی بھی اہمیت کا ذکر نہیں ہے۔'' وہ سہمے ہوئے انداز میں بولی۔ ایک بار تو اسے ایسا لگا کہ وہ غلط جگہ پر آ گئی ہے، لیکن دل کی بے قابو دھڑکن کہہ رہی تھی کہ وہ صحیح جگہ پر صحیح وقت پر پہنچ گئی ہے۔ وہ کچھ توقف کے بعد بولی۔

''اگر مجھے کسی کام کے لیے آفر نہیں کیا گیا تو...... پھر میرا کیا کام؟'' وہ اٹھ کر اپنی اسناد اور دوسرے ڈاکومینٹس سمیٹنے لگی۔

''ابھی میری بات ختم نہ ہوئی اور یہ خلافِ اصول ہے کہ آپ میری پوری بات نہ سنیں۔'' وہ بھی اس کی اس حالت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ''پلیز تشریف رکھیں۔''

وہ چار و ناچار بیٹھ گئی اور شکر کرنے لگی کہ ابھی سکول کی نوکری نہیں چھوڑی تھی۔ ورنہ گھر کا چولہا بالکل ہی بند ہو جاتا۔

''کیا لیں گی آپ؟...... چائے۔ کولڈ ڈرنک۔ کافی یا پھر کچھ اور۔''

''پلیز سر......؟'' اس کی پیشانی پر نمودار ہونے والے پسینے کے قطروں نے اسے مزید نروس کر دیا تھا۔

''میں آپ کا سر نہیں ہوں؟'' اس نے مختصر جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی انٹرکام کی گھنٹی نے احمد کو متوجہ کیا۔ دوسری طرف سے کچھ بات سن کر اس نے او کے کہہ کر فون رکھ دیا۔

''آئیے پلیز......'' وہ کرسی سے اٹھتا ہوا بولا اور اس نے کمرے میں ملحقہ دروازے

کی طرف اشارہ کیا، تو عصمہ نہ سمجھنے والے انداز میں اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگی۔

''آپ کے ذہن میں شاید یہ ٹوائلٹ کا دروازہ ہے۔'' وہ خوبصورت انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''مگر ایسا کچھ نہیں ہے۔ ٹوائلٹ کا دروازہ آپ کے پیچھے ہے اور پردے کے پیچھے ملحقہ دیوار پر ہے۔''

عصمہ چاروناچار اٹھ کر اس کی پیروی میں اس چھوٹے سے دروازے سے داخل ہوئی تو حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بلکہ اسے خوف تھا کہ اس کی آنکھیں شدتِ حیرت سے پھٹ ہی نہ جائیں۔ وہ ایک بہت بڑے ہال کمرے میں تھی۔ جس میں دونوں طرف بڑی بڑی اونچی میزیں پڑی ہوئی تھیں۔ فرم کے تمام ورکرز اور پورا عملہ وہاں پر حاضر تھا۔ اس نے اپنے آپ کو دیکھا تو وہ ایک سٹیج نما جگہ پر کھڑے تھے۔ جبکہ باقی تمام لوگ چندفٹ نیچے تھے۔ ان کے پاؤں کے نیچے دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ عصمہ انہی سوچوں میں گم تھی کہ اس کے سر پر پھولوں کی پتیوں کی بارش ہونے لگی۔ اس نے اوپر کی طرف دیکھا تو یوں لگتا تھا کہ کوئی چھت پر سے پھول برسا رہا ہے۔ وہ اس استقبال اور طریقے کے لیے تیار نہ تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہال میں کھڑے عملہ کے تمام لوگوں نے تالیاں بجا کر اسے ''خوش آمدید'' کہا۔ اس نے گھبرا کر احمد کی طرف دیکھا۔ تو اس نے کورنش بجانے والے انداز میں تھوڑا سا جھک کر اس کی حیرت کو دوچند کیا۔

اب پتیاں برسنا بند ہو گئی تھیں۔ وہ حیرت واستعجاب کی تصویر بنی وہیں کھڑی تھی۔ جبکہ احمد آگے بڑھ کر اس کے پہلو میں آ کھڑا ہوا۔ کسی ورکر نے ان کی بہترین تصویر بنالی۔ عصمہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ مگر وہ مسکرا رہا تھا۔

''ساتھیو! آپ کو معلوم ہے کہ اس فرم کو ایک ہونہار اور باصلاحیت مینیجر کی ضرورت تھی۔ مس عصمہ اس ڈیمانڈ پر پوری اترتی ہیں۔ لہٰذا آج سے یہ آپ کی میرا مطلب ہے کہ شیخ عمر حیات انٹر پرائزز کی مینیجر ہوں گی اور مظہر حسین جیسے قابل اور ہونہار شخص کی بدولت اس فرم کی تعمیر و ترقی میں بھرپور کردار ادا کریں گی۔ آپ سب کا بہت بہت شکریہ۔

وہ دوبارہ احمد کے ساتھ اسی دروازے سے واپس آفس میں آ گئی تھی۔ وہ اپنے استقبال اور احترام کو زندگی بھر نہ بھلا سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمکنے والے آنسو شاید احمد نے بھی دیکھ لیے تھے۔

''جب عزت اور ذلت اللہ کی طرف سے ہے۔ رنج اور راحت بھی اللہ کی طرف سے ہے۔ تو ہمارے پاس تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ جاتا۔'' احمد نے اسے ٹشو بکس

سے ٹشو پکڑاتے ہوئے کہا۔ ''اپنے ان آنسوؤں کو پونچھ لو۔ مس عصمہ یہ کمزور لوگوں کی علامت ہے۔ جو پوجے جائیں وہ رویا نہیں کرتے۔ بلکہ غرور سے سر اٹھا کر جیتے ہیں۔''

عصمہ نے استفسار نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں نے آپ کو اس فرم میں کوئی جاب نہیں دی ہے بلکہ آپ کی نوکری کی ہے۔'' وہ مسکرانے لگا۔ ''آپ بھی حیران ہوں گی۔ کیونکہ میں ہر روز آپ کو خود سے پہلے آفس میں موجود دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں میں اس کی پوجا کروں جو سب کو دکھائی دے۔ بس یہی میری آفر ہے۔ آپ کو اس کام کی حیرت انگیز سیلری اور سہولتیں مل جائیں گی۔''

عصمہ حیرت کی تصویر بنی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ یقین بھی نہیں کر سکتی تھی کہ کوئی اسے اس طرح ٹوٹ کر بھی چاہتا ہوں گا۔ اس حد تک بھی جائے گا کہ اس کی پرستش کرنے لگے گا۔ وہ تو خود انسان تھی۔ خود کو گناہگار نہ کرنا چاہتی تھی۔

''آپ نے مجھے پہچانا کیسے؟'' عصمہ نے نظریں بدستور نیچی ہی رکھی ہوئی تھیں۔

''کسی نے کہا ہے نا کہ ''Love Begest Love'' وہ خود پر اترا رہا تھا اور کیوں نہ اتراتا اس کا من چاہا اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ ہمیشہ کے لیے نہ سہی۔ کچھ دیر کے لیے ہی سہی۔ ''ہمارے مینیجر مظہر حسین صاحب......روزانہ آپ کے گھر کے باہر ڈیوٹی دیا کرتے تھے۔ آج آپ کے گھر سے نکلنے سے یہاں تک انہی کا کمال ہے۔ انہی کی اطلاع پر آپ کے شاندار استقبال کا اہتمام کیا گیا تھا۔'' اس نے عصمہ کی الجھن حل کر دی۔

''مجھے کیا کرنا ہوگا سر؟''

''صرف میرے لیے جینا ہوگا۔'' وہ مخمور سے لہجے میں بولا۔ ''میں سوالوں جوابوں میں وقت برباد کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ مس عصمہ آپ کو ابھی بتا رہا ہوں کہ اب میری زندگی مکمل ہونے والی ہے۔ آپ کی آمد نے میرے وجود کے مکمل ہونے کی تصدیق کر دی ہے۔ میں تم سے عشق کرتا ہوں۔ اسے میری خودغرضی سمجھ لو یا میری محبت کی انتہا۔ اس سے بہتر طریقہ میرے پاس کوئی نہ تھا۔''

''عشق تنخواہ دے کر نہیں حاصل کیا جاتا۔''

''تنخواہ آپ کو آپ کی قابلیت کی ملے گی۔''

''لیکن میرے پاس تو کوئی بھی جواز نہیں ہے کہ میں آپ کی فرم میں بطور قابل ورکر کام کرتی رہوں۔''

''آپ کی یہی قابلیت ہے کہ آپ نے مجھے لاجواب کر دیا ہے۔'' فون کی گھنٹی نے

اسے ایک بار پھر اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور کچھ سننے کے بعد ''اوکے'' کہہ کر رکھ دیا۔

''اگر آپ بُرا نہ منائیں تو لنچ میرے ساتھ کیجئے۔'' اس نے اٹھتے ہوئے اپنا دایاں ہاتھ عصمہ کی طرف بڑھا دیا۔ بہت سوچ بچار کے بعد لرزتے ہوئے اور دھڑکتے دل کے ساتھ عصمہ نے بھی اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ احمد نے عصمہ کا ہاتھ تھاما تو گویا میٹھی خماری سے اس کی روح سرشار ہوگئی ہوگی۔ دل دھڑک گیا۔ ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ ہاتھ لرز رہے تھے، لیکن ایک دوسرے کا ساتھ مانگ رہے تھے۔

کتنا خوش قسمت ہوتا ہے وہ انسان۔ جسے من چاہی مراد مل جائے۔ بغیر کسی تگ و دو کیے گریبان چاک کیے بغیر اور بغیر ونجلی بجائے ہی اسے من کا میت مل گیا تھا۔ وہ اس عطا پر دل ہی دل میں رب کریم کے حضور جھک گیا تھا۔ یہی کیفیت عصمہ کی تھی۔ اسے اس بات کی خوشی اور خماری تھی کہ اسے چاہنے والا صرف اسے چاہتا ہی نہیں ہے۔ بلکہ اس کی پرستش بھی کرتا ہے۔

شاندار گاڑی میں وہ فرنٹ سیٹ پر احمد کے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔ عجیب سے نشے میں ڈوبی ہوئی عصمہ اپنی قسمت پر رشک کر رہی تھی کہ ایسی گاڑیاں اس نے صرف سڑکوں پر ہی دیکھی تھیں۔ اندر سے پہلی بار دیکھ رہی تھی۔ بلکہ وہ اس گاڑی میں سوار بھی تھی۔ اس کی خوشی دوچند تھی۔ وہ ایک مہنگے ترین ہوٹل کی پارکنگ تھی۔ جب وہ گاڑی سے اتری۔ دروازہ احمد نے کھولا تھا۔ اس نے ''شکریہ'' کہہ کر نگاہیں جھکالی تھیں۔ وہ احمد کے ساتھ چلتی ہوئی ہوٹل کے مین گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جبکہ اندر سے تیزی سے نکلنے والا شخص احمد سے ٹکرا کر گر گیا۔ وہ ہوٹل کے مین انٹرنس پر کھڑے تھے۔ گرنے والے شخص کو احمد نے آگے بڑھ کر اٹھایا تو عصمہ کی تو اسے دیکھ کر حیرت سے چیخ نکل گئی۔ جبکہ احمد نے اسے اٹھا کر نفرت سے پرے دھکیل دیا۔ گرنے والے نے احمد کی نفرت کا جواب تو نہ دیا۔ بلکہ عصمہ کی طرف حیرت سے دیکھتا رہ گیا۔ احمد اور عصمہ اندر داخل ہو چکے تھے۔ جبکہ گرنے والا اغفران باہر ہی سیڑھیوں پر متعجب کھڑا تھا۔ وہ عصمہ کو احمد باؤ کے ساتھ دیکھ کر اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔

☆======☆======☆

سید رشید حسین بخاری اپنی حویلی میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے گرد مریدین کا ہجوم تھا۔ وہ اپنی طبیعت اور سادگی کے باعث حسب معمول مریدین کے ساتھ ہی زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لوگ ان سے دینِ اسلام کے متعلق سوالات کر رہے تھے اور وہ احادیث مبارکہ کی روشنی میں ان کے جوابات دے رہے تھے۔ کوئی بیماری سے تندرست ہونے کے

لیے دعا کروا رہا تھا۔ کوئی کاروبار میں خیر و برکت کے لیے اللہ کے حضور شاہ جی سے التجا کروا رہا تھا۔ غرض کہ طرح طرح کے مسائل تھے۔ جن کا وہ ہر روز مناسب اور بہترین جواب دیا کرتے تھے۔ لوگوں کو ان کی پریشانیوں کا حل قرآن حکیم کی روشنی میں بتاتے تھے۔ لوگ فیض کی جھولیاں بھر کر ان کی حویلی سے جایا کرتے تھے۔

''شاہ جی!'' ایک مرید آگے بڑھا۔ اس نے عقیدت سے شاہ صاحب کے ہاتھوں کو چومنا شروع کر دیا۔

''اپنا مسئلہ بیان کرو۔'' شاہ صاحب نے ذرا سے تردد کے بعد اپنے ہاتھ پیچھے کھینچ لیے۔ ''مجھے اس دکھاوے اور چاپلوسی سے نفرت ہونے لگتی ہے۔''

''شاہ جی! میرا مسئلہ بہت سنگین ہے۔'' اس آدمی کے لہجے میں ڈر اور خوف کا عنصر نمایاں تھا۔

''اپنی بات کہو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری پریشانی دور کرے گا۔''

''شاہ جی! گزشتہ ہفتے میں نے دوستوں کی صحبت میں بیٹھ کر شراب پی لی ہے۔'' لوگ اس کی بات سن کر اسے دیکھنے لگے۔ ''حدیث کی رو سے میرے لیے کیا حکم ہے؟'' وہ آدمی رونے لگا تھا۔

''کیا تمہیں علم تھا کہ جو مشروب تمہیں پلایا جا رہا ہے، وہ شراب ہے؟'' شاہ جی نے پوچھا۔

''نہیں سرکار!'' اس نے روتے ہوئے جواب دیا۔ ''مجھے تب پتہ چلا جب میں ہوش وحواس سے بیگانہ ہو گیا تھا۔''

''اللہ بڑا غفور ورحیم ہے۔'' شاہ جی نے کہنا شروع کیا تو لوگ ان کی طرف مزید متوجہ ہو گئے۔ ''حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے دنیا میں شراب پی اور پھر توبہ نہ کی۔ وہ آخرت میں شرابِ طہورہ سے محروم رہے گا۔'' شاہ جی کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئے۔

''رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم معراج کی شب جب بیت المقدس کے مقام پر تھے تو آپؐ کی خدمت میں دو پیالے پیش کیے گئے۔ جب آپؐ نے ان کی جانب توجہ فرمائی تو ان میں سے ایک میں دودھ تھا اور دوسرے میں شراب تھی۔ آپؐ نے دودھ کا پیالہ لے کر نوش فرما لیا تو حضرت جبرائیل علیہ السلام عرض گزار ہوئے کہ سب تعریفیں اس خدا کے لیے ہیں جس نے فطرت کی جانب آپؐ کی راہنمائی کی۔ آپ کو ہدایت فرمائی۔ اگر شراب کا پیالہ لیتے تو آپ کی

امت گمراہ ہو جاتی۔'' کچھ توقف کے بعد شاہ جی پھر بولے۔'' حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی حدیث سنی ہے جو تمہیں میرے سوا کوئی نہیں بتا سکتا۔فرماتے ہیں کہ قیامت کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ علم گھٹ جائے گا۔ جہالت غالب آ جائے گی۔زنا عام ہو جائے گا اور شراب بھی پی جائے گی۔مردوں کی قلت اور عورتوں کی کثرت ہو گی یہاں تک کہ پچاس عورتوں کا نگران ایک مرد ہو گا۔'' یہ کہہ شاہ جی رک گئے۔وہ شخص مسلسل رو رہا تھا۔جبکہ حاضرین پر بھی سکتہ طاری ہو گیا تھا۔

''اگر تم نے جان بوجھ کر شراب نہیں پی۔پھر بھی رب کریم کے حضور سجدہ ریز ہو کر دل کی گہرائی سے توبہ کرو۔میں بھی تمہارے لیے دعا کروں گا۔وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔تمہیں اپنے گناہ کا احساس ہونا ہی کافی ہے۔جاؤ اللہ تم پر رحمت کرے گا۔''

شاہ جی پھر لوگوں کو مسائل اور ان کے حل کے متعلق بخاری شریف کی جلدوں کا حوالہ دے کر سمجھانے لگے۔اسمٰعیل بدستور شاہ جی کے کندھے دبانے کے لیے اپنا معمول انجام دے رہا تھا۔لوگوں نے بہت کم دیکھا تھا کہ وہ کسی سے بات کرتا ہو۔بس وہ کبھی کبھار مدحتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کرتے ہوئے اپنے آنسوؤں پر قابو نہ رکھ سکتا تھا۔لوگوں نے اسے اس کیفیت میں ہی روتے ہوئے دیکھا تھا۔انہوں نے کبھی بھی اس کے علاوہ اسے اور کسی کیفیت میں نہ دیکھا تھا۔شاہ جی کوئی بھی کام کہہ دیتے وہ بلا چوں و چرا فوراً اس کام کو انجام دینے میں مصروف ہو جاتا تھا۔لوگ اسے شاہ جی کی پہچان سے ہی جانتے تھے اور باقی تمام مرید بھی ایک دوسرے کو اسی حوالہ سے جانتے تھے کہ وہ شاہ جی کے مرید ہیں اور آپس میں پیر بھائی ہیں۔کیونکہ اگر اینٹوں میں ربط نہ ہو تو دیوار کو اپنے ہی بوجھ سے گرنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔اسی طرح شاہ جی نے بھی اپنے مریدین کو ایک دوسرے کے لیے دکھ سکھ میں کام آنے کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔جو امیر اور صاحب حیثیت مرید تھے۔شاہ جی کے فرمان کے مطابق وہ اپنے غریب پیر بھائیوں کی ''خدمت'' کر دیتے تھے۔کیونکہ عبادت اس مقام اور مرتبے تک نہیں پہنچا سکتی جس پر آپ کو غریب کی خدمت پہنچا دیتی ہے۔شاہ جی مجمع سے اٹھ کر جانے لگے تو لوگ بھی احتراماً اٹھ کر کھڑے ہو گئے،لیکن انہوں نے اشارے سے سب کو بیٹھنے کا کہا اور خود اندر حویلی کی طرف بڑھ گئے۔اندر زنان خانے میں بھی عورتوں کے مسائل سننے تھے۔

☆======☆======☆

غفران اس وقت عظیم الشان ہوٹل کے ایک کمرے میں شیخ عمر حیات کے سامنے بیٹھا

تھا۔اس نے صبح ہی فون کر کے شیخ عمر حیات کو آگاہ کر دیا تھا کہ وہ اس کے خلاف تمام ثبوت لے کر عدالت میں جائے گا۔کیونکہ اسے متعلقہ تھانہ پر اعتماد نہیں ہے۔شیخ عمر حیات نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ جواب میں غفران نے اسے دو پہر کو اس ہوٹل میں ملنے کو کہا تھا۔اب وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ایک باس اور ورکر کی حیثیت نے اب دشمن داری کا روپ دھار لیا تھا۔اس ہوٹل میں ملاقات کے لیے غفران نے یہ وجہ بیان کی تھی کہ شیخ عمر حیات اکثر اس جگہ آتا رہتا ہے اور غفران بھی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔

منیجر نے غفران کی شکل دیکھتے ہی اسے کمرا آفر کر دیا تھا۔

''تم نے بہت زیادتی کی ہے۔''غفران نے پہل کی۔''اگر میرے علم میں ہوتا کہ تم انتہائی گھٹیا الزام سے میری کھال اتروا دو گے تو یقین کرو میں تمہاری نام نہاد فیکٹری کو آگ نہ لگاتا بلکہ ان تمام خفیہ اڈوں کو راکھ بنا دیتا جو میری نظر میں ہیں اور اگر ایسا ہو جاتا تو شیخ عمر حیات سڑکوں پر بھیک مانگ رہا ہوتا۔''اس کے اندر کی گرمی اس کے لہجے میں نمایاں تھی۔

''ابھی تک ماں نے کوئی ایسا لال نہیں جنا جو شیخ عمر حیات کو بھیک منگوا سکے۔''وہ بھی غصہ میں آگ بگولہ ہو رہا تھا۔''تم کیا ہو؟ تمہاری اوقات اور حیثیت میری نظر میں ایک کمزور مچھر کی سی ہے۔''وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔شاید اپنے جذبات پر کنٹرول نہ کر سکا تھا۔

''تحمل اور سکون سے بیٹھو شیخ۔''غفران بدستور پُرسکون تھا۔''مجھے مچھر کہہ کر خود کو نمرود ثابت کر دیا ہے۔تم دیکھنا ایک دن یہی کمزور مچھر تمہاری ناک میں گھس کر اس معاشرے سے تمہیں ''چھترول'' کروائے گا۔''

''میں کہتا ہوں کہ......'' شیخ نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے اپنی کہنا چاہی۔ مگر غفران نے غصہ سے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا۔

''میری بات پوری ہونے سے پہلے اپنی کہنے والے بہت کم ہیں۔''وہ پھر بولا۔ ''میں کہہ رہا تھا کہ جب تمہیں چھترول ہو گی۔تمہارا یہ نام نہاد اور ڈھونگی ''پیر'' تمہیں بچانے نہیں آئے گا۔بلکہ یہ بھی تمہاری ایسی چھترول کرے گا کہ تمہاری نانی کی بھی نانی تمہیں یاد آ جائے گی۔''

شیخ اپنے غصہ پر قابو کرنے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔''پر نکلنے سے پہلے ہی جو اڑنا چاہے۔وہ بہت جلد تھک کر گر جاتا ہے اور ویسے بھی ''پر'' ہوں یا نہ ہوں۔رفتار اتنی رکھنی چاہئے کہ سانس نہ پھولے۔شیخ عمر حیات کے گریبان پر ہاتھ ڈالنے کے لیے پہلے اپنا قد اس کے برابر کر لو۔''وہ مسکرانے لگا تھا۔شاید غصہ پر قابو پا کر وہ بھی غفران کو لفظی جنگ میں مات

دینا چاہتا تھا۔

''آسمان پر نگاہ رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مگر یہ تو سوچو کہ پاؤں زمین پر ہی رکھتے ہوں گے۔'' غفران بھی پڑھے لکھوں جیسی باتیں کر رہا تھا۔ شیخ کی صحبت کا اثر تھا۔ یا پھر اس کا پالا ایک ذہین اور پہنچ والے دشمن سے پڑا تھا۔

''میری اور تمہاری لڑائی یہی ہے غفران؟'' شیخ نے پینترا بدلا۔ ''تم کہتے ہو کہ وہ پیر جعلی ہے۔ دھوکا ہے، فراڈ ہے، ایک ڈھونگ ہے اور میں کہتا ہوں کہ وہ ایک نیک اور برگزیدہ بندہ ہے۔ اگر وہ دھوکا اور ڈھونگ ہوتا تو مجھے کاروبار میں ہونے والا نفع کئی گنا نہ بڑھ جاتا۔ اس کا مطلب ہے کہ مجھے جو کچھ بھی ملا ہے اس پیر کی بدولت ہی ملا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ کوئی اس کی میرے سامنے برائی کرے اور میں خاموش رہوں۔'' یہ کہہ کر وہ کچھ توقف کر کے پھر بولا۔ ''میں تمہاری خطا اور تمہارا قصور آج بھی معاف کر سکتا ہوں۔ اگر تم اپنی غلطی کی بابا جی سے جا کر معافی مانگ لو۔ بس! میری اور تمہاری لڑائی ختم۔''

''غفران آنکھوں دیکھی مکھی نہیں کھایا کرتا۔ یاد رکھنا شیخ، ایک دن یہ بابا جی تمہاری ایسی دکھتی رگ دبائے گا کہ تم چیختے رہ جاؤ گے۔ مگر تمہاری چیخیں سننے والا کوئی نہیں ہوگا۔'' غفران نے اپنا دھیما لہجہ تیز کر دیا تھا۔

''میں یہاں کوئی تبلیغ کرنے نہیں آیا ہوں۔ میری بات غور سے سنو۔'' غفران کی بات پر شیخ کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ غفران کو چڑانے والے انداز میں اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔

''جی فرمایئے غفران صاحب۔ بلکہ حاجی غفران صاحب۔''

''ایک مرتد اور منکر کے منہ سے نکلا ہے تو اللہ تعالیٰ مجھے حج بھی کروائے گا۔''

''غفران! اپنی زبان کو لگام دے کر بات کرو۔ میں تمہارے باپ کا ملازم نہیں ہوں کہ تمہاری بکواس سننے کے لیے اپنا قیمتی وقت ضائع کروں۔ جو بھی بکنا ہے۔ فوراً بکو۔ ورنہ میں جا رہا ہوں۔''

شیخ عمر حیات اس کے منہ سے اپنے لیے اتنے سخت الفاظ کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ کچھ بھی تھا وہ تھا تو آخر اس کا ملازم ہی۔

''یہ بات تم بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ اب میں بھی تمہارا ملازم نہیں ہوں۔'' غفران بھی غصے میں آ گیا تھا۔ ''میں نے تمہارا جتنا بھی نمک کھایا تھا۔ وہ میں نے ایک رات تھانے میں گزار کر ان کی مار کھا کر حقِ نمک ادا کر دیا ہے۔ تمہارے خلاف اب تک میری

زبان اگر بند تھی تو اس کی وجہ تمہاری اپروچ تمہارے تعلقات اور تمہارا خوف نہ تھا۔ بس وہی حقِ نمک تھا جو میں نے ادا کر دیا ہے۔ اب اپنے جتنے بھی گندے اور غلط کام ہیں۔ وہ فوراً بند کر دو۔ ورنہ تم غفران کو اچھی طرح جانتے ہو۔ وہ کسی کو تباہ کرنے پر آ جائے تو کوئی تعلقات اور اپروچ اس کے دشمن کو اس کے قہر سے نہیں بچا سکتی۔''

''تمہاری اتنی جرأت ہو گئی کہ تم مجھے آنکھیں دکھانے لگے ہو۔ تم جو کہ نالی کے گندے کیڑے کی سی حیثیت رکھتے ہو۔ میرا مقابلہ کرو گے۔ مجھے تباہ و برباد کرو گے۔ جانتے ہو تم جیسے بے غیرت اور گھٹیا خون کو شیخ عمر حیات منہ لگانا پسند نہیں کرتا۔'' غصے کی شدت سے اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ ''تمہاری اتنی اوقات ہی نہیں ہے کہ تم مثبت سوچ رکھو۔ جو کرنا ہے کر لو۔ غفران مسکرانے لگا تو شیخ کا پارہ مزید چڑھ گیا تھا۔

''اپنے لیے کسی دردناک عذاب کو مت پکارو۔ تم میرے مرشد کی توہین کر رہے ہو، لیکن تم جانتے نہیں ہو۔ وہ بہت پہنچی ہوئی ہستی ہے۔'' شیخ عمر حیات غصہ سے بولا۔

''شیخ صاحب! سرکلر روڈ پر بنے ہوئے دانش پلازہ کے تہہ خانے کو جو سرنگ ایک گراؤنڈ سے جاتی ہے۔ اسی سے ابتدا کروں گا۔ تمہیں پیشگی وارننگ دے رہا ہوں۔ اپنا بچاؤ کر لینا اور میں نے جو بھی تمہارے ساتھ وقت گزارا ہے۔ یقیناً غلط اور گناہ کا وقت تھا۔ تم نے حج کی بات کی ہے۔ اگر اللہ نے موقع دیا تو وہاں جا کر توبہ ضرور کروں گا۔'' غفران باہر نکلنے لگا تو شیخ کی آواز سنائی دی۔

''توبہ کا خیال اچھا اور نیک ہے، لیکن جو آدمی اپنے گناہوں پر شرمندہ نہ ہو اس کی توبہ اس پر شرمندہ ہو جاتی ہے۔ ٹھہرو۔ ایک موقع اور دیتا ہوں۔ سوچ لو۔ اس کے بعد میری اور تمہاری دشمنی پکی۔''

''میری طرف سے کوئی موقع نہیں ہے۔ بس اپنے دفاع کی تیاری کر سکتے ہو تو کر لو۔'' یہ کہہ کر غفران تیزی سے کمرے سے نکلا تھا اور وہ غصے کی حالت میں ہی باہر احمد باؤ سے ٹکرا گیا تھا۔

وہ عصمہ کو سمجھانا چاہتا تھا۔ مگر کس رشتے اور کس حوالے سے؟ کیوں سمجھانا چاہتا تھا؟ وہ خود نہیں جانتا تھا، لیکن ایک اچھی لڑکی کو ایک بُرے لڑکے کے ساتھ دیکھ کر اسے دکھ ہوا تھا۔ اس نے وہ کام پھر کبھی پر چھوڑ دیا تھا۔ پہلے تو اسے شیخ عمر حیات کے ایک ٹھکانے پر ریڈ کروانا تھا، لیکن اسے کسی بھی تھانہ میں کوئی ایسا آدمی نظر نہ آ رہا تھا جو شیخ نے نہ خرید رکھا ہو۔ وہ شیخ عمر حیات کو دھمکی تو دے آیا تھا، لیکن اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اسے کافی ساری مدد درکار تھی اور

جتنا بھی وقت صرف ہو رہا تھا۔ اس میں غفران کا نقصان اور شیخ کا فائدہ ہو رہا تھا۔

اس نے اپنے دماغ کے گھوڑوں کی ریس لگا دی تھی۔ اسے کیا کرنا چاہئے کہ شیخ اپنا مال وہاں سے نہ نکال سکے اور وہ اسے جلا کر راکھ کر دے۔ کیونکہ وہ اس الزام کی سزا بھگت چکا تھا۔ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا ازالہ کرنے کے لیے اس کے پاس سنہری موقع تھا۔ اس نے شیخ عمر حیات کے ساتھ مل کر گھر گھر اور گلی گلی جس طرح اس زہر کو رگ رگ میں خون کی بجائے دوڑایا تھا۔ اسے خود پر افسوس ہو رہا تھا۔ پچھتاوا ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو لعن طعن کرنے لگا۔ اس کا ذہن مسلسل سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ چلتا چلتا کافی دور نکل آیا تھا، لیکن ذہن اور دماغ ابھی تک کوئی بھی گتھی نہ سلجھا سکے تھے۔

''بدی کی تلاش ہو تو اپنے اندر جھانکو۔ نیکی کی تمنا دل میں ہو تو دوسروں کو ڈھونڈ کر اس میں شامل کرو۔'' اس کے نہاں خانوں میں کہیں دور سے شاہ صاحب کی آواز آئی۔ وہ چونک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ مگر یہ اس کا خیال تھا۔

نیکی کے اس رستے پر چلنے کے لیے کون میرا ساتھ دے گا؟

''کوئی بھی نہیں۔'' ایک اور آواز آئی۔ ''کیونکہ تم نے بھی تو کسی کا ساتھ نہیں دیا ہے۔'' یہ اس کے اندر کی آواز تھی۔ جو یقیناً ملامت کر رہی تھی۔

''عقل کے اندھے بن کر تم اپنی ماں کی باتیں، شاہ صاحب کی باتیں سنی اَن سنی کرتے رہے اور آج دھڑام سے زمین پر گر گئے ہو تو تمہیں یہ بھی خوف ہے کہ کل جس آسمان کو چھونے کی کوشش میں ''میں'' اوپر ہی اوپر بڑھتا رہا۔ ہولوں اور ظلم کی آندھی کے سنگ اڑتا رہا۔ آج زمین پر دھڑام سے گرا ہوں تو خوف آتا ہے کہ کہیں نیلا آسمان بھی میرے اوپر نہ آ گرے۔ کاش کوئی مجھے باتوں سے سمجھانے کی بجائے لاٹھی سے سمجھاتا۔ میں شاید سمجھ جاتا۔ آج جس اندھے کنویں میں گر رہا ہوں۔ نہ گرتا۔''

اس کے اندر اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ اس نے سوچ لیا کہ جو بھی کرنا ہے۔ مجھے اکیلے ہی کرنا ہے کوئی بھی میرا ساتھ نہ دے گا۔ بس آج رات ہی فیصلہ ہو جائے گا۔ شیخ عمر حیات اب پہنچنے والا نقصان تمہیں ناکوں چنے چبوا دے گا۔ وہ کسی فیصلے پر پہنچ گیا تھا۔

اسے رات ہونے کا انتظار تھا۔ تبھی وہ اپنے کام کو عملی جامہ پہنا سکتا تھا۔ وہ دانش پلازہ کی بیک سائیڈ پر بنی ہوئی گراؤنڈ میں ایک درخت کے نیچے چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ تہہ خانے کو جانے والی سرنگ کا راستہ کون سا ہے۔ گراؤنڈ کے بیچوں بیچ ایک تین مربع گز کا بہت بڑا لوہے کا گیٹ تھا جو زمین کے برابر لگایا گیا تھا۔ اس کے نیچے بنے ہوئے

ہول میں بظاہر مالی اور صفائی کرنے والا عملہ اپنا سامان رکھتا تھا، لیکن غفران جانتا تھا کہ یہ سب کچھ عوام کی نظروں کو دھوکا دینے کے لیے کیا گیا ہے۔ اس کے ایک فٹ نیچے ہی چند سیڑھیاں اتر کر سرنگ کو رستہ جاتا تھا جو جا کر شیخ عمر حیات کی ظلم نگری پر ختم ہوتا تھا۔

رات آدھی ہونے کو آئی تو اسے اپنے پلان پر عمل کرنے کا موقع مل گیا۔ اب گراؤنڈ میں ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ وہ وہاں سے نکلا۔ سڑک کی جانب چل دیا۔ وہ جان گیا تھا کہ ابھی شیخ کے کارندے مال نکالنے کے لیے آ جائیں گے۔ جو کچھ بھی کرنا تھا ان کے آنے سے پہلے ہی کرنا تھا۔ کیونکہ غفران کے علاوہ کسی کو بھی علم نہ تھا کہ شیخ مال کس راستے سے نکالتا ہے اور کب نکالتا ہے۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھانے والا تھا۔ اس نے سرکلر روڈ پر آ کر دیکھا تو ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ پلازہ کی تمام لائیٹس آن تھیں۔ وہ اپنی پوری آب وتاب سے چمک دمک رہی تھیں۔ اس میں ملٹی نیشنل کمپنیوں کے دفاتر تھے۔ جو ڈے اینڈ نائٹ شفٹوں میں کام کرتے تھے۔ اب بھی رات کی شفٹ میں کام ہو رہا تھا۔ غفران نے ایک پبلک کال آفس پر جا کر فائر بریگیڈ کا نمبر ملایا اور گھبراہٹ میں بولنے لگا۔

''سر جی! جلدی کریں دو تین پانی کی گاڑیاں بھیج دیں۔ دانش پلازہ میں آگ لگ گئی ہے، سر جی مہربانی کر کے دیر نہ کریں۔ کتنے ہی بندے اندر پھنسے ہوئے ہیں جی۔'' یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا اور فوراً ہی دور دراز کے تھانے کا نمبر ملا دیا۔

''سر جی! سرکلر روڈ پر واقع دانش پلازہ میں بم ہے۔ فوراً پہنچیں۔ ورنہ بہت نقصان ہو سکتا ہے۔'' اس نے کریڈل دبا کر دوسرے تھانے کا نمبر ڈائل کر دیا۔

''سر جی۔ سرکلر روڈ پر واقع دانش پلازہ میں بم پھٹنے میں پانچ منٹ رہتے ہیں۔ فوراً پہنچیں۔'' اب ڈی آئی جی صاحب کی باری تھی۔

فون ملانے پر ڈی آئی جی صاحب کا ملازم بولا۔ اس نے بتایا کہ صاحب گھر پر نہیں ہیں۔ آپ ان کے موبائل پر فون کر لیں۔ ''تم خود ہی کر دینا۔ انہیں اطلاع کر دو کہ دانش پلازہ جو کہ سرکلر روڈ پر واقع ہے اس میں بم پھٹ گیا ہے۔'' غفران نے ریسیور رکھ دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ فائر بریگیڈ کا عملہ اور کتنے ہی تھانوں کی پولیس جلد اپنی گاڑیوں کے ہوٹر بجاتے ہوئے یہاں پہنچیں گے۔ اتنی پولیس کی موجودگی میں شیخ کبھی بھی اپنا مال وہاں سے نکالنے کا رسک نہ لے گا اور وہ با آسانی اس کے مال تک پہنچ جائے گا۔ اس نے تمام نمبرز یاد رکھے تھے۔ کیونکہ شیخ عمر حیات سے بات کروانے کے لیے اسے مختلف تھانوں میں کالز کرنی پڑتی تھیں۔ اس وقت اسے یہ فضول اور لغو کام لگتا تھا، لیکن آج اسی کے کام آ گیا تھا۔ وہ کال

آفس سے باہر نکلا ہی تھا کہ اس نے ہوٹروں کی آواز سن لی۔ جبکہ پلازہ میں موجود مکینوں کو پتہ ہی نہ تھا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

غفران تیز تیز چلتا ہوا پلازہ کے عقب میں گراؤنڈ میں پہنچا تو اسے کوئی ہلچل نظر نہ آئی۔ وہ جلدی سے چلتا ہوا متعلقہ گٹر کے ڈھکن پر پہنچا۔ اس نے جیب سے مختلف چابیوں کا گچھا نکال کر تالا کھولا اور لوہے کا بھاری بھرکم جنگلا اٹھا کر نیچے چھلانگ لگا دی۔ وہ سرنگ میں چلتا گیا۔ سرنگ میں آنے والی تازہ ہوا پلازہ کے سڑک کی طرف سے رکھے ہوئے روشن دانوں میں سے آ رہی تھی۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا وسیع ہال میں پہنچ گیا۔ چار غنڈہ نما آدمی تاش کھیلنے میں مصروف تھے۔ جو کبھی بھی تصور نہ کر سکتے تھے کہ کوئی پانچواں بھی ان کے درمیان آ گیا ہے۔

غفران کی عقابی نظروں نے دیکھ لیا تھا کہ مال وہیں موجود ہے۔ جبکہ ایک طرف پٹرول کے کین بھی موجود تھے۔ جو گاڑیاں مال لے کر جاتی تھیں۔ یہ پٹرول ان کے لیے تھا۔ تاکہ کوئی بھی گاڑی پٹرول ختم ہونے کی وجہ سے راہ میں نہ رہ جائے۔ مال کو وقت پر مقررہ پارٹی اور جگہ پر پہنچانے کے لیے شیخ نے جو انتظامات کیے تھے۔ آج اسی کے خلاف استعمال ہونے والے تھے۔ غفران نے ایک ستون کے پیچھے چھپ کر ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ ہوٹروں کی آواز سے علاقہ گونجنے لگا تھا۔ جو کچھ بھی کرنا تھا۔ ابھی اور اسی وقت کرنا تھا۔ ٹیبل پر پڑے ہوئے فون کی گھنٹی نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ایک غنڈے نے ریسیور اٹھا کر دوسری طرف سے کچھ سننا شروع کر دیا کچھ دیر بعد اس نے ریسیور رکھ دیا۔

''آج رات مال نہیں نکالا جائے گا۔ کیونکہ باہر پولیس ہی پولیس ہے۔ باس کا فون تھا اس کا پیغام ہے کہ ہم چاروں بھی تھوڑی دیر کے لیے اِدھر اُدھر ہو جائیں۔ فوراً نکلو۔ پتہ نہیں باہر پولیس کس کام سے جمع ہو گئی ہے۔'' وہ بھاگم بھاگ تہہ خانہ سے اوپر جانے والے راستے کی طرف بڑھ گئے جو کہ دانش پلازہ کے ایک سٹور میں نکلتا تھا۔

غفران کا کام مزید آسان ہو گیا تھا۔ اس نے لوہے کا دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر سکون کی سانس لی۔ اب وہ اس تمام مملکت کا اکیلا ہی بادشاہ تھا۔ اس نے پٹرول کا کین پکڑ کر کھولنا شروع کر دیا۔ دو کین کھول کر اس نے پٹرول ان ڈبوں پر پھینکنا شروع کر دیا۔ جن میں سفید زہر بھر کر پیک کیا گیا تھا۔ اس نے تمام مال کو اچھی طرح بھگو دیا تھا۔ اب تیلی دکھانے کی ضرورت تھی۔ اس کے پاس لائٹر تو تھا۔ مگر وہ اِدھر اُدھر ماچس کی تلاش میں نگاہیں دوڑا رہا تھا جو کہ اسے ٹیبل پر پڑی ہوئی مل گئی۔ اس نے ماچس پکڑ کر ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ بکھیری اور تمام مال کو تیلی سے آگ لگا دی۔

اچھی طرح تسلی کے بعد وہ الٹے قدموں واپس دوڑا۔ کیونکہ سرنگ میں دھواں بھرنے سے اس کی اپنی جان کو بھی خطرہ تھا۔ وہ تیز تیز بھاگتا ہوا سرنگ کے دھانے پر پہنچا۔ لوہے کا وزنی جنگلا اٹھا کر باہر نکلا اور گراؤنڈ کے مین گیٹ کی طرف دوڑ لگا دی۔ وہ جلدی سے ایک لمبا موڑ کاٹ کر سرکلر روڈ پر پلازہ کے سامنے پہنچ گیا۔ پلازہ کے تہہ خانہ سے نکلنے والے دھوئیں نے پولیس اور فائر بریگیڈ کے عملے کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ اس سے پہلے تو سبھی کی رائے ایک ہی تھی کہ کسی منچلے نے ان سب کے ساتھ سنگین نوعیت کا مذاق کیا ہے۔

بم سکواڈ نے آتے ہی پلازہ خالی کروا لیا تھا۔ تمام ملازمین حیران و پریشان ایک دوسرے سے چہ میگوئیوں میں مصروف تھے۔ ان کے کام کا حرج ہو رہا تھا، لیکن تہہ خانے سے نکلنے والے دھوئیں نے سرکاری عملہ کے ساتھ ساتھ ان کے اس قیاس پر پانی پھیر دیا تھا کہ یہ کوئی مذاق تھا۔ اب آگ کے شعلے بھی دکھائی دینے لگے تھے۔ جبکہ روڈ پر بھگدڑ مچ گئی تھی۔ دونوں طرف کی ٹریفک روک دی گئی تھی۔ فائر بریگیڈ کا عملہ جو کہ سست روی کا شکار ہو کر واپس جانے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اب پوری تن دہی اور چابکدستی سے اپنی ڈیوٹی میں مصروف ہو گیا تھا۔ ہر طرف دھواں ہی دھواں بکھر گیا تھا۔ جبکہ ناگوار بُو نے وہاں موجود ہر شخص کو ناک پر رومال رکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

پولیس سکواڈ وہاں پر جمع ہونے والوں کو دور ہٹانے پر لگی ہوئی تھی۔ ہر کوئی چیخ چیخ کر اپنی بات کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ روشن دانوں سے ہی اندر پانی پھینکا جا سکتا تھا۔ ورنہ اور کوئی راستہ نہ تھا۔ جو شیخ عمر حیات کے رہے سہے مال کو تباہی و بربادی سے بچا سکتا۔

غفران بھی مجمع میں موجود ''تماشا'' دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ سب کچھ تو آگ نے راکھ کر دیا ہو گا جو کچھ مال بچ گیا۔ وہ فائر بریگیڈ کا پانی برباد کر دے گا اور پھر بھی جو بچ گیا۔ وہ پولیس لے جائے گی۔ یعنی شیخ عمر حیات ہر طرف سے ہی مات کھا گیا تھا۔ غفران نے یہ بہت بڑا گھاؤ لگایا تھا۔ اس پر وہ کئی مہینوں دانت پیستا رہے گا۔

غفران مطمئن اور پُرسکون انداز میں چلتا ہوا گھر جانے والے راستے پر چل پڑا۔ اس نے ضمیر کی آواز پر جس کام کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ اسے چیلنج کے طور پر اکیلے ہی مکمل کر کے کم از کم کچھ تو سرخرو ہوا تھا۔ اب بھی اگر شیخ باز نہ آیا تو اس سے بھی زیادہ بھیانک انتقام لوں گا۔

☆======☆======☆

گنبدِ خضریٰ کی جانب سے آنے والی مستانی ہوا کو نورانیوں نے بڑی عقیدت سے چوما تھا۔ وہ آج صبح سے ہی اداس اور مغموم تھے۔ بادِ صبا کو دیا گیا پیغام ان کے لیے خوشیوں

اور مسرتوں کا پروانہ لے کر آیا تھا۔ ہوا جھوم جھوم کر ہر ایک نورانی کو اپنے آپ سے لپیٹ رہی تھی۔ گویا کوئی ماں ہو جو اپنے بچوں سے بچھڑ گئی تھی۔ جو سالوں بعد ان سے ملی تھی۔ ان کے منہ اور سروں کو چوم رہی تھی۔ ان کے گرد چکر لگا رہی تھی۔ تمام نورانی خوشی اور شادمانی کی سی کیفیت میں جھوم رہے تھے۔

ہوا سے آنے والی بھینی بھینی خوشبو نے کچھ دیر تو نورانیوں کو معطر کر دیا۔ نورانی بھی اس خوشبو اور مہک کو اپنے وجود میں سما کر ہوش گنوانا چاہتے تھے، لیکن ہوا نے ان کی خوشی اور شادمانی یہ کہہ کر کافور کر دی کہ ''اسے جلدی ہے۔ جو بھی کہنا، سننا اور پوچھنا ہے۔ جلدی کرو۔'' بڑا نورانی چونکہ سب کا سردار تھا۔ بات کرنے کا حق بھی اسی کو تھا۔ سب اس کی طرف متوجہ تھے۔

''کتنی خوش نصیب اور مقدروں والی ہو۔ تیرے جیسے نصیب جہاں میں کسی اور کے نہ ہوں گے۔ اے معطر و مطہر ہوا۔ مجھے بتا کہ ہمارے پیارے آقا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر کیا ہو رہا ہے؟''

''اس درِ سخی پر ہر دم منگتے جھولیاں پھیلائے۔ اپنے من کی مرادیں مانگ کر دامن بھر کر لوٹ رہے ہیں۔ درود و سلام کی بارشیں اور عقیدت و احترام کے انوکھے مناظر میں نے دیکھے ہیں۔ آنسوؤں کی قدر و قیمت کوئی نہیں جانتا۔ مگر اس در پر آ کر ایک بے مول آنسو بھی کروڑوں میں تولا جاتا ہے۔ اربوں اور لاتعداد نیکیوں میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ آقاؐ کے حضور ہر روز ہر لمحہ کئی کئی دیوانے آنسوؤں کے قیمتی موتی نذر کر رہے ہیں۔'' ہوا بول رہی تھی۔ وہ سبھی خاموشی اور عقیدت سے سن رہے تھے۔ وہ پھر گویا ہوئی۔ وجد میں آئی، لہرائی۔ تھوڑا سا جھومی اور پھر گھومی۔ مگر اس کی آہیں اور نالے نورانیوں سے چھپے نہ رہ سکے۔ وہ بولی۔

''تم نے مجھے خوش قسمت کہا ہے۔ نصیبوں اور مقدروں والی کہا ہے، لیکن مجھ سے تو خوش نصیب سورج ہے۔ جس کی تپش اور حدت سارا دن گنبد خضریٰ کا دیدار کرتی ہے۔ طواف کرتی ہے۔ خوش نصیب تو دھوپ ہے۔ میں کہاں خوش نصیب ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ نورانیوں کو روتا ہوا چھوڑ گئی۔

نورانیوں کے وجود یادِ مصطفیٰ میں رو رو کر گیلے ہو گئے تھے۔ کوئی عام انسان انہیں دیکھتا تو اس کے لیے یہ نورانی محض ''گیلے پتھر تھے۔'' اور کچھ نہ تھا۔ نورانی گیلے پتھروں کا یہ خاندان جبلِ نور کا مکین تھا۔ وہ ہوا کو خوش نصیب اور مقدروں والی تصور کر رہے تھے، لیکن ہوا

کی سسکیاں انہیں یہ باور کروا گئی تھیں کہ اس سے بھی خوش نصیب دھوپ ہے۔ یہ تو کل دھوپ سے ہی پوچھنا پڑے گا کہ وہ ہوا سے کیوں خوش قسمت ہے اور ہوا اپنی بدنصیبی پر آہیں کیوں بھرتی ہے۔ انہوں نے وہ رات بھی حسب معمول یادِ الٰہی میں گزاری۔

صبح ہی پہلی کرن کی آمد پر غار میں خوشیاں رقصاں ہو گئیں۔ انہوں نے سورج کی پہلی کرن کو ہوا سے بھی زیادہ اعزاز کے ساتھ ''خوش آمدید'' کہا تھا۔ اس استقبال پر آج کرن بھی حیران تھی کیونکہ وہ روزانہ ہی آتی تھی۔ مگر آج ان بے جان پتھروں کے استقبال نے اس کی حیرت دوچند کر دی تھی۔ وہ کچھ دیر کے لیے بڑے نورانی کے وجود پر ٹھہر گئی۔

''آج مجھے حیرت ہو رہی ہے۔ تم ہمیشہ کی طرح یادِ الٰہی میں تو مصروف ہو۔ مگر میرے لیے خصوصی وقت نکال کر اس پُرجوش خوش آمدید کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟''

''ہم نے ہوا کو مقدروں والی سمجھا۔ کیونکہ ہم بے جان وجود کے ساتھ یہیں پڑے ہوئے ہیں۔ ہوا تو جھومتی۔ ناچتی اور گنگناتی ہوئی گنبد خضریٰ کا طواف کرتی ہو گی۔ ہم نے اس سے اس کی مستی اور مہکنے کی وجہ سے پیغام دیا کہ درِ مصطفیٰؐ پر جا کر ہم جیسے بے جان ''غم کے ماروں کا سلام کہہ دینا۔'' وہ کئی دنوں بعد آئی تو اس کا وجود سسکیاں لے رہا تھا۔ ہم نے کہا کہ تم تو خوش قسمت اور مقدروں والی ہو۔ روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ہر لمحہ حاضری دیتی ہو۔ پھر کیوں رو رہی ہو؟

اس نم ہوا نے جواب دیا کہ مجھ سے زیادہ خوش نصیب تو سورج ہے۔ اس کی حدت اس کی تپش اس کی کرنیں یقیناً مجھ سے زیادہ نصیبوں والی ہیں۔ کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ دیر وہاں پر ٹھہرتی ہیں۔ تمہاری خوش نصیبی کا ذکر کرتے ہوئے ہوا غمگین کیوں ہو گئی تھی۔ کیا وہ تم سے حسد و رقابت رکھتی ہے؟ یا اس کا درجہ تم سے کم ہے؟'' بڑے نورانی نے کرن کے لمس کو اپنے وجود پر محسوس کرتے ہوئے تمام نورانیوں کی نمائندگی کرتے ہوئے دل کی بات کہہ دی تھی۔

کرن نے ایک آہ بھری اور گویا ہوئی۔ ''تمہارے بے جان وجود اگر تمہارے لیے کوئی مسئلہ ہیں تو یہ سوچو کہ تم وہاں نہیں جا سکتے ہو تو اس میں اللہ کی مرضی شامل ہے۔ ہم سے زیادہ خوش نصیب تو تم ہو۔ جن کے ساتھ والئی آخر الزماں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مبارک اور مہر نبوت مس ہوتے رہے ہیں۔ تم کو تو ہم سے بھی پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی موہنی سی صورت اور دیدار سے شرف یابی بخشی تھی۔ کیونکہ نبوت کا پہلا مرحلہ اور قرآنِ کریم کی پہلی آیت کا نزول اور پھر جبرائیل علیہ السلام کا متبرک وجود تم پر ہی تو نازل ہوئے

ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ تم اس کائنات کے پہلے گواہ ہو۔ جنہوں نے جبرائیل علیہ السلام کو محبوب کائنات کو اور قرآن کے نزول کو دیکھا سنا اور محسوس کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی کوئی بھی چیز کسی سے کم تر اور بڑھ کر نہیں ہے۔ ہر چیز کی اپنی جگہ ایک اہمیت اور افادیت ہے۔ نہ ہی ہوا مجھ سے کم تر ہے اور نہ ہی میں ہوا سے۔ ہوا کی سسکیوں اور آہوں میں جو درد اور دکھ تم نے محسوس کیا ہے۔ وہی المیہ میرا بھی ہے۔ ہوا دن بھر رات بھر وہاں ٹھہر کر سرکارؐ مدینہ کے روضہ اقدس کا طواف کرنا چاہتی ہے۔ وہ اگر ایسا کرتی رہے۔ روضہ رسولؐ پر جھومتی رہے۔ گھومتی رہے۔ والئی دو جہاں کی مدحت سرائی کرتی رہے تو معلوم ہے کیا ہو گا؟ اس کی خنکی بڑھ جائے گی۔ اس کی ٹھنڈک بڑھ جائے گی۔

کیونکہ آپؐ کا سراپا، آپؐ کا نام، آپؐ کا وجود مبارک رحمت ہی رحمت ہے۔ رب کریم نے رحمت کے علاوہ اپنے پیارے محبوبؐ میں اور کچھ نہیں بنایا ہے۔ ان کے دہن مبارک میں زبان مبارک بھی رب کریم کی ہے۔ ان کی زبانِ فیض ترجمان سے نکلنے والی ہر بات اپنی بات نہ ہوتی تھی۔ بلکہ جو کچھ بھی بیان فرماتے تھے۔ وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتا تھا۔ گویا کہ اللہ کا اپنے بندوں سے کلام کرنا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت سے تھا۔ میرے محترم! تم خود ہی سوچو اگر ہوا دن بھر اس محسن کائنات رحمتہ للعلمین کے روضہ پر چکر لگاتی رہے تو اس کی گرمائش ختم ہو جائے گی اور پھر جہاں جہاں اس کی تپش اور لُو کی اہمیت اور ضرورت ہے۔ وہ وہاں کیسے کام کرے گی؟ گندم کیسے پکے گی؟ مخلوقِ خدا کیا کھائے گی؟ ہوا کی حدت اور گرمی کو برقرار رکھنے کے لیے مجھے اپنا فرض انجام دینا پڑتا ہے۔ میری تپش اور گرمی سے ہوا گرم ہو کر لُو کے تھپیڑے کا روپ دھار لیتی ہے اور پھر وہی لُو فصلوں کے پکنے کے کام آتی ہے، لیکن میں بھی کب تک اس کا ساتھ دے سکتی ہوں۔ کیونکہ سورج کو بھی دن بھر اپنا سفر طے کر کے بالآخر سجدہ طلب کرنا ہوتا ہے۔ جب سجدہ کی اجازت مل جاتی ہے تب سورج سے کہا جاتا ہے کہ ''جہاں سے آیا ہے وہاں چلا جا'' کہ یہی تیری منزل ہے اور پھر اسی آیت کو مانتے ہوئے سورج ہم سب کو سمیٹ کر آہستہ آہستہ سجدہ کرنے کے لیے اپنی منزل کی جانب روانہ ہو جاتا ہے۔ میرا بھی دل چاہتا ہے کہ دن رات روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کروں۔ مگر میری خواہش تا قیامت خواہش ہی رہے گی۔ کیونکہ اگر دن بھر اور پھر رات کو بھی میرا وجود روشنی کرتا رہے پھر تو دن اور رات کا قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔ جبکہ ایسا کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا نظام ہے۔ اس میں تبدیلی کسی بھی طرح ممکن نہیں نہ تم کر سکتے ہو۔ نہ میں کر سکتی ہوں، نہ یہ سورج اور نہ ہی

کوئی بشر۔ اب بھی اگر تمہاری تشنگی باقی ہے تو چاند سے پوچھ لینا وہ یقیناً مجھ سے بہتر ہے۔''

یہ کہہ کر سورج کی کرن روانہ ہو گئی۔ کیونکہ ایک ہی جگہ ٹھہرے رہنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ اس کی ایمان افروز باتیں اور دلیلیں سن کر نورانیوں کے وجود مزید پگھل گئے تھے۔

''ساتھیو!'' بڑا نورانی مخاطب ہوا۔ ''تم نے دیکھا اور سن لیا کہ ہم تو بے جان اور بے زبان ہیں، جو اس فضا میں متحرک ہیں وہ بھی آقائے نامدار کے روضہ اقدس کے طواف سے کبھی بھی جی نہیں بھر سکتے۔ وہ جگہ وہ بستی کیسی ہو گی جس کے سارے ہی دیوانے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب چودھویں رات کو چاند میاں سے پوچھیں گے۔ تم ذکر الٰہی اور ذکر مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس ماحول کو مزید پُر نور بناؤ۔ کیونکہ خلقِ خدا نے یہاں اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو کر شکرانے کے نوافل بھی ادا کرنے ہوتے ہیں۔'' بڑا نورانی خود بھی رب ذوالجلال کی حمد وثنا میں مصروف ہو گیا۔

☆======☆======☆

''غفران نے یقیناً ایک بہت بڑی زک پہنچائی ہے۔'' شیخ عمر حیات نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کا بندوبست بھی کرنا پڑے گا۔'' اس نے فون اٹھایا اور ابھی بات ہی کرنا چاہتا تھا کہ دوسرے فون پر گھنٹی بجنے لگی۔ اس وقت وہ اپنے آفس میں موجود تھا۔ جو کہ احمد باؤ کے آفس سے ایک فلور اوپر بالکل اس کے آفس کی طرز کا بنا ہوا تھا۔ بابا جی کی مریدی اختیار کرنے کے بعد وہ کم ہی آفس آیا کرتا تھا۔ غفران کی طرف سے پہنچنے والے نقصان کا تخمینہ لاکھوں روپوں میں تھا۔ وہ اس نقصان پر تلملا کر رہ گیا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ غفران اکیلا اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ مگر اب اسے سنبھل جانا چاہئے تھا۔ اس نے اپنے تمام خفیہ اڈے خالی کر دیئے تھے۔ تمام مال اب ڈاکٹر شارق کی نگرانی میں کسی ایسی جگہ پر منتقل کیا گیا تھا جس کا غفران اور اس کے فرشتوں کو بھی علم نہ تھا۔ ڈاکٹر شارق کے بقول اس نے تمام راز اور تمام کام بابا جی سے خفیہ رکھا ہوا تھا۔ شیخ کو یہی ڈر تھا کہ کہیں اس کی پوزیشن اس کے مرشد کے سامنے خراب نہ ہو جائے، لیکن ڈاکٹر شارق نے اسے یقین دلایا تھا کہ ایسا کچھ بھی نہ ہو گا۔ وہ بے فکر ہو کر ہر کام کرے۔ ڈاکٹر سے شیخ فیملی کے پرانے تعلقات تھے۔ فیملی تعلقات ہونے کی بنا پر کئی جگہوں پر اکٹھے ہی مدعو ہوتے تھے۔ ایک دن شیخ نے اپنی کاروباری پریشانیوں کا ذکر کیا تو شارق نے اسے اپنی ایک جاننے والی کا حوالہ دے کر بابا جی سے ملنے کو کہا۔

وہ جاننے والی بھی کوئی اچھے کردار کی مالک نہ تھی۔ اس نے پہلے ڈاکٹر شارق کو اپنی

مٹھی میں کیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ دونوں اس کام کے پارٹنر بن گئے اور پھر تیسرا حصہ بابا جی کا رکھا جانے لگا۔ جو کہ کالے علم کے چند علوم پر دسترس رکھتا تھا۔ شیخ اور ڈاکٹر کی پارٹنر شپ کا غفران کو بخوبی علم تھا۔ مگر کبھی بھی ڈاکٹر نے غفران کو حکم نہ دیا تھا اور نہ ہی وہ اس کا ملازم تھا۔ غفران تو شیخ کا ذاتی وفادار تھا۔ اب شیخ اور ڈاکٹر نے تمام غنڈوں کو حکم دے دیا تھا کہ غفران کا ہمارے کام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لہٰذا اس سے ہر دم ہوشیار رہا جائے۔ گزشتہ دنوں بھی شیخ کی سستی اور کاہلی نے دیر کر دی اور اب بہت بڑا نقصان اس کا مقدر بن گیا تھا۔ وہ اپنے بندوں کو کہہ کر غفران کی ہڈیاں پسلیاں تڑوانا چاہتا تھا کہ فون کی گھنٹی نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

''ہیلو'' شیخ نے کہا تو دوسری طرف سے آنے والی آواز عالیہ بیگم کی تھی۔

''شیخ صاحب!'' وہ کافی گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ ''آپ فوراً گھر پہنچیں۔ بہت بڑی واردات ہو گئی ہے۔'' اس سے پہلے کہ شیخ مزید کچھ کہتا۔ دوسری طرف سے رابطہ ختم ہو گیا تھا۔

وہ شدید پریشانی کے عالم میں تھا۔ اس نے سیکرٹری کو انٹرکام پر پوچھا۔ ''احمد کہاں ہے؟'' تو اس نے جواب دیا کہ۔ ''وہ تو صبح سے ہی نہیں آئے۔''

وہ پریشان ہو گیا کہ کہیں غفران نے احمد کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا دیا۔ وہ ایک زندہ دل آدمی تھا۔ مال کا ہر طرح کا نقصان برداشت کر سکتا تھا۔ مگر اولاد کا نقصان ناقابلِ تلافی ہوتا۔ وہ تیزی سے اپنے آفس سے نکل کر لفٹ کے ذریعے نیچے پہنچا۔ عملہ الرٹ ہو گیا تھا۔ مگر وہ تیزی سے چلتا ہوا گاڑی تک پہنچا۔ اسے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے شاہ صاحب کی بات یاد آ گئی تھی۔

''اپنی ہستی سے زیادہ اپنا نام نہ پھیلاؤ۔ نہیں تو یہ نام تمہیں سکون اور چین نہ لینے دے گا۔'' مگر اس نے کون سا شاہ صاحب کو مانا تھا۔ بلکہ جھٹلا دیا تھا۔ اس رنگیلے اور نام نہاد پیر کی خاطر۔ جو آدمی گناہگار ہوتا ہے اسے ہر لمحہ یہی خطرہ رہتا ہے کہ اس کا کوئی چھوٹا بڑا گناہ اس کی اولاد کو سزا بن کر نہ مل جائے۔ یہی حال شیخ کا بھی تھا۔ وہ بمشکل بنگلے پر پہنچا تھا۔ اسے بیرونی گیٹ کھلا ہوا ملا تھا۔ اس کے ہوش گم ہونے کو تھے۔ کیونکہ کوئی ملازم یا چوکیدار بھی اسے نظر نہ آ رہا تھا۔

اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ چلتی ہوئی گاڑی سے اتر کر ہی دوڑ لگا دیتا۔ بمشکل اس نے اندر جانے والے زینوں پر پاؤں رکھے۔ اندر داخل ہوتے ہی بہت بڑا ہال جو کہ ڈرائنگ

اور ڈائننگ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ خلاف توقع اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ بہت بڑا اور قیمتی فانوس بھی آج تاریک تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس طرح کی خاموشی نے اس کا کلیجہ ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ اندر داخل ہوتے ہوئے آوازیں دینا شروع کیں۔

''ملیحہ، ملیحہ، احمد، احمد باؤ، عالیہ بیگم، کہاں ہو تم سب لوگ؟ یہ گھر میں اندھیرا کیوں کر رکھا ہے؟'' وہ چلتا ہوا ہال کے درمیان میں پہنچ کر رک گیا۔ وہ واپس مڑا تو اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ تمام ہال یک دم روشنیوں سے منور ہو گیا تھا۔ تیز روشنی نے شیخ کی آنکھیں چندھیا دی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ہال تالیوں اور ''ہیپی برتھ ڈے ٹو یو'' کی آوازوں سے گونجنے لگا۔ اس کے منہ سے طویل سانس نکل گئی۔ اس کی فیملی نے یقیناً ایک بہت بڑا سرپرائز اسے دیا تھا۔ اس کی یادداشت میں تھا کہ اس کی سالگرہ آ رہی ہے، لیکن غفران کی بھاگ دوڑ میں اس کے ذہن سے نکل گیا اور ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا۔

اس نے دیکھا کہ سب سے آگے اس کی بیگم پھر ملیحہ اور احمد باؤ تھے، لیکن ہال میں چیدہ چیدہ مہمانانِ گرامی بھی تھے۔ جن میں سرفہرست بابا جی۔ ڈاکٹر شارق۔ اس کی فیملی اور پھر احمد باؤ کے چند دوست ان کی بیویاں، میجر مظہر حسین، اس کی بیوی اور پھر ایک نیا چہرہ جو سب کے لیے تشویش کا باعث بنا ہوا تھا وہ تھی ''عصمہ'' عالیہ بیگم اور ملیحہ نے لاکھ پوچھا تھا۔ مگر احمد نے کچھ نہ بتایا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ پاپا کے آنے پر بتائے گا۔

بابا جی آگے بڑھے تو شیخ نے ان کے قدموں پر جھک کر بوسہ دیا۔ بابا جی نے اسے اٹھا کر اپنے سینے سے لگایا اور پھر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور لمبی عمر کی دعا دی۔

پھر باری باری، عالیہ بیگم، ملیحہ اور احمد باؤ نے بھی بابا جی کے قدموں میں دو زانو ہو کر بوسہ دیا تو بابا جی نے باری باری ان کی بھی پیشانیوں پر اپنے ہونٹوں سے مہر ثبت کر دی۔ یہ الگ بات ہے کہ ملیحہ کی پیشانی پر ذرا طویل اور زوردار مہر ثبت ہو گئی تھی۔ تمام خاندان اور شارق فیملی غالباً ان باتوں اور حرکتوں کے عادی تھے۔ جبکہ عصمہ اور مظہر حسین انتہائی حیرت اضطراب کے عالم میں ان حرکات کو دیکھ رہے تھے۔

احمد باؤ نے چھری بابا جی کو پکڑا دی۔ جو چھری لے کر بڑے میبل کی طرف چل پڑے۔ جس پر بڑا سا کیک رکھا ہوا تھا۔ تبھی ان کے پیچھے پیچھے ہاتھ باندھے چل رہے تھے۔

بابا جی نے شیخ کو آواز دے کر اس کے ہاتھ میں چھری پکڑائی۔ جس نے اجازت

طلب نظروں سے بابا جی کی طرف دیکھا۔ ''شروع کرو'' اجازت ملنے پر شیخ نے کیک پر بے دریغ چھری چلا دی۔ ہال ایک مرتبہ پھر پٹی پرتھڑے ٹویو کی آواز سے گونج اٹھا۔

عصمہ خود کو اس ماحول میں اجنبی محسوس کر رہی تھی۔ یہی حال مظہر حسین اور اس کی فیملی کا تھا۔ عصمہ کبھی بھی نہ آتی۔ بس احمد کے کہنے پر چلی آئی اور پھر آفس کی اعلیٰ ورکر ہونے کے ناطے بھی اسے باس کی خوشی میں شریک ہونا پڑا تھا، لیکن یہاں آ کر اس کے تمام خواب چکنا چور ہو گئے تھے۔ وہ احمد باؤ کو بہت اچھا اور تعلیم یافتہ سمجھتی تھی مگر اس کی یہ حرکت کہ وہ بابا جی کے قدموں میں جھک کر اس کے قدموں کو بوسہ دے رہا تھا۔ عصمہ کو بہت بری لگی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ وہاں سے بھاگ جائے۔ مگر وہ ایسا نہ کر سکتی تھی۔

کیک تقسیم ہو رہا تھا۔ سبھی نے کھایا۔ بابا جی کا جھوٹا کیک شیخ فیملی نے تبرک کا تھوڑا تھوڑا کھایا اور خود کو جنتی تصور کرنے لگے۔

''مس عصمہ!'' مظہر حسین نے اس کے قریب آ کر کہا۔ ''کیا آپ خود کو اس ماحول میں ایڈجسٹ سمجھتی ہیں؟''

عصمہ نے غور سے مظہر حسین کی طرف دیکھا۔ وہ شاید اس کی دلی کیفیت کا اندازہ کر رہی تھی۔ ''نہیں''

مختصر سے جواب نے مظہر حسین کو مطمئن کر دیا تھا کہ وہ اکیلا نہیں ہے جو اس غیر فطری اور توہم پرستی کے ماحول سے بیزار ہے۔ وہ پھر عصمہ سے مخاطب ہوا۔

''میں پہلی بار جہالت کی انتہا دیکھ رہا ہوں۔ احمد باؤ کو ان سب کو سمجھانا چاہیے تھا، لیکن وہ خود بھی...... میرا دماغ پھٹ جائے گا۔'' وہ اپنے دونوں ہاتھ کنپٹیوں پر رکھتا ہوا بولا۔ اس کی بیگم بھی پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ عصمہ کوئی جواب دیتی۔ احمد باؤ کی آواز نے ان سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

''لیڈیز اینڈ جنٹل مین۔ میں چند لمحات کے لیے آپ کی خصوصی توجہ چاہتا ہوں۔ آج کی پارٹی کا ارینج جو کہ ہمارے پاپا کے لیے سرپرائز ارینج بھی ہے۔ ہمارے مرشد جناب ''تجمل حسین'' کی سرپرستی میں ہوا ہے۔ پاپا بھی کافی حیران اور پریشان تھے۔ ہم انہیں مزید پریشان نہ کرنا چاہتے تھے۔ اس لیے دن کو ہی یہ پروگرام سیٹل کیا گیا۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہمیں ہمارے مرشد کس قدر پیار اور محبت سے ہینڈل کرتے ہیں۔ اس کی مثال یقیناً کہیں نہ ہوگی۔'' وہ کچھ دیر کے لیے رکا۔ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس نے عالیہ بیگم کو اپنے پاس بلایا۔ عالیہ بیگم نے حسب معمول دعوتِ نظارہ دینے والا لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ اس

کا چھلکتا ہوا وجود سبھی حاضرین محفل کا ایمان خراب کرنے کے لیے کافی تھا، لیکن اکثریت عالیہ بیگم کی فطرت سے واقف تھی۔

مظہر حسین، اس کی بیگم اور عصمہ پہلی مرتبہ اس طرح کی کسی پارٹی میں شریک ہوئے تھے اور خود کو غیر اور اجنبی محسوس کر رہے تھے۔ ''میری مما نے ہمیں بڑا پیار اور خصوصی توجہ دی ہے۔ ہم دونوں بہن بھائی ان کے ممنون ہیں۔ ہماری اچھی تربیت اور پرورش ہمارے محترم والدین کی مرہونِ منت ہے۔ جبکہ محترم مرشد صاحب سے ملاپ کے لیے ہم ڈاکٹر شارق کے بے حد ممنون ہیں۔ ان کے لیے بھرپور تالیاں۔'' ہال ایک مرتبہ پھر تالیوں سے گونج اٹھا۔ یہ گونج بھی احمد باؤ کی درخواست پر تھی۔

''آپ انجوائے کریں کھانا بالکل تیار ہے، لیکن اس کے بعد جائیے گا نہیں۔ کیونکہ ایک انوکھا پروگرام آپ کے لیے سرپرائز ہوگا۔'' ہال کے ایک کونے میں کھانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ مہمان کھانا کھانے میں مصروف تھے۔ جبکہ عصمہ سوچ رہی تھی کہ احمد نے اسے نظر انداز کر دیا تھا۔ اس نے بالکل بھی عصمہ سے بات تک نہ کی تھی۔ بلکہ ایک مرتبہ بھی آ کر نہ پوچھا تھا کہ وہ بوریت تو نہیں محسوس کر رہی۔ اگر احمد ایسا پوچھتا تو وہ برجستہ کہہ دیتی کہ ''ہاں وہ بور ہو رہی ہے اور گھر جانا چاہتی ہے'' لیکن اب تمام پروگرام اس کی مجبوری بن گیا تھا۔ وہ یہاں سے بھاگ نہ سکتی تھی۔ کیونکہ اسے نوکری عزیز تھی۔ وہ کھانا تو بالکل ہی کم کھا رہی تھی۔ بس اسی ادھیڑبن میں مصروف تھی کہ ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔

''اگر کہیں بندہ کی ضرورت محسوس ہو تو کہہ دیجیے گا۔ خادم حاضر ہو جائے گا۔'' اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں تو وہ اس کے لیے اجنبی چہرہ تھا۔ ویسے تو وہاں سبھی اس کے لیے اجنبی تھے، لیکن وہ آدمی اسے ان کی فیملی کا نہ لگتا تھا۔ بلکہ انہی کا کوئی پیر بھائی لگتا تھا۔ عصمہ نے سمجھا کہ شاید انتظامیہ سے ہے۔ احمد کے کہنے پر اس کا خاص خیال رکھنے کے لیے آیا ہے۔

''جی بہت بہت شکریہ۔'' عصمہ نے کہہ کر جان چھڑانی چاہی۔

لیکن وہ تو پیچھے پڑ رہا تھا۔

''اجی حضور اس میں شکریے کی کیا بات ہے؟'' وہ ڈھٹائی سے مسکرا کر بولا۔ ''بندہ خادم ہے۔'' وہ تھوڑا سا جھک گیا تھا۔

''آپ کی تعریف؟'' عصمہ نے مختصراً پوچھا۔

''بندہ کو جانی کہتے ہیں۔'' وہ کمال ادا سے بولا۔ اس سے پہلے کہ بات مزید بڑھتی۔

ہال کی تمام لائٹس بند ہوگئیں۔ ہلکی ہلکی سی مدھر روشنی میں ہلکا ہلکا میوزک بجنے لگا اور پھر یک دم وہ طوفانِ بدتمیزی برپا ہوا کہ عصمہ کے ساتھ ساتھ مظہر حسین بھی گنگ ہو کر رہ گیا۔ ہال کی تیز روشنیوں میں دو ڈانسر لڑکیاں نیم برہنگی کی حالت میں انڈین گیت پر رقص کرنے لگیں۔

عصمہ کی قوتِ برداشت جواب دے رہی تھی۔ وہ اس بیہودگی اور گندگی کو دیکھ نہ پا رہی تھی۔ مزید ستم یہ ہوا کہ احمد باؤ بھی ان رقاصاؤں کے ساتھ ڈانس کرنے لگا۔ جبکہ ملیحہ، عالیہ بیگم، عمر حیات اور بابا جی کے ساتھ ساتھ شارق فیملی بھی تالیاں بجا رہی تھیں۔ جبکہ باقی مرد اور عورتیں بے غیرتی سے تالیاں بجانے کے ساتھ ساتھ جھوم بھی رہی تھیں اور عصمہ کی نظر میں یہ بے غیرتی کی آخری حد تھی۔

گیت کے بول ختم ہوئے تو لائٹس ایک بار پھر آف ہوگئی تھیں۔ عصمہ نے موقع غنیمت جان کر وہاں سے نکل جانا مناسب سمجھا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھی اور دوڑنے والے انداز میں باہر کی طرف لپکی۔ اس نے باہر لان میں آ کر سکون کا سانس لیا تھا۔ کھلی اور آزاد فضا میں اس نے اپنے آپ کو بہتر محسوس کیا تھا۔ وہ گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ چوکیدار نے اسے دیکھ کر گیٹ کھول دیا اور ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا۔ وہ گیٹ کراس کر کے باہر سڑک پر نکل آئی تھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر شیخ کے عظیم الشان بنگلے کی طرف دیکھا۔ عمارت جتنی اندر سے خوبصورت تھی باہر سے بھی اتنی خوبصورت اور پُر وقار تھی، لیکن عصمہ کے ذہن میں خوبصورت بنگلے کو دیکھ کر فوراً ہی اس کے مکینوں کی طرف خیال گیا۔ ''اتنی بڑی عمارت میں کتنے چھوٹے لوگ رہتے تھے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

''خواب نہ چھوڑے جا سکتے ہیں نہ پورے کیے جا سکتے ہیں۔ بس دیکھے جا سکتے ہیں۔ انہیں پورا کرنا آپ کے بس میں نہیں ہوتا۔'' یہ آواز سن کر وہ چونک گئی۔ اس نے اپنے پیچھے دیکھا تو جانی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ عصمہ نے جلدی سے اپنے آنسو صاف کیے اور اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگی۔

''اگر آپ کو ناگوار نہ گزرے تو کچھ قدم ہم ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں؟'' وہ حسبِ دستور مسکرا رہا تھا۔

''مگر کیوں؟'' وہ تذبذب سے بولی۔ کافی مضطرب تھی۔

''اس لیے کہ آپ کافی پریشان ہیں۔ اندر کے ماحول نے آپ کو جو تکلیف دی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ تکلیف آپ کے اندر تک پہنچ گئی ہے۔'' وہ ابھی شیخ کے بنگلے کے باہر ہی کھڑے تھے۔ جبکہ جانی چاہتا تھا کہ یہاں سے چلا جائے۔

''لیکن میں آپ کے ساتھ کیوں چلوں؟'' عصمہ کافی پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ جانی مسکرا پڑا۔ ''دودھ کا جلا، چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔'' اس نے کہاوت سنائی تو عصمہ کو لگا کہ واقعی یہ اس کے دل کی آواز تھی۔ جو جانی نے سن لی تھی اور اس کی دلی کیفیات کا اس نے بخوبی اندازہ لگا لیا تھا۔

''آنسو انسان کے اظہار کی زبان ہوتے ہیں۔'' وہ پھر بولا اور وہاں سے چند قدم آگے کی جانب چل پڑا۔ وہ کچھ دیر چل کر رکا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو عظمہ وہیں کھڑی تھی۔ وہ ایک بار پھر کسی اجنبی کے ساتھ نہ جانا چاہتی تھی۔ جانی واپس آیا۔

''ہم ساتھ ساتھ چلنے کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں، لیکن آپ نے پوچھا کہ میں تمہارے ساتھ کیوں چلوں؟'' وہ توقف کر کے بولا۔ ''میں آپ کے ساتھ چلنے کے لیے ضد نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ آپ کا ساتھ دینے کے لیے کچھ دور تک ساتھ ساتھ چلنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ نہیں جانا چاہتیں تو آپ کی مرضی۔ وہ خونخوار بھیڑیا جنگل سے نکل کر آئے گا اور پھر آپ کو اپنے نوکیلے دانتوں سے ادھیڑ کر رکھ دے گا۔'' آخری فقرہ اس نے اندر کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا اور بھیڑیئے سے اس کی مراد احمد باؤ تھا۔ عصمہ نے ایک بار پھر تصور میں اندر کا ماحول سوچا تو اس کی روح کانپ اٹھی۔ اتنی بے ہودگی اس نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ اس نے سوچا اور جانی پر اعتبار کرنے کو جی چاہا وہ خود ہی آگے کی جانب چلنے لگی۔ جانی بھی اب اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

''بعض اوقات انسان اپنی اوقات بھول جاتا ہے۔ وہ کچھ اور بننا چاہتا ہے لیکن اس کی مرضی اور حالات اسے وہ نہیں بننے دیتے۔'' اس نے عصمہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تو عصمہ نے اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ گویا کہ اس نے عصمہ کی چوری پکڑ لی ہو۔ کیونکہ وہ کبھی بھی پردے کے بغیر باہر نہ نکلی تھی، لیکن پہلی بار ہی اپنے بھائی کے مستقبل کے لیے نکلی تو پہلی ملاقات ہی غلط رہنما سے ہوگئی تھی۔

وہ عجیب سی صورتِ حال کا شکار تھی۔

''ہر انسان اپنا اگلا قدم بہتری اور بلندی کے لیے اٹھاتا ہے۔'' اس نے جانی کی بات کا مناسب الفاظ میں جواب دینا شروع کیا۔ کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ جانی بھی پڑھا لکھا ہے۔ کیونکہ اس کی گفتگو کا انداز، پھر اس کے ویل ڈریس ہونے نے ہی عصمہ کو سمجھا دیا تھا کہ وہ بھی احمد کی پارٹی میں مس میچ تھا۔ مظہر حسین کی تو مجبوری تھی۔ شاید اسی لیے وہ اٹھ کر نہ آ سکے تھے۔

''تقدیر نے اس کے لیے کیا لکھا ہوا ہے، یہ بلندی کی طرف سفر کرنے والا نہیں جانتا ہوتا۔'' عصمہ نے اپنا فقرہ مکمل کیا۔ جانی نے اس کی طرف دیکھا اور پیاری سی مسکراہٹ لبوں پر لاتے ہوئے بولا۔

''کسی غلطی پر بے سود رونے اور آنسو بہا بہا کر تقدیر سے شکوہ فضول ہے۔ بہتر یہ ہے کہ انسان ایک اور غلطی کرلے۔ ہوسکتا ہے کہ اس بار اس کا پاؤں بلندی اور کامیابی کا زینہ طے کرنے میں کامیاب ہوجائے اور تقدیر بھی اس کا ساتھ [illegible]۔''

''میں آپ کی بات کی گہرائی سمجھ نہیں سکی۔'' وہ [illegible] کافی دور نکل آئے تھے۔

''جانتے ہوئے بھی انجان بننا اور سمجھتے ہوئے [illegible] نا سمجھی کی بات کرنا۔ ایک سمجھدار انسان سے ان حماقتوں کی توقع نہیں کی جاسکتی۔'' جانی کا لہجہ اسے عجیب سا لگا تھا۔

''جس طرح لمبا سفر کرنے کے لیے کسی ہمسفر کی ضرورت ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح زندگی کی کٹھن راہوں میں چلنے کے لیے کسی ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟'' جانی نے پھر سوال داغ دیا تھا۔

''گاڑی اگر پٹڑی پر چلتی جائے۔ چاہے تیز یا آہستہ، شرط ہے کہ چلتی جائے۔ بس وہ کسی نہ کسی وقت اپنی منزل پر پہنچ جاتی ہے۔'' اس نے جانی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ''اگر وہ تیز رفتاری سے دوڑے گی۔ تو پٹڑی سے اتر جائے گی اور میرا خیال ہے کہ ہمیں اب اپنے اپنے گھر کی راہ لینی چاہئے۔ کیونکہ آپ کی گاڑی پٹڑی سے اترنا شروع ہوگئی ہے۔'' وہ چلتے چلتے یک دم رک گئی تھی۔ جانی بھی حسب معمول مسکرا رہا تھا۔

''ایک اجنبی نے آپ کا یہاں تک ساتھ دیا ہے۔ آپ کا ذہن جو کہ احمد باؤ کی اصلی شکل دیکھ کر گھوم رہا تھا۔ آپ کو اس اذیت ناک ماحول سے نکال کر میں یہاں تک لایا ہوں۔ اگر میرے خیالات اور میری نیت میں کھوٹ ہوتا۔ میں آپ کو کوئی بھی غیر اخلاقی نقصان پہنچا سکتا تھا۔'' اس نے عصمہ کی آنکھوں میں جھانکا تو وہاں پر ندامت کے آثار تو نمایاں نہ تھے۔ مگر احمد کے ذکر پر آنکھوں میں موتی ضرور چمک رہے تھے۔

''میں کوئی بڑا آدمی نہیں ہوں۔'' وہ پھر بولتا ہوا آگے کی طرف چل پڑا۔ عصمہ کو بھی اس کی تقلید کرنا پڑی۔ ''میرے پاس کوئی ایسی پیاری چیز نہیں ہے۔ میں جس کی قسم کھا کر حلف دے سکوں، لیکن ہاں ایک چیز ضرور ہے۔ میرے پاس میرے ایمان کی روشنی ہے میرے دین کی طاقت ہے۔ قرآنِ کریم کا علم ہے۔ بس آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کوئی برا آدمی نہیں ہوں۔'' اب وہ رک گیا تھا۔ ''اگر قرآن کی قسم کھاؤں تو آپ کو فوراً یقین کرلینا

چاہئے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ آپ کے سینہ میں اس مقدس کتاب کا شد، مد، زیر، زبر اور جزم غرض کہ ہر ایک چیز محفوظ ہے۔'' اس نے کہا۔ اب عصمہ کے حیران ہونے کی باری تھی۔ کیونکہ جانی سے اس کی پہلی ملاقات تھی۔ اسے کیسے پتہ تھا کہ وہ قرآن کی حافظہ ہے۔ وہ گومگو کی حالت میں اسے دیکھ رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی۔ وہ پھر بول پڑا۔ کیونکہ وہ بولتا بہت تھا۔ مگر کمال بولتا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ اب کسی اچھے سے ریستوران میں بیٹھ کر کھانا کھایا جائے۔ بشرط کہ آپ کو میری ہر بات پر یقین ہو۔''

''میں سمجھ نہیں پا رہی کہ آپ کو اپنی ذات کے کس خانے میں فٹ کروں۔'' عصمہ نے کہہ کر اس کے ساتھ پھر چلنا شروع کردیا۔

وہ ہنسنے لگا۔ ''کھانا کھانے کے بعد ہمیں طے کرلینا چاہئے کہ مجھے آئندہ کس حیثیت سے آپ سے ملنا چاہئے۔'' اس کی آئندہ کی پروگرامنگ سن کر عصمہ ہکی بکی رہ گئی۔ وہ تو اس سے جان چھڑا کر کسی پُرسکون جگہ پر بیٹھ کر احمد کے گھناؤنے روپ پر غور کرنا چاہتی تھی۔ مگر اب کھانا اور اس کے بعد آئندہ کی پلاننگ۔ وہ پہلی بار نروس ہوگئی تھی۔ اس کے چلتے ہوئے قدم رک گئے۔ جانی بھی رک گیا۔

''میں سمجھ گیا ہوں۔''

''ایک تو یہ کم بخت سمجھ بہت جلدی جاتا ہے۔ عصمہ سوچنے لگی کہ اب نہ جانے یہ کیا سمجھ گیا ہے۔

وہ پھر بولا۔ ''آپ نے اب تک میرے ساتھ جو سفر کیا ہے۔ اس میں کوئی بھی نام یا رشتہ یا کوئی باہمی اعتماد نہ تھا۔ بلکہ آپ کی مجبوری تھی کہ آپ تلخ اور پریشان کن حالت سے باہر نکلنا چاہتی تھیں اور میں اپنے آپ کو آپ کی طرح اس گھٹن زدہ ماحول میں ایڈجسٹ نہ کر پا رہا تھا۔ آپ کے ساتھ جو چند قدم چلا ہوں۔ پہلا قدم چلنے سے پہلے ہی میں نے اپنے دل میں آپ کے لیے ایک جذبہ اور ایک رشتہ پال لیا تھا۔ میں آپ کو صرف نام کی حد تک جانتا تھا۔ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ آپ کسی غلط آدمی کے ساتھ زندگی کا سفر شروع کرنے والی ہیں۔ اس بتانے والے نے بڑے کرب اور دکھ سے بتایا تھا کہ میں آپ کو روک سکتا ہوں تو روک لوں، لیکن آپ کو سمجھانے سے کچھ بھی نہ حاصل ہوتا۔ کیونکہ جب انسان ترقی اور سنہری مستقبل کے خواب دیکھنے لگتا ہے تو وہ تخیلات کی دنیا میں اچھے دنوں کی آس میں خیالی تاج محل بنانے شروع کردیتا ہے۔ وہ آنکھیں بند کرکے سپنے دیکھنے کی بجائے آنکھیں کھلی رکھ کر

بھی حقیقت اور سچ سے نگاہیں چراتا رہتا ہے۔ میں نے آپ کو سمجھانا بہتر نہ سمجھا۔ بلکہ عملی طور پر یہ سب کچھ دکھانا بہتر سمجھا تھا۔ آپ کو احمد باؤ نے میرے ہی کہنے پر اس سالگرہ کی پارٹی میں مدعو کیا تھا۔ کیونکہ میں ان کا پیر بھائی ہوں اور میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ جس کسی نے بھی مجھے بتایا تھا۔ اس نے آپ کی ایک بہت ہی واضح نشانی بتائی تھی۔'' وہ کچھ دیر کے لیے رک گیا۔ شاید سانس درست کرنے کے لیے یا پھر الفاظ کی ترتیب دے رہا تھا۔ ''آپ کی واضح نشانی سے ہی میں آپ کو پہچان پایا ہوں۔''

''کیا نشانی بتائی تھی اس بتانے والے نے؟'' عصمہ نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ مخصوص مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے ہوئے بولا۔

''وہ شرم و حیاء کا پیکر ہو گی۔ اس کی بڑی بڑی مدہوش آنکھیں اس ماحول میں کسی اپنے کو تلاش کر رہی ہوں گی۔ لرزتے ہاتھوں اور کانپتے ہونٹوں سے وہ کسی سے بھی رغبت کے ساتھ گفتگو میں محو نہ ہو گی۔ بس یہی کچھ تھا اور ہاں...... سب سے بڑی نشانی اس نے آپ کا لباس بتایا تھا۔ جو کہ پارٹی میں شامل تمام عورتوں سے مختلف ہو گا۔''

''لیکن بتانے والے کو کیسے معلوم تھا کہ آج شیخ کی سالگرہ پارٹی ہے جبکہ یہ سرپرائز تو انہیں ان کی اولاد اور بیگم نے دیا ہے۔'' عصمہ نے ایک پوائنٹ نوٹ کر لیا تھا۔

''آپ کی ذہانت کا میں قائل ہوں۔ مگر یہ پروگرام میں نے، احمد باؤ اور ان کی ماں نے ترتیب دیا تھا۔ مجھے بتانے والا ظاہر ہے کہ میرا دوست ہی ہو گا اور میں نے اس سے اس پارٹی کے متعلق بات بھی کی تھی۔'' عصمہ کو اس کی بات میں وزن لگا۔ جبھی تو وہ سر ہلا کر اس کے ساتھ چلنے لگی تھی۔

وہ ایک پیچھے سے ریستوران میں داخل ہو گئے۔ ایک خالی ٹیبل پر بیٹھنے کے بعد جانی نے ویٹر کو کھانے کا آرڈر دیا اور خود ہاتھ دھونے کے لیے چل دیا۔ عصمہ جس ٹیبل پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ والی میز پر سے ایک لڑکی اٹھ کر تیزی سے عصمہ کے سامنے آ کر بیٹھ گئی۔

دونوں ایک دوسری کو دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں۔ آنے والی نے عصمہ کے ساتھ بے تکلفی سے ہاتھ ملایا تو عصمہ بھی اسے دیکھ کر بہت خوشی کا اظہار کرنے لگی۔

''یار کہاں غائب ہو گئی ہو؟'' عصمہ بڑی بے تکلفی سے بولی۔

''کہاں جانا ہے۔ اسی شہر میں جوتیاں چٹخاتی پھر رہی ہوں۔'' نو وارد لڑکی نے کہا۔

''اسی شہر میں؟'' عصمہ نے حیرت سے پوچھا تھا۔ ''مجھ سے ملی کیوں نہیں؟''

''مجھے علم ہی نہ تھا کہ تم کس نگری میں رہتی ہو؟'' وہ شانے اچکاتے ہوئے بولی۔

''اچھا تم اپنا ایڈریس لکھواؤ۔'' عصمہ نے اسے کہا تو اس نے اپنا پتہ بتا دیا۔ عصمہ کے پاس تو کوئی کاغذ نہ تھا۔ مگر اس نے پھر بھی تمام پتہ اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ اب عصمہ نے بھی اسے اپنا پتہ سمجھا دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر جاتی جانی اپنی جگہ پر پہنچ گیا۔ وہ عصمہ کو کسی لڑکی کے ساتھ باتیں کرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ قریب آنے پر جانی کو شدید جھٹکا لگا جو کہ ذہنی حیرت کا جھٹکا تھا۔

یہ وہی لڑکی تھی جس نے ڈاکٹر شارق کے ساتھ ریستوران میں ڈیل کی تھی۔ اس کی تو جانی کو بہت دیر سے تلاش تھی۔ جبکہ غفران بھی اس حلیے کی لڑکی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ جانی کو تمام معاملہ سمجھتا ہوا نظر آنے لگا۔ وہ اپنی ٹیبل پر پہنچا تو نو وارد لڑکی کی آنکھوں میں شوخی اُمڈ آئی۔ وہ جانی کو عصمہ کا خاوند سمجھ رہی تھی۔ وہ شوخی سے بولی۔

''ہائے دولہا بھائی۔'' وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی اور جانی کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

''آئی، ایم ایمان اینڈ آئی ایم فرینڈ آف یور مسز۔''

''میں جانی ہوں اور یہ میری مسز نہیں ہیں۔'' جانی نے اس سے شیک ہینڈ کیا۔ تو غصے اور حیرت سے بیٹھی ہوئی عصمہ کے چہرے پر بھی اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ اسے باتونی جانی کے منہ سے کسی بھی خیر کی توقع نہ تھی۔ مگر وہ سمجھدار نکلا۔

''وٹ؟'' وہ حیرت سے چلائی۔ ''یہ آپ کی مسز نہیں ہیں؟ تو پھر آپ کون ہیں؟''

''مس!'' جانی شش و پنج میں پڑ گیا تھا۔ عصمہ کی بھی سانس رکی ہوئی تھی۔ جبکہ ایمان کا تجسس بڑھ رہا تھا۔ ''وہ دراصل بات یوں ہے کہ......'' جانی نے کہنا چاہا۔ مگر اس کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ کیونکہ ایمان کے لبوں پر عصمہ کی طرف دیکھ کر جو طنزیہ مسکراہٹ بکھری تھی۔ وہ جانی نے محسوس کر لی تھی۔ جبکہ عصمہ کی پوزیشن خراب ہو رہی تھی۔ جانی کو اسے مزید بدنام ہونے سے بچانے کے لیے اس رشتے کا نام ظاہر کرنا ہی پڑا تھا جو اس نے عصمہ کو بتایا تھا کہ اس نے اس کے ساتھ پہلا قدم اٹھاتے ہی اپنے دل میں قائم کر لیا تھا۔

''مس ایمان!'' جانی اپنی کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ ''اپنے ذہن میں آنے والے کسی بھی غلط خیال کو جھٹک دیجیے۔ عصمہ سے میرا کوئی دوستی کا رشتہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ میری چھوٹی بہن ہے۔''

عصمہ نے چونک کر جانی کی طرف دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی اور عصمہ جو شرم سے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔ اب فخریہ جانی کی طرف دیکھ رہی تھی جبکہ

ایمان کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ معذرت کر کے وہاں سے جا چکی تھی۔

''بنا پوچھے ہی میں نے آپ سے رشتہ جوڑا ہے۔'' جانی آنکھوں میں آئی ہوئی نمی کو چھپاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''دراصل زندگی نے تمام رشتے چھین کر تنہا کر دیا ہے۔ حسرت ہی تھی کہ کسی کو اپنا کہتا۔ میرے ان الفاظ سے اگر آپ کو دکھ ہوا ہو تو معذرت خواہ ہوں۔'' اس نے آنسو چھپانے کے لیے چہرہ دوسری طرف کر لیا تھا۔ عصمہ کو اس سے یہ توقع نہ تھی۔ وہ تو محض اس کے ساتھ احمد کا دکھ بھلانے کے لیے چلی آئی تھی، لیکن قدرت نے اسے جانی کے روپ میں ایک بڑا بھائی دے دیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ رہے تھے۔ جبکہ ویٹر حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور ٹیبل پر کھانا بھی چن رہا تھا۔ ویٹر کے جانے کے بعد جانی کی طرف دیکھا تو مخصوص مسکراہٹ لبوں پر سجائے ہوئے بولا۔

''اگر دل اس رشتہ پر اعتراض کر رہا ہے تو زبردستی نہیں ہے۔''

''جانی بھائی!'' عصمہ نے پہلی بار اسے اس کے نام سے پکارا تھا۔ بلکہ رشتہ بھی پکا کر لیا تھا۔

''بس۔ اب رونا دھونا بند'' جانی نے آگے جھک کر اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ ''کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے اور ٹھنڈا کھانا مجھے مزا نہیں دیتا۔ باقی باتیں گھر جا کر کریں گے کیونکہ لوگ ہمارے آنسو دیکھ کر کچھ اور ہی نتیجہ اخذ کر رہے ہوں گے۔''

انہوں نے کھانے پر ہاتھ صاف کرنے شروع کر دیئے تھے۔ عصمہ جانی کے چہرے کا بھی جائزہ لے رہی تھی۔ جہاں اسے معصومیت ہی معصومیت نظر آ رہی تھی۔ اس کے سفر کی داستان اس کے چہرے پر لکھی ہوئی تھی۔ وہ ایک تھکا ہارا مسافر لگ رہا تھا۔ جو سخت اور کڑی دھوپ میں بے یار و مددگار بھوکا پیاسا کئی میلوں کا پیدل سفر کرتا ہوا اب کسی گھنی چھاؤں کے نیچے پہنچا ہو۔ جہاں اسے درخت سے پھل اور پانی بھی مل گیا تھا اور ستانے کے لیے بہترین اور پُرسکون جگہ بھی مل گئی تھی۔ وہ جی بھر کر کھانا کھا کر پُرسکون نیند سونا چاہتا تھا۔ ایسا اس کے چہرے پر لکھا ہوا تھا۔

جانی کے بھی ایسے ہی تاثرات تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ عصمہ کو زیادہ جدوجہد نہیں کرنا پڑی تھی۔ کیونکہ وہ سر پر کاغذ کے پھول سجا کر چلی تھی۔ مگر ابھی بیرون شہر ہی نکلی تھی کہ بارش نے آلیا تھا۔ اب وہ پیار اور محبت بھرے چھپر تلے غم کی بارش اور دکھوں کی دھوپ میں خود کو چھپا کر بہتر اور مناسب زندگی گزار سکتی تھی۔ جانی اسے اپنی سگی بہن کی طرح رکھے گا۔ ہر طرح اور ہر لحاظ سے اس کی ہر خواہش کو محترم جانتے ہوئے اس کا احترام کرے گا کہ یہ

ایک بڑے بھائی کا فرض ہوتا ہے۔

شام ہو رہی تھی۔ اب انہیں اپنے اپنے گھروں کو جانا تھا۔ جانی نے اسے ایک ٹیکسی میں بٹھا دیا تھا۔

''میں جلد ہی آپ کے گھر آؤں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹیکسی والے کو ایڈریس سمجھایا۔ اسے کرایہ دیا اور کافی دور تک جاتی ہوئی ٹیکسی کو دیکھتا رہا۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر آسمان کی طرف دیکھا۔ آنکھوں سے اظہار تشکر سے دو آنسو نکل کر اس کی شرٹ میں جذب ہو گئے تھے۔ اس نے اس انسان کا بھی شکریہ ادا کرنا تھا جس کی وجہ سے اسے عصمہ جیسی بہن ملی تھی۔ وہ انسان ظاہر ہے غفران کے علاوہ کون ہو سکتا تھا۔ جانی نے جیب سے کیمرا نکال کر اسے دیکھا اور پھر اس نے ایمان سے بھی ملنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ کیمرے میں اس نے بابا جی تجمل حسین کی کئی تصاویر مختلف پوز سے بنائی تھیں۔ اب وہ اس بابے سے باقاعدہ ثبوت ہونے پر ہی ملنا چاہتا تھا اور باقاعدہ ثبوت اسے ایمان اور ڈاکٹر شارق ہی دے سکتے تھے کہ بابا جی تجمل حسین کون ہے اور یہ لوگوں کو بے وقوف بنانے کا دھندہ کب سے کر رہا ہے؟ وہ جلد از جلد غفران کے پاس پہنچ کر آج کی تمام خبریں اسے من و عن بتانا چاہتا تھا اور اگلی بار کیا کرنا ہے، یہ لائحہ عمل طے کرنا چاہتا تھا۔ اس نے پاس سے گزرنے والی ٹیکسی کو ہاتھ کے اشارے سے روکا اور اس میں سوار ہو گیا۔

☆======☆======☆

بابا تجمل حسین اب پوری طرح عمر حیات فیملی پر حاوی ہو چکا تھا۔ اس نے شیخ کو اپنے پاس تنہائی میں بلایا تھا۔ وہ شیخ کے ہی گھر میں اپنے ''آستانہ'' پر موجود تھا۔ شیخ سب کچھ بھول گیا تھا۔ وہ ننگے پاؤں دوڑتا ہوا آستانے پر پہنچا تھا۔ اس نے جا کر دوزانو بیٹھ کر سجدے میں سر جھکا دیا تھا۔ جبکہ بابا جی اس کی پشت تھپتھپا رہے تھے۔ شیخ کتنی ہی دیر ایسی حالت میں بیٹھا رہا۔ بابا جی نے اسے کندھے پر تھپکی دے کر اٹھایا۔

شیخ کی آنکھیں فرطِ عقیدت سے جھکی ہوئی تھیں۔ وہ بابا جی کے پاؤں دبانے لگا۔

''ایک گھمبیر مسئلہ آن پڑا ہے۔ بابا'' بابا تجمل حسین نے شیخ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''آپ کو؟'' شیخ کے لہجے میں حیرت تھی کہ اس کے مرشد کو بھی کوئی مسئلہ درپیش ہو سکتا ہے۔

''ہاں! شیخ صاحب ہمارے مریدوں کے مسائل ہمارے ہی تو ہیں۔'' بابا جی نے کہا تو شیخ نے سکون کی سانس خارج کی۔

''حکم کیجیے حضور بندہ ہر طرح حاضر ہے۔'' شیخ کے لہجے میں عاجزی سمٹ آئی تھی۔

''اس کالونی میں ایک تھوڑا سا رقبہ ویران پڑا ہے۔'' باباجی نے اپنا مدعا بلکہ دل کی آواز کہنی شروع کی۔ ''بابا اگر کسی وزیر، سفیر یا مشیر کی سفارش یا پھر اپنی ہی کوشش سے اسے حاصل کرو۔ اس پر ایک پیر بھائی دس منزلہ پلازہ تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ تمہاری طرح وہ بھی ہم سے محبت رکھتے ہیں۔ شیخ صاحب کوئی مسئلہ یا پرابلم ہو تو بے شک رہنے دینا۔'' باباجی نے ٹھہرے ہوئے پانی میں کنکر پھینک کر اسے رقص کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ شیخ کے اندر ہلچل مچ گئی تھی۔

وہ جانتا تھا کہ جس پلاٹ کی طرف باباجی اشارہ کر رہے ہیں۔ وہ کمرشل پلاٹ تھا۔ حاجی عبداللہ کا اس پر ڈیرہ بنا ہوا تھا۔ اس کے چمچے کڑچھے ہر دم وہاں پر اسلحہ لے کر بیٹھے رہتے تھے، لیکن وہ کسی کو بھی ہراساں نہ کرتے تھے۔ بلکہ اس حلقے کے مسائل حل کروانے کے لیے جو بھی سائل وہاں آتے تھے۔ ان کو تحفظ بہم پہنچانے کے لیے حاجی عبداللہ نے اپنے ذاتی خرچہ پر گن مین رکھے ہوئے تھے۔ جنہیں عبداللہ مخالف گروپ نے غنڈوں اور تخریب کاروں کا نام دے دیا تھا۔ چونکہ حاجی عبداللہ حلقہ کی ہر دلعزیز شخصیت تھے اور پھر حکومتی ایم۔ این۔ اے بھی رہ چکے تھے۔ اس لیے گورنمنٹ نے تو اس طرف توجہ نہ کی تھی، لیکن اب جبکہ، الیکشن نزدیک آ رہے تھے اور پھر وقتی طور پر اسمبلیاں بھی معطل تھیں۔ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی سوچ شیخ صاحب کے ذہن میں عود کر آئی تھی۔ ظاہر ہے۔ اب عبداللہ کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ شیخ کے ذہن میں باباجی کی آواز گونجی کو وہ کسی وزیر، مشیر کی سفارش سے یہ کام کروا سکتا ہے تو کروائے۔

سونے پر سہاگہ یہ کہ باباجی کا حکم تھا۔ شیخ تو اس پر اپنی جان بھی لٹانے کو تیار تھا۔

''کوئی دقت یا مسئلہ درپیش ہو تو رہنے دینا۔'' باباجی تجمل حسین نے شیخ کو گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے پایا تو کہا۔

''آپ نے حکم کیا ہے۔ پھر مسئلے مسائل تو خود بخود ہی دم توڑ جائیں گے۔'' شیخ نے ایک بار پھر اس کے پاؤں پکڑ لیے تھے۔ ''یہ کام آپ کی طرف سے حکم ہے۔ آپ کی دعا اور آپ کے کرم سے ہو جائے گا۔'' شیخ نے باباجی سے ہامی بھر لی تھی۔

''اور!......'' بابا تجمل رک گیا۔

''کہیے سرکار، کوئی بھی بات ہے بلاجھجک کہہ دیجیے۔'' شیخ ہاتھ باندھ کر بیٹھ گیا تھا۔

''میں اور میرا سب خاندان آپ کا غلام ہے۔ آپ حکم کیجیے۔ یہ سبھی کچھ ہمیں [illegible] ہی کی

بدولت تو ملا ہے۔ آپ نہ ہوتے تو شاید ہمیں روٹی بھی نصیب نہ ہوتی۔'' شیخ نے شرک اور کفر کی حد کر دی تھی۔

''دراصل!...... میں کہنا چاہتا تھا کہ وہ سامنے الماری میں سے قرآنِ کریم ہٹا دیے جائیں۔'' تجمل بابا نے زہر اگلا۔ ''کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ ہم اچھی اور غلط باتیں اس کتاب کی موجودگی میں کرتے رہیں۔'' اس نے اپنے کفر کا کانٹا شیخ کے ذہن میں چبھو دیا تھا۔ اب شیخ نے فوراً ہی اس حکم کی تعمیل کی اور قرآنِ کریم اٹھا کر خود جا کر اسٹور میں ایک ایسی جگہ پر رکھ دیے۔ جہاں وہ نہ کبھی نظر آ سکیں اور نہ ہی کبھی پڑھنے کے لیے کھولے جائیں۔ ویسے بھی جب سے اس گھر میں بابا تجمل آیا تھا۔ اس گھر میں کسی نے بھی رب کریم کو سجدہ کرنا تو درکنار، اس وحدہٗ لاشریک کا نام لینا بھی گوارا نہ کیا تھا۔

وہ بڑی عظمت اور بڑی شان والا غفور و رحیم ہے۔ وہ دنیا میں کی گئی ہر خطا اور ہر گناہ کی معافی دے سکتا ہے۔ مگر کوئی اس کی ذات میں کسی کو شریک بنائے۔ اس کے محبوب کی مقدس ذات کے متعلق یا پھر آخری کتاب کے متعلق کوئی غلط بات کہے۔ غلط نظریات رکھے یا پھر اسے اس نیت سے ٹھکانے لگائے کہ یہ کون سا زندگی کی کتاب ہے۔ وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔ اس کی رحمت کبھی بھی گوارا نہیں کرتی کہ کوئی بھی اس کی ذات کے سوا کسی کو عبادت کے لائق ٹھہرائے، یا پھر رزق کے لیے یہ کہے کہ یہ اسے کسی انسان نے دیا ہے۔ وہ کبھی بھی اس بات کو اس سوچ کو گوارا نہیں کرتا۔ پھر اس کے حکم سے سرتابی کرنے والے اس کے قہر کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کی طرف سے نازل ہونے والے عذاب کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں جن کا یہ کمزور انسان مقابلہ نہیں کر سکتا۔ نتیجتاً ہولناک تباہی اس کا مقدر بن کر رہ جاتی ہے۔ پھر اس کا کوئی بھی پُرسان حال نہیں ہوتا۔

شیخ نے بھی اپنے انسانی رازق کو خوش کرنے کے لیے رب ذوالجلال کی صفات میں اس کو شریک کر لیا تھا۔ اس کے سامنے سجدے کرتا تھا۔ اس کے قدموں میں کئی کئی منٹوں تک جھکا رہتا تھا۔ اس کے کہنے پر شیخ نے قرآنِ کریم بھی وہاں سے ہٹا دیے تھے۔

تجمل حسین نے قرآنِ کریم وہاں سے ہٹائے جانے پر سکھ کا سانس لیا تھا۔ کیونکہ اس آسمانی مقدس کتاب کی موجودگی میں بابا تجمل کا کوئی بھی کالا علم کام نہ کرتا تھا۔ اب وہ عالیہ بیگم اور ملیحہ کی کمزوریوں سے مکمل فائدہ اٹھا کر کھل کھیل سکتا تھا۔

اس نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ کمرے میں تنہا تھا اور تنہائی میں برے آدمی کا ساتھی شیطان مردود ہوتا ہے، لیکن تجمل تو خود مردود تھا۔ شیطان بھی

اس کی سوچ اور غلط ارادوں سے پناہ مانگتا تھا۔ اس نے دروازے کے پاس لگی ہوئی گھنٹی بجائی جو کہ عالیہ بیگم کے بیڈروم میں بجتی تھی۔ عالیہ بیگم ننگے پاؤں ہی ڈھیلے ڈھالے لباس میں دوڑی ہوئی چلی آئی۔ شیخ صاحب کا حکم تھا کہ پیر صاحب کو کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ تبھی تو عالیہ بیگم باباجی کی ہر قسم کی خدمت کے لیے تیار ہوتی تھی۔ وہ جھک کر باباجی کے سامنے بیٹھی تو باباجی نے اب تک پڑھے ہوئے تمام منتر اور کالے جادو کے الفاظ کی پھونک عالیہ بیگم کے نیم برہنہ وجود پر ماری تو وہ مدہوش ہوگئی۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر تجمل کی آنکھوں میں دیکھا تو وہاں خماری ہی خماری نظر آئی جبکہ تجمل نے اپنے منتر سے عالیہ بیگم کو اس قدر مدہوش کر دیا تھا کہ وہ خود سپردگی کے عالم میں تجمل کی گود میں گر گئی۔

تجمل نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور اپنے سامنے بیٹھنے کو کہا۔ عالیہ بیگم تجمل کی آنکھوں میں ہی دیکھ رہی تھی۔ جبکہ تجمل نے ہپناٹائز کے ذریعے اس کے ذہن کو اپنے ٹرانس میں کر لیا تھا۔ اس گھر میں اس کا یہ پہلا شیطانی وار تھا۔ جس میں وہ آسانی سے کامیاب ہونے والا تھا۔

''تمہارا نام؟'' تجمل حسین نے عالیہ بیگم کی نگاہوں میں اپنی تیز و تند نظریں گاڑ کر پوچھا۔

''عالیہ بیگم۔'' وہ سحر زدہ انداز میں بولی تھی۔

''میرے سوالوں کے جواب ٹھیک ٹھیک دینا۔''

''جی حکم کیجیے۔''

''کیا تم اپنے مرد سے نفسانی طور پر خوش ہو۔''

''نہیں۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا تو تجمل کی آنکھوں میں شیطانی چمک بھی بڑھ گئی اور اس کے ہونٹوں پر اپنے کامیاب اندازے کے لیے مسکراہٹ بھی بکھر گئی تھی۔

''کیا وجہ ہے۔ جبکہ تمہاری اولاد بھی ہے۔ کیا یہ بچے شیخ کے نہیں ہیں؟''

''یہ اولاد شیخ ہی کی ہے۔ شادی کے پانچ سال بعد ہی روڈ ایکسیڈنٹ میں شیخ صاحب مردانہ صلاحیت سے محروم ہو گئے تھے۔'' عالیہ بیگم کے انکشاف نے تجمل پر بم گرایا تھا۔ مگر یہ بم باباجی کا کچھ بگاڑنے کی بجائے شیخ کی عزت کے پرخچے اڑانے والا تھا۔ وہ پھر بولی۔

''تب یہ دونوں بچے پیدا ہو چکے تھے۔ بس تب سے میں اپنی خواہشات کا گلا گھونٹتی آ رہی ہوں۔'' وہ ایسے لہجے میں بات کر رہی تھی کہ وہ اور اس کا دماغ کسی جادوئی طاقتوں

کے زیر اثر ہیں۔

''کیا تمہیں اب بھی اولاد کی طلب ہے؟'' باباتجمل نے ایک اور سوال کیا۔

''ہاں...... مگر۔'' مایوسی اس کی آنکھوں سے عیاں ہونے لگی تھی۔

''کیا اس سلسلے میں تم کو میری مدد درکار ہے؟''

''ہاں بلکہ شدت سے۔''

تو پھر میں جیسا کہوں۔ تم ویسا ہی کرو گی۔''

''ہاں میں ویسا ہی کروں گی۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

''ہاں میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔''

''اب تم سو جاؤ۔'' تجمل نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ پھیرا۔ ''تم سو رہی ہو...... تم سو رہی ہو۔''

عالیہ بیگم نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ مکمل طور پر سو چکی تھی۔ جبکہ تجمل کے اندر موجود شیطان مکمل طور پر جاگ گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر دروازے کو کنڈی لگائی اور پھر بے ہوش پڑی ہوئی عالیہ بیگم کی طرف بڑھا۔

☆======☆======☆

غفران اور جانی اس وقت اپنے مخصوص اڈے پر موجود تھے۔ جانی نے اسے تمام واقعات من و عن بیان کر دیے تھے۔ غفران بہت خوش تھا کہ اس کی کوشش سے عصمہ غلط ہاتھوں میں کھلونا بن کر کرچی کرچی ہونے سے بچ گئی تھی۔ اس نے جانی سے تمام تصاویر بھی لے لی تھیں اور ان پر مختلف پہلوؤں سے تبصرہ بھی کر لیا تھا۔ وہ جانی کو باباتجمل کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے ایمان سے ملنے پر زور دے رہا تھا لیکن کوئی ترکیب ذہن میں نہ آ رہی تھی۔

''تم نے تو عصمہ کو اپنی بہن بنا لیا ہے۔'' غفران نے کہا تو جانی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''تو؟'' جانی نے چبھتے ہوئے انداز سے کہا۔

او، بھائیا، لڑتا کیوں ہے؟ ٹھیک ہے وہ تیری بہن ہی سہی۔ مگر ایک بات اس سے کہہ دینا کہ اب وہ کوئی نوکری نہیں کرے گی۔''

''لیکن کیوں؟'' جانی بھی محظوظ ہو رہا تھا۔ ''وہ نوکری نہیں کرے گی تو کھائے گی کہاں سے؟ اور اپنے گھر اور اپنے بھائی کا خرچ کیسے کرے گی؟''

''تم خدانخواستہ فوت تو نہیں ہو گئے نا؟'' غفران کا بھی موڈ بہت اچھا تھا۔''تیری غیرت گوارہ کرے گی کہ تُو سانڈ بن کر بیٹھا رہے اور خوبصورت جوان بہن کام کرتی رہے۔''

''تجھے وہ خوبصورت لگتی ہے؟'' جانی نے اس کی بات پکڑ لی تھی۔

''لگتی کیا ہے، وہ ہے ہی اتنی خوبصورت اور پیاری کہ......'' غفران کو جیسے ہوش آ گیا تھا۔ وہ یک دم جانی کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جو ہنس رہا تھا۔''یہ تم مجھے کس طرف لگا رہے ہو؟''

''غفران بھائی!'' وہ اٹھ کر غفران کے پاس آیا اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔''میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم پیار محبت کی باتوں اور ان جذبات سے بہت دور ہو، لیکن محبت اپنا رنگ ضرور دکھاتی ہے۔ میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں کہ ہم عصمہ کے گھر کا خرچہ اٹھائیں گے۔''

''اوئے! یہ ہم کون؟''

''میں اور تم یعنی غفران بھائی اور جانی۔''

''نہیں!'' وہ تنک کر بولا۔''خرچہ میں ہی دوں گا۔ مگر خرچ تم کرو گے۔ اسے اس کے گھر جا کر ہر ماہ خرچ دے کر آیا کرو گے۔ ہم نے یہ رقم پھونکنی تھوڑا ہے۔ چلو کسی یتیم مسکین کے ہی کام آ جائے تو بہتر ہے۔''

''یہ آج نیکی کا دورہ کیسے پڑا ہے؟'' جانی ہاتھ نچا کر بولا تھا۔''شہر میں صرف وہی اکیلی یتیم و مسکین نہیں ہے اور بھی بہت سے ہیں جو اس کی طرح امداد کے مستحق ہیں۔''

''سارے شہر سے تو میں محبت......'' غفران نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے تھے۔

''ہاں!'' جانی کا دل خوشی سے ناچنے لگا تھا۔''دل کی بات زبان پر آ ہی جاتی ہے۔ میں نے کہا تھا نہ کہ محبت اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ ہاں محبت تو سارے شہر سے نہیں کی جا سکتی وہ تو صرف ایک سے ہوتی ہے اور غفران بھائی تمہیں محبت ہو گئی ہے۔ کیوں نہ ہوتی؟ وہ ہے ہی اتنی معصوم پیاری اور پاکیزہ کہ دل چاہتا ہے کہ اسے دیکھتے ہی رہو۔''

''بس! اب بک بک نہ کر۔'' غفران نے اسے اپنے سامنے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''تجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ محبت اور عشق میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ وہ مجھے پیاری لگتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے محبت ہو گئی ہے۔''

غفران بھائی!'' جانی آج اس سے سچ اگلوانا چاہتا تھا۔''حدیث شریف میں ہے کہ کوئی چیز نہ آتی ہو۔ اس کے پوچھنے اور سیکھنے میں شرم نہیں کرنی چاہیے۔ بالکل اسی طرح اگر

محبت ہو جائے تو چھپانی نہیں چاہیے۔ کیونکہ عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔''

''ہم ایسا کرتے ہیں کہ ایک سکول بناتے ہیں۔ جہاں پہ تُو ہیڈ ماسٹر ہو گا اور عصمہ تیری ٹیچر ہو گی۔ کیونکہ تو پڑھا لکھا ہے اور وہ بھی پڑھی لکھی ہے۔ اس سکول میں ایک وقت میں بچوں کو سپارہ بھی پڑھا دیا کرے گی اور اس کا گھر بخوبی چلتا رہے گا۔'' غفران نے تجویز دی تو جانی نے آگے بڑھ کر اس کا منہ چوم لیا۔

''واہ واہ استاد کیا تجویز دی ہے۔ لگتا ہے کہ ابھی تیرے اندر کا اچھا انسان مرا نہیں ہے مگر اس کے لیے بہت سارا روپیہ درکار ہے۔ موقع پر زمین اور پھر سو بکھیڑے ہوں گے۔''

''تم روپے کی فکر نہ کرو۔ روپیہ بہت ہے میرے پاس۔'' غفران نے اس سے کہا تو جانی برجستہ بول پڑا۔

''کیا ہم اس نیک کام میں یہ حرام کا مال لگائیں گے؟''

''حرام کا مال کیسے ہو گیا؟'' غفران حیرت سے بول پڑا۔

''جو مال بغیر محنت اور جدوجہد کے حاصل ہو۔ اس میں کوئی برکت نہیں ہوتی۔ بے شک کسی بھی عالم سے پوچھ لینا۔''

''میں تیرے ساتھ بحث نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ جب تُو عالموں شالموں کی باتیں کرتا ہے تو مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ کیونکہ میں نے ایک بار سنا تھا کہ تمہیں جب تک مذہب کے متعلق مکمل علم نہ ہو تو بحث مت کرو۔'' غفران نے جانی کو بھی حیران کر دیا تھا۔

''اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو جناب بتائیں گے کہ یہ کس سے سنا تھا؟ اور پھر یہ اچھی بات سرکار نے کیسے سن لی؟ اور پھر اس پر طرہ یہ کہ ذہن میں بھی رکھی؟'' جانی طنزیہ انداز میں اس سے سوال کر رہا تھا۔

''وہ جو اسمٰعیل ہے نا شاہ جی کا خدمت گار۔'' غفران نے جانی کو ایسے بتانا چاہا کہ جیسے وہ شاہ جی اور اسمٰعیل کو جانتا ہو۔''وہ ایک دن بتا رہا تھا۔ یار مجھے تو بڑا خوف آتا ہے اس اسمٰعیل سے۔''

''غفران بھائی!'' جانی نے بات کر کے غفران کو بھی حیرت میں ڈال دیا تھا۔''مجھے تو کوئی ڈر نہیں لگتا اس سے۔ وہ تو بڑی محبت اور خلوص سے سادات کی خدمت کر رہا ہے اور پھر محسن کائنات پر مدحت سرائی کے پھول بھی بڑی عقیدت سے نچھاور کرتا ہے۔''

''پر تم اسے کیسے جانتے ہو؟'' غفران حیران ہو کر بولا۔

''خوش قسمتی سے میں بھی شاہ جی کا مرید ہوں۔'' جانی کی نگاہیں جھک گئی تھیں۔

''یہ تو اچھی اور نیکی کی بات ہے۔ تیری نگاہیں کیوں جھک گئی ہیں؟''

''یہ نگاہیں میں نے شرم سے نہیں۔ بلکہ اپنے مرشد سرکار کے ذکر پر احترام میں جھکائی ہیں۔'' جانی نے کہا تو غفران اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''تُو مرشد سے عقیدت کا اظہار اس طرح بھی کرتا ہے کہ مرشد تجھے دیکھ بھی نہیں رہا اور اس کے ذکر پر تیری آنکھیں جھک گئی ہیں۔''

''غفران بھائی!'' جانی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''میں نے خود کو خوش قسمت بنا لیا ہے کہ میں سادات خاندان کے دستِ حق پر بیعت ہو کر دین اسلام کو پہچاننے لگا ہوں۔ اللہ کی کرم نوازی دیکھو کہ مجھے اس نے ایک ماں دے دی۔ ایک بہن اور پھر تمہارے جیسا پیار کرنے والا بھائی بھی دے دیا۔ یہ سب یقیناً میرے مرشد کا کرم ہے۔ کیونکہ رب کریم کی عنایت اور ان کے وسیلہ سے مجھ جیسے یتیم اور بے سہارا کو کتنے سہارے مل گئے۔'' وہ باقاعدہ رونے لگا تھا۔

جانی کو روتے دیکھ کر غفران ہنسنے لگا اور آگے بڑھ کر گلے لگا لیا۔ ''بیوقوف روتے نہیں۔ تُو تو جوان ہے۔ درخت جتنا جوان ہو کر کمزوروں کی طرح رو رہا ہے۔ مرد بن۔ مرد کبھی بھی رویا نہیں کرتا اور تُو یہ کس ماں کا ذکر کر رہا ہے۔ کیا تُو ماں جی کی بات کر رہا ہے؟''

''ہاں!'' جانی نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''میں تم سے چوری ماں جی سے ملنے جاتا رہتا ہوں۔ میں نے خود کو انہیں تمہارا دوست بتایا ہے۔ بس وہیں شاہ جی اور اسمٰعیل سے بھی ملاقات ہو گئی۔ میں نے ان کی سادگی اور پُر وقار پُر جلال اور پُر عظمت شخصیت دیکھ کر بیعت ہونے کی بات کی۔ تو انہوں نے بھی میری دلی کیفیت کو روحانیت کی محبت بھری نظروں سے جانتے ہوئے مجھے اپنے دستِ حق پر بیعت ہونے کا شرف بخشا ہے۔''

''تم تو بہت اچھے اور خوش نصیب ہو۔'' غفران خوش ہو گیا تھا۔

''اچھا تو پھر سکول کا پروگرام آیا گیا ہو گیا؟'' جانی اس کی بات سن کر مسکرا پڑا۔

''اچھا ایسا کرتے ہیں۔ میں تمہیں تنخواہ پہ کام دیتا ہوں۔'' غفران نے ایک اور تجویز پیش کی تو جانی حیران ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگا۔ ''چپ چاپ سن لینا بعد میں کوئی بات کرنا۔ کیونکہ تم بہت ہی ''اوکھے'' الفاظ بولتے ہو۔''

''اچھا نہیں بولتا اوکھے الفاظ۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہیں۔ یعنی کہ آپ کی اگلی تجویز کیا ہے۔'' جانی مسکرا کر بولا تو غفران اپنی تجویز بلکہ اگلی حکمتِ عملی بتانے لگا۔

''تم میرا کام کرو گے۔ اس کے عوض تنخواہ تمہارے گھر یعنی تمہاری بہن کو ملتی جایا کرے گی۔ تم نے جو بھی خرچہ پانی لینا ہو گا۔ میرے جگر کی حیثیت سے تمہارا ہی سب کچھ ہے۔''

''مجھے کیا کرنا ہو گا؟'' جانی نے پوچھا۔

''تمہیں اس جعلی پیر تجمل حسین کا اتا پتہ معلوم کرنا ہے۔ اس کے لیے جتنے بھی وسائل درکار ہیں۔ انہیں اس دولت سے اپنے ماتحت کر کے چند دنوں میں ہی اس کا پول کھول دو۔ میں اسلام کے نام پر ان نام نہاد پیروں کو مسلمانوں کی عزت سے نہیں کھیلنے دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔ میں آج ہی عصمہ سے اس ایمان کا اتا پتہ معلوم کرتا ہوں اور پھر پاتال کی گہرائی سے بھی اس تجمل بابا کا کھوج نکال لوں گا۔ بس تم اتنی مہربانی کرنا کہ ایمانداری سے میری تنخواہ دیتے رہنا۔'' جانی نے مزاح کے موڈ میں کہا تھا۔

''جتنا بڑا بے ایمان ہو گا۔ وہ اتنا ہی بڑا ایماندار بھی ہو گا۔ وہ اپنا دھندہ ایمانداری سے کرتا ہے۔ کیونکہ اس دھندے سے ہی ان نے اپنے کام چلانے ہوتے ہیں۔'' غفران بھی مسکرا پڑا تھا۔ ''تم پھر عصمہ کو کب بتا رہے ہو کہ آج کے بعد وہ کوئی ملازمت نہیں کرے گی۔''

''وہ میری بہن ہے۔ اس کی منت کر لوں گا۔ لیکن......'' جانی کہتے کہتے رک گیا۔

''لیکن کیا؟'' غفران حیران ہو کر بولا۔

''اگر کچھ پیشگی مل جاتا تو بہتر تھا۔ کیونکہ اس نے سکول بھی چھوڑ دیا ہے اور پھر ابھی تو اس خبیث نے اسے تنخواہ بھی نہ دی ہو گی۔'' اس کا اشارہ احمد باؤ کی طرف تھا۔ ''ایسے میں گھر کا خرچ مہینہ بھر کیسے چلے گا؟ اسے مطمئن کرنے کے لیے ایڈوانس تو لازمی ہے نا؟''

''یہی تو ایک خوبی ہے تم میں۔'' غفران اپنی ران پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''تم بہت دور کی سوچ لیتے ہو۔ مگر یہ تمام بات میرے گھر میں میرے سامنے ہو گی، لیکن میرا نام نہیں آنا چاہئے۔'' جانی نے اس کی طرف استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا تو غفران پھر بول پڑا۔

''وہ مجھے کوئی اچھا آدمی نہیں سمجھتی۔ اگر تم کہو گے کہ میری ملازمت کر رہے ہو تو وہ فوراً سمجھ جائے گی کہ غفران صاحب کی کون سی 'ملیں' چلتی ہیں۔ معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔''

''سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ اس کے حسن سے اپنے من کو ٹھارنا چاہتے ہو۔ مان لے باپ کہ تجھے کچھ نہ کچھ ہو گیا ہے۔'' جانی نے آنکھ دبا کر کہا تو غفران اٹھ کر اسے مارنے کے لیے دوڑا۔

''کچھ تو خیال کرلیا کر۔ وہ تیری بہن ہے۔''

''پر تُو بھی تو میرا جگر ہے۔'' جانی یہ کہہ کر اس کے گلے لگ گیا۔ ''غفران بھائی کبھی بھی اس یتیم اور بے سہارا کا ہاتھ اور ساتھ مت چھوڑنا۔'' غفران نے اس سے علیحدہ ہونا چاہا۔ مگر جانی کا چھا مضبوط تھا۔

''میں اس پیار اور عزت کے قابل نہ تھا۔ یہ سب تمہاری محبت اور میرے مرشد کا کرم ہے۔ مرشد تو مجھے کبھی بھی تنہا نہ چھوڑیں گے۔ نہ یہاں اور نہ وہاں، لیکن تم میرے جگر ہو۔ مجھے اس دنیا میں دردر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے مت چھوڑ دینا۔ یہ میری درخواست ہے۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ غفران نے محسوس کیا کہ اس کے کندھوں پر نمی آ گئی ہے۔ یہ یقیناً جانی کے آنسو تھے۔ اس بار وہ خود کو اس سے جدا کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے دیکھا کہ جانی کی آنکھیں رونے سے سرخ ہوگئی تھیں۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور نظریں جھکی ہوئی تھی۔

''بیگانوں جیسی باتیں کرتا ہے۔ غفران زندگی میں کبھی بھی نہیں رویا۔ تُو اسے رلانا چاہتا ہے۔ ٹھیک ہے بھائیا۔ تیری مرضی، لے دیکھ غفران بھی روئے گا۔ اب تیرے گلے لگ کر خوب جی بھر کر روئے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے زور کا جھپا جانی کو ڈالا۔ ''اوئے جگر تیرے سوا اس دنیا میں غفران کا کون ہے۔ بوڑھی ماں ہم دونوں کی خیریت کے لیے دعائیں مانگ رہی ہوگی۔ چل گھر چلتے ہیں۔'' اس نے جانی کو بازو سے پکڑ کر باہر کی طرف کھینچا۔ اس نے دروازے کو تالا لگایا اور موٹر سائیکل پر بیٹھ کر گھر کی جانب روانہ ہوگئے۔ غفران نے جانی کو دس ہزار روپے ایڈوانس کے طور پر پکڑا دیئے تھے۔ راستہ میں اس نے ماں جی کے لیے، عصمہ اور پھر خالد کے لیے چند چیزیں خریدیں اور کھانا بھی خرید لیا۔ آج غفران کا موڈ تھا کہ وہ کھانا گھر میں ماں جی کے ساتھ کھائے، لیکن عصمہ کا بھی خیال دل سے نہ نکل رہا تھا۔ کیسا منظر ہوگا۔ جب وہ عصمہ کے سامنے بیٹھا کھانا کھا رہا ہوگا۔ وہ شرما جائے گی۔ نہیں نہیں...... میں شرما جاؤں گا۔ عصمہ تو پڑھی لکھی ہے۔ وہ کیوں شرمائے گی۔ غفران سوچوں میں کافی آگے نکل جاتا اگر جانی اسے آواز نہ دیتا کہ ''گھر ادھر ہے۔ کدھر جا رہے ہو بڑے بھائی!'' غفران نے چونک کر موٹر سائیکل گھر جانے والی سڑک پر موڑ دی۔

''میں تو کہتا ہوں کہ مان جاؤ۔ تمہیں مکتبِ عشق میں داخلہ مل چکا ہے۔'' جانی نے پیچھے سے اس کے کان میں کہا تو غفران ہنس کر کہنے لگا۔

''اب اگر بکواس کی تو موٹر سائیکل کسی دیوار میں دے ماروں گا۔'' اور جانی

گھر جانے تک خاموش ہی رہا۔ ماں جی ان دونوں کو دیکھ کر حیران اور خوش بھی ہوئیں۔ جانی نے ماں جی کو کہا تھا کہ وہ غفران کو نہ بتائے کہ میں اس کے گھر آتا جاتا ہوں۔ اسی وجہ سے وہ حیران ہوئی تھیں۔

''آج میرا پُتر گھر کا راستہ کیسے بھول گیا ہے؟'' انہوں نے غفران کو دیکھتے ہوئے کہا۔ جو منہ ہاتھ دھونے کے لیے حمام کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''لو!'' وہ واپس مڑا۔ آج خوشگوار موڈ میں لگ رہا تھا۔ ''کبھی بھول چُوک کے گھر آ بھی جاؤ تو طعنے مارنا شروع کر دیتی ہے۔'' جانی چارپائی پر بیٹھ چکا تھا۔ کھانے کے شاپر اس نے ماں جی کو پکڑا دیئے تھے اور شاپنگ والے شاپر اس نے ایک طرف رکھ دیئے۔ ماں جی کے پوچھنے پر اس نے ٹال دیا کہ کسی کی امانت ہے۔

''ماں جی آپ کھانا گرم کریں۔ میں اپنی بہن کو لے کر آتا ہوں۔'' جانی اٹھ کر جانے لگا تو ماں جی کی استعجاب سے بھری آواز آئی۔

''پر تُو تو کہتا تھا کہ تُو اکیلا اکیلا ہے۔ یہ آج بہن کہاں سے آگئی؟''

اس نے ماں جی کو مختصراً بتا دیا کہ اس نے عصمہ کو اپنی بہن بنا لیا ہے۔ اب اس کی اس دنیا میں کافی رشتہ داری ہے۔ وہ مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔ ماں جی باورچی خانے میں چلی گئیں۔ غفران نے تولیے سے منہ ہاتھ صاف کیا اور کنگھی کر کے اپنے الجھے ہوئے بالوں کو سنوارنے لگا۔ اس نے آج اپنا بغور جائزہ لیا تھا۔ وہ ہر طرف سے ''فٹ فاٹ'' نظر آنا چاہتا تھا۔

ماں جی اسے کافی دیر سے دیکھ رہی تھی۔ ''یہ آج اتنا بن سنور کر کدھر جا رہے ہو؟''

''بس یونہی اپنے آپ کو صاف رکھنے کو دل کرنے لگا ہے۔'' اس نے شیشہ چھوڑ کر چارپائی پر بیٹھنا چاہا تو ماں جی کی آواز آئی۔

''یہ کھانا چٹائی پر رکھ۔ ابھی عصمہ اور جانی آتے ہی ہوں گے۔'' غفران باورچی خانے کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے کبھی خود پانی کا گلاس بھی نہ بھر کر پیا تھا۔ آج نہ جانے کیوں کام پر کام کیے جا رہا تھا۔ ''اللہ تعالیٰ نے کتنا حسن اور کتنا نور رکھا ہے عصمہ کے چہرے پر۔'' ماں جی نے اسے روٹیوں کی چنگیر پکڑاتے ہوئے کہا۔

''تو میں کیا کروں اس میں؟'' غفران باہر صحن میں بچھی چٹائی پر آن بیٹھا۔

''جانتا ہے اتنا نور اس کے چہرے پر کیوں ہے؟'' پھر ماں جی بولیں۔

''نہیں جانتا۔ خود ہی بتا دے۔'' وہ باہر سے ہی بولا۔

''بے وقوفا! اس نے قرآن پاک حفظ کیا ہوا ہے۔'' ماں جی بھی دیگر سامان اٹھائے باہر آ گئیں۔

''وہ روزانہ اسے پڑھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے چہرے پر نور بکھیر دیا ہے۔''

غفران چاہتا تھا کہ ماں صرف عصمہ کی ہی باتیں کرتی رہے۔

''وہ اتنی پیاری ہے کہ دل چاہتا ہے۔ بس اسے دیکھتے ہی رہیں۔''

''تیرا دل کیوں چاہتا ہے؟ تُو تو خود عورت ہے۔'' غفران درمیان میں بول پڑا۔

''اپنے منہ اور سر کو صاف تو کر لیا ہے۔ مگر تیری پٹھی مت نے اندر سے غفران کو ابھی باہر نہیں نکالا۔ بہتیرا تجھے کہا تھا کہ پڑھ لے۔ لکھ لے۔ سمجھدار ہو جائے گا۔ پر...... تیرا ابا بھی تجھے سمجھا سمجھا کر مر گیا۔ وہ بے چارا خود تو نہ پڑھا لکھا تھا۔ مگر چاہتا تھا کہ اس کی اکلوتی اور نکمی اولاد کچھ نہ کچھ ضرور بن جائے۔ پر تُو کیا بن گیا ہے؟''

''مجھے ذلیل کر رہی ہے یا ٹھیک کر رہی ہے۔'' غفران نے ناک چڑھا کر کہا۔ تو ماں جی ہنسنے لگیں۔

''تجھے ٹھیک تو کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ ہاں البتہ عصمہ تجھے ٹھیک کر سکتی ہے۔''

عصمہ کے نام پر غفران کی تمام رگیں تن گئیں۔ وہ مزا لیتے ہوئے بولا۔

''اس کے پاس کیا پلاس اور پلگ پانے ہوتے ہیں اور میرا کون سا کوئی انجن خراب ہے؟''

''میرا مطلب تھا کہ میں نے اس سے بات کی ہے۔'' ماں جی نے کہا تو غفران چٹائی سے پھڑک کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا مطلب؟'' وہ حیرت سے بولا۔ اس کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ جو بھی بات ہے ماں جی جلدی جلدی اپنی زبان سے کہہ دیں۔

''مطلب یہ کہ میرا پتر اس سے قرآن پاک پڑھے گا۔'' ماں جی نے کہا تو غفران کے غبارے سے ہوا نکل گئی۔

''میں اتنا بڑا ہو گیا ہوں۔ اب مجھے شرم نہ آئے گی۔ ایک جوان لڑکی سے قرآن کریم پڑھتے ہوئے۔'' وہ دوبارہ بیٹھ گیا تھا۔

''شرم کیسی؟'' ماں جی نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ شاید پریشان ہو گئی تھیں کہ جانی اور عصمہ ابھی تک کیوں نہیں آئے۔ ''اتنا بڑا ہو کر گناہ کرتے ہوئے بھی کبھی شرمایا ہے؟''

''کون سے گناہ۔ اپنا حق چھیننا کوئی گناہ نہیں ہے۔'' وہ تنک کر بولا۔

''غلط آدمیوں کی صحبت میں بیٹھنا۔ ان کے حکم پر یہ دنگا فساد۔ خونریزی۔ ان کا غلط کاروبار سنبھالنا۔ گناہ نہیں تو اور کیا ہے؟''

''یہ سب کچھ تجھے کس نے بتایا ہے؟'' غفران پریشان ہو گیا تھا کہ ماں کو اس کے تمام دھندوں کی خبر ہے۔ وہ تو صرف اتنا جانتا تھا کہ ماں کو صرف اس کے لڑائی جھگڑوں کا معلوم ہے۔

''کبھی شاہ جی کے ہاں بھی چلا جایا کر۔ تیری پُٹھی مت سیدھی ہو جائے گی۔ وہ دیکھ اسمٰعیل جنت کما رہا ہے۔ بڑی سیوا کرتا ہے شاہ جی کی۔ اللہ ایسی نیک اولاد سبھی کو دے۔'' ماں جی نے اسمٰعیل کی تعریف کی تو وہ چڑ گیا۔

''اور...... میرے جیسی اولاد؟'' اس کے لہجے میں سوال تھا۔ اتنی دیر میں بیرونی دروازہ کھلا۔ جانی اور عصمہ آگے پیچھے چلتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ عصمہ نے حسب معمول چادر سے تمام جسم ڈھانپا ہوا تھا اور چہرے پر نقاب تھا۔ اس نے ماں جی کو سلام کیا اور پھر نگاہوں سے غفران کو سلام کیا تو غفران کا دل دھڑک کر سینے سے باہر آنے کو کرنے لگا۔ وہ اپنی دھڑکنوں کی آواز مسلسل سن رہا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ کہیں کوئی اس کی یہ چوری نہ پکڑ لے۔ ماں جی نے اٹھ کر عصمہ کا ماتھا چوما اور اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا۔

''خالد کہاں ہے۔ وہ نہیں آیا کیا؟ اس نے کھانا نہیں کھانا تھا؟'' ماں جی نے عصمہ سے پوچھا۔ جو نقاب اتار کر شرماتی جھجکتی اور اپنے آپ کو سمیٹتی ہوئی بولی۔

''پتہ نہیں ماں جی!...... کیا بات ہے؟ کتنے ہی دنوں سے وہ کھانا نہیں کھا رہا اور اس کی صحت بھی گر رہی ہے۔ مجھے تو ایک بار پھر اس کی فکر لاحق ہو گئی ہے۔ میں اس کی وجہ سے بہت پریشان رہتی ہوں۔''

عصمہ کی پریشانی کا سن کر غفران بھی پریشان نظر آنے لگا تھا۔ مگر اس نے ظاہر نہ کیا تھا۔

''اللہ خیر کرے۔ دھی رانی تُو مجھ سے تو بات کرتی ہم شاہ صاحب سے بات کرتے۔ خدانخواستہ کوئی پھر جن وغیرہ کا معاملہ نہ ہو؟''

جانی اور غفران ان کی گفتگو سن رہے تھے۔ عصمہ پھر بولی جبکہ اس کی نظریں متواتر جھکی ہوئی تھیں۔

''مجھے تو پہلے والی کوئی بات نہیں لگتی، لیکن وہ کئی کئی گھنٹے بے سدھ ہو کر اتنا

ہے۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسپیشلسٹ کو دکھایا جائے۔ آپ میرے ساتھ چلیں گی؟"

"کیسی باتیں کرتی ہو عصمہ بہن؟" جانی بول پڑا۔ "اب میری ذمہ داری ہے۔ تمہاری پریشانی، تمہارا دکھ، سکھ سب کچھ میرا مسئلہ ہے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اب کھانا کھانے کی بہت ضرورت ہے۔ کیونکہ بھوک سے میری اور غفران کی آنکھیں بھی اندر کو دھنس رہی ہیں۔" جانی کی بات ختم ہوتے ہی تمام لوگ ہنس پڑے۔

بڑے پُرسکون ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ ماں جی ابھی برتن ہی سمیٹ رہی تھیں کہ دروازہ زور زور سے پیٹا جانے لگا۔

"کون ہے اوئے۔" غفران نے اپنے روایتی انداز میں کہا تو فوراً ہی اسے احساس ہو گیا کہ عصمہ نے اس کی اس آواز پر کوئی اظہارِ ردِعمل نہ ظاہر کیا تھا۔

وہ اٹھ کر دروازہ کھولنے کے لیے گیا۔ دروازہ کھولتے ہی اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں دو نوجوان لڑکوں نے خالد کو اٹھایا ہوا تھا۔ ان کے ساتھ ایک بزرگ بھی تھا۔ جو کہ محلے دار ہی تھے۔ خالد ان کے ہاتھوں میں بے ہوش تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔

"یہ ساتھ والی گلی میں بے ہوش ہو کر گرا ہوا تھا۔" بزرگ نے کہنا شروع کیا۔ جبکہ عصمہ، ماں جی اور جانی بھی بھاگ کر باہر دروازے پر پہنچ چکے تھے۔

"ہم اسے اٹھا کر پہلے باجی عصمہ کے گھر لے گئے تھے۔ مگر وہاں سے پتہ چلا کہ آپ ماں جی کے پاس ہیں۔" بزرگ نے عصمہ کو باجی کہا تھا۔ کیونکہ ان کے بچے عصمہ سے قرآنِ کریم کی تعلیم لیتے تھے اور وہ اسے باجی کہتے تھے۔ اسی لحاظ سے بچوں کے والدین بھی اس کی عزت کرتے تھے۔

جانی نے فوراً خالد کو اپنے کندھوں پر اٹھا لیا اور غفران کو موٹر سائیکل سٹارٹ کرنے کا کہا۔ عصمہ رونے لگی تھی۔ جانی اور ماں جی اسے حوصلہ دے رہے تھے۔

غفران نے موٹر سائیکل قریبی ہسپتال کی طرف دوڑا دی۔ ماں جی نے عصمہ کو اپنے گلے سے لگا لیا تھا۔

"فکر نہ کر میری دھی۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی غفران آ جائے گا۔ خالد ماشاء اللہ بھلا چنگا ہو گا۔ تم دیکھنا۔" ماں جی اسے بہلا رہی تھیں۔ جبکہ اس کی بے چینی اور انجانے خدشے اسے اندر ہی اندر سے کھا رہے تھے۔

والدین کے بعد خالد ہی اس کا سہارا تھا۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو......؟ اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکی۔ بس آنکھوں نے ساون کی جھڑی لگا دی۔

اسی پریشانی میں ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا تھا۔ بے چینی اور مضطربانہ کیفیت میں عصمہ کی اپنی حالت بھی غیر ہو رہی تھی۔ گلی میں ہوٹر کی آواز سن کر وہ کانپ کر رہ گئی۔ وہ بھاگی بھاگی باہر گلی میں پہنچی تو ایک ایمبولینس آ کر ماں جی کے دروازے کے سامنے رک گئی۔ اس کے پیچھے ہی غفران کی موٹر سائیکل بھی تھی۔ جبکہ جانی پیچھے بیٹھا رو رہا تھا۔ پورا محلہ ایمبولینس کے سائرن کی آواز سن کر اکٹھا ہو گیا تھا۔ جانی اور غفران نے مل کر ایمبولینس سے سٹریچر نکالا تو اس پر خالد لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ جبکہ اس کے گلے میں قمیض بھی نہ تھی۔ اس کا رنگ نیلا ہو چکا تھا۔ عصمہ یہ اندوہناک منظر دیکھ کر وہیں دھڑام سے گر گئی۔ ماں جی نے روتے ہوئے اسے اٹھانے کی کوشش کی، لیکن وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ اتنا بڑا صدمہ تقدیر نے اس کے مقدر میں لکھ دیا تھا کہ وہ اپنے بھائی کی لاش دیکھ کر سہہ نہ سکی۔ خالد کی لاش کو چارپائی پر ڈال کر صحن میں رکھ دیا گیا۔ غفران کا صحن عورتوں سے بھر گیا تھا۔

وہ جانی کو دلاسا دے رہا تھا اور جانی اسے حوصلہ کرنے کی تلقین کر رہا تھا۔ بڑی بوڑھی عورتیں عصمہ کو ہوش میں لانے کی کوششیں کر رہی تھیں۔ باہر گلی میں دریاں بچھ گئی تھیں۔ قناتیں لگ گئی تھیں۔ غفران کو یاد آ رہا تھا کہ ایسا منظر اس کے ابا کے فوت ہونے پر اس نے دیکھا تھا۔ محلے دار جوق در جوق آ رہے تھے۔ عصمہ کو ہوش آیا تو وہ چیخ مار کر بھائی کی لاش سے لپٹ گئی۔ اس کے دل دہلا دینے والے بین سن کر پتھروں کے دل پسیج گئے ہوں گے۔ وہ بار بار غشی کھا رہی تھی۔ اس کا معصوم بھائی۔ اس کا خالد اس دنیا سے اس بہن سے منہ موڑ گیا تھا۔

"دیکھنا عصمہ آپی۔ میں تمہاری رخصتی پر بہت روؤں گا۔ میں تمہیں جانے نہیں دوں گا۔"

"میں تمہاری مہندی پر ناچوں گا۔ بارات والوں کو اچھی طرح ہینڈل کروں گا۔ کیونکہ اب تمہارا باپ اور تمہاری ماں میں ہی تو ہوں۔" عصمہ کو اس کی ہر بات یاد آ رہی تھی۔ ہر ادا یاد آ کر خون کے آنسو آنکھوں سے اگلنے پر مجبور کر رہی تھی۔

وہ عصمہ کو رخصت ہوتے ہوئے نہ دیکھ سکا تھا۔ اس کی بارات کو اچھی طرح ہینڈل نہ کر سکا تھا۔ بلکہ عصمہ کو کبھی نہ بھولنے والا غم دے کر ہمیشہ ہمیشہ موت کی وادی میں پُرسکون نیند سو گیا تھا۔

کسی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ خالد کی موت کیسے ہوئی؟ لوگ غفران اور جانی سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے۔ وہ اپنے غم کو ضبط کر کے ان کے جوابات دے رہے تھے۔ محلّے کے بزرگ مرد غفران اور جانی کو حوصلہ اور دلاسہ دے رہے تھے۔

عصمہ سے قرآنِ کریم پڑھنے والے بچے اور بچیاں بھی اپنی باجی کو روتا دیکھ کر زار و قطار رو رہے تھے۔ ماں جی بھی غم سے نڈھال تھیں۔

باہر دریوں پر بیٹھے کسی نے کہا۔ ''شاہ صاحب آ گئے ہیں۔''

یہ آواز سن کر غفران اور جانی تو کھڑے ہو گئے۔ ان کی تقلید اور شاہ صاحب کے احترام میں باقی لوگ بھی کھڑے ہو گئے۔ جبکہ انہوں نے سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ خود بھی دری پر بیٹھ گئے۔ اسمٰعیل ہمیشہ کی طرح ان کے ساتھ تھا۔

''غفران میاں!''...... وہ بولے تو انداز وہی محبت بھرا، ٹھہرا ہوا پُر شفقت لہجہ۔ مگر آج غم میں ڈوبا ہوا تھا۔ ''زندگی موت تو رب ذوالجلال کے ہاتھ میں ہے۔ اس عظیم ذات کے ساتھ کوئی لڑائی یا گلہ شکوہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ وہی کرتا ہے جو اس کی مرضی ہوتی ہے اور اس کی مرضی ہمیشہ انسان کے لیے بہتری ہی کرتی ہے۔ اس معصوم بچے کی موت پر مجھے ذاتی دکھ ہے، لیکن اس مالک کی ذات کے حکم پر سر جھکا کر صبر کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔'' وہ خاموش ہوئے تو سوگ میں ڈوبے ہوئے جانی نے آگے بڑھ کر کچھ کہنا چاہا تو شاہ جی نے اسے روک دیا۔

''اس لمحہ پر جو بات تمہاری زبان پر آئے گی۔ وہ لوگوں کو تمہاری ذات پر بھی انگلی اٹھانے پر مجبور کر دے گی۔ بعد میں بات کریں گے۔ تجہیز و تکفین کا بندوبست کرو۔ اللہ تمہیں اور اس بیٹی کو بھی صبر جمیل عطا فرمائے۔'' شاہ جی نے منہ ہی منہ میں پڑھنا شروع کر دیا۔

آنسوؤں نے عصمہ کے خوبصورت نرم و نازک گالوں پر لکیریں ہی بنا دی تھیں۔ یہ آنسو بھی بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ بس نمکین پانی ہے اور پانی کا کوئی بھی رنگ نہیں ہوتا۔ یہ رنگ بدلتے موسموں کی طرح، اس دور کے بدلتے مزاج انسانوں کی طرح ان کا بھی کوئی مزاج نہیں ہوتا۔ یہ غمزدہ لوگوں کی محفل میں غمگین مزاج کی بجائے چھل چھل کرتے ہوئے آنکھوں کو بھگوتے ہوئے ان کے حصار کو توڑ کر باہر نکل آتے ہیں۔ جبکہ خوشی ہو تو ان کی اداسی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں ہوتا۔ تب بھی یہ آنکھوں کے قید خانے میں رہنا پسند نہیں کرتے۔ اب بھی اپنے آپ کو مکمل طور پر بہا کر عصمہ کی آنکھوں میں سرخی بنا دی تھی ان آنسوؤں نے۔ اب اس کے دل پر گر رہے تھے۔ کیونکہ انہوں نے ایک نیا

راستہ ڈھونڈ لیا تھا۔

دل پر گرنے والے آنسو بظاہر انسان کو ہنسنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ مگر کسی موقع پر بھی یہ اپنی اہمیت اور افادیت نہیں کھوتے۔ ان پر کسی کا بس نہیں چلتا۔ ترلے اور منتوں والے انسان بھی انہی کا شکار ہوتے ہیں۔ بڑے سے بڑا فنکار اور وڈیرہ بھی۔ حتیٰ کہ ملک کا سربراہ بھی ان کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے۔ یہ کسی کا بھرم نہیں رکھتے۔ سرِ محفل ہی انسان کو ننگا کر دیتے ہیں۔ اس قدر مجبور اور بے بس کر دیتے ہیں کہ انسان کا ان پر کوئی بس نہیں چلتا۔ یہ اپنی مرضی کر کے چلتے بنتے ہیں۔

جانی اور غفران جوان اور ہٹے کٹے مرد تھے۔ مگر غم کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک دوسرے سے آنکھیں چھپا کر ان ظالم اور بے رحم آنسوؤں کو باہر نکال رہے تھے جو ان کی آنکھوں کی قید یا بندش برداشت کرنے سے قاصر تھے اور چھل چھل کر باہر نکل رہے تھے۔

مغرب کی نماز کے بعد خالد کا جنازہ اٹھایا گیا۔ عصمہ پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ اس محلّہ کی مضبوط اعصاب والی عورتیں بھی رو رہی تھیں۔ اک کہرام سا مچ گیا تھا۔ اس معصوم کے جنازے پر یوں لگتا تھا کہ گویا پورا شہر ہی اُمڈ آیا ہو، لیکن پورے شہر کو کیا پڑی ہے کہ وہ کسی کے دکھ درد میں شریک ہو۔ ہاں البتہ اتنا ضرور تھا کہ جہاں جہاں سے جنازہ گزر رہا تھا۔ لوگ احترا[illegible] کھڑے ہو جاتے تھے۔ یہ میرے ملک کے عوام کی بہت مہربانی ہے کہ وہ جنازوں کا احترام ضرور کرتے ہیں۔

خالد کی تدفین کے بعد کا منظر غفران اور جانی کے لیے بہت جان لیوا تھا۔ کیونکہ وہ دونوں ہی عصمہ کا سامنا کرنے سے کترا رہے تھے۔ محلّہ دار پُرسہ اور دلاسہ دے کر اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے۔

اب شاہ جی، اسمٰعیل، ماں جی، جانی، غفران ہی تھے جو عصمہ کو دلاسا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

''اللہ تعالیٰ نے تمہارے سینے میں اپنی مقدس کتاب کو امانتاً رکھ دیا ہے۔'' شاہ جی عصمہ کو دلاسہ دے رہے تھے۔ جو ان کے سامنے نظریں جھکائے، سرخ ناک اور سوجی ہوئی آنکھوں سے دو زانو بیٹھی ہوئی تھی۔ ''اس کتاب میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ میری بچی اس اندوہناک غم پر میں تمہیں کوئی کھلونا دے کر بہلا نہیں سکتا۔ کیونکہ تم سے تمہارا کھلونا جدا ہوا ہے۔ جو دوبارہ کسی بازار یا منڈی سے نہیں ملتا۔ اس کھلونے کا کوئی بھی نعم البدل نہیں ہے، لیکن رب ذوالجلال کسی کو بھی اس کی قوت

برداشت سے زیادہ دکھ، تکلیف، یا غم نہیں دیتا۔'' شاہ جی کچھ دیر کے لیے رکے تو عصمہ کے آنسو جواب تک رک گئے تھے۔ شاہ صاحب کی محبت بھری حوصلہ افزا باتوں سے دوبارہ بہنے لگے۔

''رب تعالیٰ نے تمہیں جانی کے روپ میں ایک بھائی دے کر تینوں ہی رشتے پورے کر دیئے ہیں۔ کیونکہ جانی عمر میں تم سے بڑا ہے۔ آج سے تمہارا باپ، تمہاری ماں اور تمہارا بھائی بھی جانی ہی ہے۔ اس کی ذات پر اعتماد کرنے کی میں ضمانت دیتا ہوں۔ تمہارے چھن جانے والے بےلوث اور مخلص رشتوں کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ مگر رب تعالیٰ نے وقت بہت بڑا مرہم اور صبر بہت بڑا پتھر بنایا ہے۔ جسے ہم سب کو اس کی رضا سمجھ کر اپنے دلوں پر رکھنا پڑتا ہے۔ بس میری بچی یہ سوچ کر صبر کر لے کہ تیرا دکھ اور تیرا غم کربلا کے شہداء سے بڑا نہیں ہے۔ صغریٰ رضی اللہ عنہا اور زینب رضی اللہ عنہا کے بھی تمام خاندان نے ان کے سامنے جام شہادت نوش کئے تھے۔ سکینہ شہید ہونے والے اپنے معصوم بھائیوں کے اجسام مبارکہ سے لپٹ لپٹ کر رونا چاہتی تھی۔ مگر کاتب تقدیر کی مرضی نہ تھی۔'' یہ کہہ کر شاہ جی کی آواز بھرا گئی تھی۔ ''اللہ تعالیٰ نے صبر پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی۔ انہوں نے اپنے عظیم ہونے کا ثبوت دیا اپنے نانا جان صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے راستوں پر چل کر مشیت ایزدی کے سامنے سر جھکایا اور سرخرو ہوئے۔ ہم ان کے گناہگار خادم ہیں ہمیں بھی رب کریم کے حکم پر اور اہل بیعت کی تقلید پر عمل پیرا ہو کر صبر کرنا ہوگا۔ ورنہ وہ خالق کائنات ناراض ہو جائے گا۔ میری بچی مجھے امید ہے کہ تم صبر کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑو گی۔ یہ گھر اور اس کی دہلیز تمہارے لیے بابرکت ثابت ہوگی اور تمہارے مقدروں والے قدم اس گھر کے لئے خوش قسمتی اور اللہ کی رحمت کے دروازے کھول دیں گے۔'' یہ کہہ کر شاہ جی نے اٹھتے ہوئے عصمہ کے سر پر ہاتھ رکھا اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر اس پر پھونک دیا۔

شاہ صاحب تو چلے گئے۔ مگر ان کی پھونک نے عصمہ کے لیے اکسیر کا کام کیا تھا۔ اس نے رونا بند کر دیا تھا۔ ماں جی اس کے لیے دودھ گرم کر کے لے آئی تھیں۔ عصمہ نے انکار کیا تو انہوں نے زبردستی اسے دو چار گھونٹ پلا دیئے۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ ماں جی کی گود میں ہی سر رکھے لیٹے لیٹے گہری نیند سو گئی تھی۔

غفران اور جانی ماں جی کو بتا کر گھر سے باہر نکل آئے۔ ملنے جلنے والوں نے ان سے افسوس کیا۔ وہ دونوں پیدل ہی چلتے ہوئے بازار کی طرف نکل گئے۔

''ڈاکٹرز کے مطابق خالد کی موت زیادہ منشیات لینے کی وجہ سے ہوئی ہے۔'' جانی

نے بات شروع کی تو غفران نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''غفران بھائی۔ اس معصوم بچے سے ان درندوں کی کیا دشمنی ہو سکتی ہے۔''

''وہی جو میری اور شیخ عمر حیات کی ہے۔'' غفران نے فی البدیہہ جواب دیا تو جانی حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ ''ہاں جانی، میں جانتا ہوں کہ جس سکول میں خالد پڑھتا تھا۔ اس میں منشیات کون سپلائی کرتا ہے۔ اس تمام گروپ کا سربراہ ماجھو ہے۔ جو شیخ عمر حیات کا خاص بندہ ہے۔'' وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ تو جانی بول پڑا۔

''تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں عصمہ کے آنسو پونچھنا چاہتا ہوں۔''

''حکم کرو۔''

''مجھے دو دن بعد ماجھو اپنے اڈے پر چاہئے۔''

''اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ کیونکہ وہ تو ایک کٹھ پتلی ہے۔ اس کی ڈور شیخ کے ہاتھ میں ہے۔ ان ڈوریوں کو ہلانے والے ہاتھوں کو قابو کرو غفران بھائی۔''

''کھل کر کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔'' اس نے جانی کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''عصمہ کے آنسو پونچھنے کے لیے میں بھی بے چین ہوں۔ مگر تمہاری رضامندی کے بغیر میں کوئی بھی انتہائی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ مشورہ یہ ہے کہ اس ملک سے ہیروئن اور نشہ کی لعنت تب تک ختم نہ ہوگی جب تک یہ کسی صدر، وزیر اعظم یا پھر کسی صوبائی وزیر کے جوان بیٹے کو اپنی لپیٹ میں نہ لے گی۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' غفران نے جانی کی بات نہ سمجھنے والے انداز میں ہاتھ ہلا کر پوچھا۔

''میں احمد آباد کو اس نشہ کی لت پڑتی دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس شہر میں اس کاروبار کا کرتا دھرتا شیخ عمر حیات ہی ہے۔ اس کے گھر کا واحد چراغ میں اسی کی پھونکوں سے بجھانا چاہتا ہوں۔'' جانی نے کہا تو غفران کو اس کے خطرناک عزائم کا علم ہو گیا۔ وہ بھی عصمہ کو روتا ہوا چھوڑ کر آیا تھا اور عصمہ کے آنسو پونچھنے کے لیے انہوں نے خطرناک لائحہ عمل تیار کر لیا تھا۔

''شیخ عمر حیات! اب تمہاری زندگی سے خوشیاں روٹھ گئی ہیں۔'' غفران بڑبڑانے لگا۔ بڑبڑاہٹ اس قدر بلند تھی کہ جانی بھی سن سکتا تھا۔ وہ پھر بڑبڑایا۔

''آج سے اپنی خوشیوں پر ماتم کرنا شروع کر دو عمر حیات، کیونکہ تم نے معصوم اور

پاکیزہ عصمہ کو رُلایا ہے۔ غفران کی عصمہ کو رُلایا ہے۔ اپنے عبرت ناک انجام کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

☆======☆======☆

شیخ عمر حیات اور اس کی فیملی باباجی کے لیے شاپنگ کر رہے تھے۔ باباجی نے انہیں بتایا تھا کہ اس کی سالگرہ آ رہی ہے۔ ملیحہ، احمد باؤ اور عالیہ بیگم اپنی اپنی طرف سے ایک منفرد اور قیمتی تحفے کی تلاش میں تھے۔ وہ کئی شاپنگ سنٹرز اور گفٹ شاپس دیکھ چکے تھے۔ ابھی تک کوئی بھی چیز ان کو متاثر نہ کر سکی تھی۔

شیخ صاحب نے تقریباً بیس پچیس اعلیٰ کپڑے کے سوٹ خرید لئے تھے۔ نفیس کپڑا یقیناً کافی قیمتی تھا۔ اس کی مالیت ہزاروں روپوں میں بن گئی تھی۔ دکاندار جو کہ شیخ کو جانتا تھا۔ اس نے شیخ کی طرف سے دیا ہوا ہزاروں روپوں کا چیک چوم کر رکھ لیا۔ یقیناً اس کی اس بے ذوق گاہک سے چاندی ہو گئی تھی۔

عالیہ بیگم نے باباجی کے لیے ایک قیمتی گھڑی پسند کی تھی۔ وہ گزشتہ کئی دنوں سے سرشاری اور بے خودی کی سی کیفیت میں مست تھی۔ اس کے چہرے پر طمانیت اور سکون تھا۔ اسے مدتوں بعد خوشی محسوس ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ مدتوں تپتی ہوئی دھوپ میں چلنے والے مسافر کو اچانک ایک میٹھے پانی کا کنواں مل گیا ہو جو کہ لبالب بھرا ہو۔ اس مسافر کی پیاس بجھانے کے لیے اس کنویں کا سامنے آ جانا یقیناً مسافر کے لیے معجزہ سے کم نہیں تھا۔ یہی حالت عالیہ بیگم کی تھی۔ وہ خود کو ہشاش بشاش اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ اب وہ مزید جان توڑ کر باباجی کی ''خدمت'' میں لگ گئی تھی۔ کیونکہ وہ اس کنویں کو کبھی بھی خشک نہ ہونے دینا چاہتی تھی۔

ملیحہ نے بھی باباجی کے لیے ایک سونے کی چین اور ایک بریسلیٹ پسند کیا تھا۔ بازار میں ہر کسی دکاندار کی خواہش تھی کہ یہ موٹی آسامی ان کی دکان میں آ کر خریداری کرے۔ مگر ان کے نخرے بہت اونچے تھے۔ وہ کسی بھی ایسی دکان میں نہ جاتے تھے جس میں سینکڑوں روپوں کی اشیاء اور گفٹس فروخت ہوتے تھے۔ بلکہ ہزاروں والی مالیت کی دکان میں جا کر راحت محسوس کرتے تھے۔ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا، لیکن احمد باؤ کو کچھ بھی پسند نہ آیا تھا۔

اس نے اپنی شاپنگ اگلے دن کرنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ تمام فیملی کا پروگرام تھا کہ شاپنگ دوبئی جا کر کی جائے۔ مگر باباجی نے ان پر کرم کیا اور خود کسرِ نفسی سے کام لیتے ہوئے انہیں دوبئی جانے سے روک دیا تھا۔

احمد باؤ ویسے بھی بجھا ہوا تھا۔ عصمہ کے جانے کے بعد اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ زندگی کی گاڑی کو کیسے دھکیلے۔ اس نے کئی بار عصمہ کے گھر کے چکر لگائے تھے۔ مگر دروازے پر پڑا تالا دیکھ کر ناکام و نامراد لوٹ آتا تھا۔ پتہ نہیں وہ بن بتائے کہاں غائب ہو گئی تھی۔ وہ ناراض کیوں ہوئی تھی۔ اسے عصمہ کی ناراضگی اور فرم سے استعفیٰ کی اطلاع اس کی سیکرٹری نے دے دی تھی۔ کیونکہ عصمہ نے یہ اطلاعات ڈائریکٹ احمد باؤ تک نہ پہنچائی تھیں۔

گھر میں سبھی کو پتہ چل گیا تھا کہ احمد باؤ کسی لڑکی کے چکر میں چکرا کر رہ گیا ہے۔ مگر عصمہ کا نام اس نے صیغہ راز میں رکھا تھا۔

وہ بازار سے واپس جا رہے تھے کہ بالکل بازار کے باہر عصمہ اور ماں جی پر احمد باؤ کی نظر پڑ گئی۔ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شیخ نے بھی ان دونوں کو دیکھ لیا تھا۔ وہ عصمہ کی شکل وصورت سے واقف تھا۔ کیونکہ وہ اس کی سالگرہ میں احمد باؤ کی مہمان کی حیثیت سے شرکت کر چکی تھی۔ جبکہ ماں جی کو دیکھ کر اس کی بھنویں سکڑ گئی تھیں۔ احمد باؤ نے گاڑی ایک طرف روک کر جلدی سے دروازہ کھولا۔ اس سے پہلے کہ شیخ تمام معاملہ سمجھتا اور احمد کو روک پاتا، احمد تیزی سے باہر نکل چکا تھا۔ شیخ غصے سے پیچ وتاب کھانے لگا۔ ملیحہ اور عالیہ بیگم کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ احمد اس لڑکی کے لیے پاگل ہو رہا تھا جو نذیراں کے ساتھ تھی۔ یقیناً اس کی ہی کوئی بھتیجی، بھانجی ہو گی اور احمد باؤ اپنے ملازموں سے بھی بدتر لوگوں کی منت سماجت والے انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔

''آپ کو بتانا ہو گا کہ میرا قصور کیا ہے۔'' وہ عصمہ سے لجاجت بھرے لہجے میں بولا تھا۔ ''ماں جی آپ ہی اسے سمجھائیں۔ میں کئی دنوں سے اسے ڈھونڈ رہا ہوں۔ پلیز آپ بتائیں۔ کیا بات ہے۔ آپ کیوں ناراض ہیں؟''

''چلیں ماں جی۔'' عصمہ نے اس کی منت سماجت نظر انداز کرتے ہوئے ماں جی سے کہا تو احمد ماں جی کا بازو پکڑ کر ان کی منت کرنے لگا۔

''کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے بغیر زندہ نہیں رہا جاتا۔'' وہ عصمہ سے مخاطب ہو کر بولا جبکہ اس کی نظریں ماں جی پر تھیں جو پُر سکون انداز میں کھڑی تھیں۔ وہ معاملے کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں اور کافی حد تک سمجھ بھی گئی تھیں۔

''مکر، فریب اور جھوٹے سہاروں کے بغیر زندگی گزارنا سیکھیے سر۔'' وہ اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ اس کی آواز بھرا گئی۔

"لیکن!" وہ روہانسا ہو رہا تھا۔ "میں نے آپ کے ساتھ کوئی مکر، فریب اور دھوکا نہیں کیا۔ آپ یہ کیوں کہہ رہی ہیں؟"

اتنی دیر میں شاید شیخ کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا تھا۔ وہ بھی ان کے پاس پہنچ گیا تھا۔ ماں جی نے شیخ کو دیکھ کر سلام کیا تو اس کی تیوریاں اور چڑھ گئیں۔

"بیٹے نے کیا کم نقصان پہنچایا تھا؟" وہ تلخ لہجے میں ماں جی سے مخاطب تھا۔ اس نے سلام کا جواب دینا بھی گوارا نہ کیا تھا۔ "اب اپنی اس خوبصورت آفت کے ساتھ میرے بیٹے کو پھانس رہی ہو۔"

"پاپا آپ بات کو سمجھ نہیں رہے۔" احمد باؤ درمیان میں بول پڑا۔ جبکہ عصمہ اور ماں جی شرم سے پانی پانی ہو رہی تھیں۔ سرِ بازار ان کی توہین یقیناً ایک المیہ تھا۔

"تم خاموش رہو؟" اس نے احمد باؤ کو جھڑک دیا۔ "جانتے ہو اس عورت کو۔" اس نے ماں جی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے احمد باؤ سے کہا۔ "اس کا کام ہی یہ ہے۔ یہ خوبصورت لڑکیوں کو امیر لوگوں کے بزنس اور گھروں میں کام دلوا کر اپنی عیاشی پوری کرتی ہے۔ اس کی ذات جانتے ہو؟ یہ ایک کم ذات اور نیچ عورت ہے۔" وہ بول رہا تھا اور لوگ ہجوم کی شکل میں اکٹھے ہو رہے تھے۔

"کنجر بازار میں بیٹھی ہوئی ایک طوائف بھی شرم و حیاء کر جائے گی۔ مگر یہ عورت......"

تڑاخ، تڑاخ، زوردار تھپڑوں نے شیخ کی بات اس کے منہ میں ہی رہنے دی تھی۔ مجمع پر سناٹا چھا گیا تھا۔ خود شیخ کو بھی پتہ نہ تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو گیا۔

ماں جی نے شیخ کو بات بھی پوری نہ کرنے دی تھی اور زناٹے دار تھپڑوں سے اس کی طبیعت صاف کر دی تھی۔ وہ گال پر ہاتھ رکھے ماں جی کو گھور رہا تھا۔

"آئندہ تب تک میرے سامنے نہ آنا۔ جب تک ان تھپڑوں کی گونج اپنے کانوں میں اور ان کی تپش اپنے گالوں پر محسوس کرتے رہو؟" ماں جی نے انگلی اٹھا کر کہا۔ اس پر بھی وہ چپ نہ ہوئی تھیں۔ "پہلے اپنے باپ کی شناخت کرو عمر حیات، پھر کسی شریف عورت کے بارے میں اپنی گندی زبان استعمال کرنا۔" ماں جی تو بہت کچھ کہنے والی تھیں مگر عصمہ انہیں کھینچ کر تماشہ دیکھنے والوں کے جمگھٹ سے باہر لے گئی۔

شیخ عمر حیات کو لوگ بہت اچھی طرح جانتے اور پہچانتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اپنی اس توہین کو کبھی نہ بھلا سکے گا۔ ملیحہ اور عالیہ بیگم بھی گاڑی سے باہر آ گئی تھیں۔

احمد باؤ شیخ کا بازو پکڑ کر گاڑی تک لایا اور گم صم شیخ کو گاڑی میں بٹھا کر گاڑی گھر کی طرف بھگا دی۔ آج قدرت نے شیخ کے ساتھ جو کیا تھا وہ یقیناً اس کے لیے سبق تھا۔ کیونکہ اس نے ماں جی کو غریب اور حقیر سمجھ کر گند بولنے کی انتہا کر دی تھی۔ وہ انہیں مجبور لاچار اور بے بس سمجھ رہا تھا۔ مگر ماں جی کے تھپڑوں نے اسے بتا دیا تھا کہ غریب سے بڑا شریف اور بدمعاش کوئی نہیں ہوتا۔

غریب مجبور ضرور ہوتا ہے مگر بے بس نہیں۔ لاچار ضرور ہوتا ہے مگر کمزور نہیں۔ خوبصورت ہو تو بھی بے غیرتی پر کبھی نہیں آتا اور اپنی انا اور عزت کی خاطر جان کی بازی ہمیشہ غریب اور خوددار نے ہی لگائی ہے۔ اب سرِ بازار تھپڑوں نے شیخ عمر حیات کو بتا دیا تھا کہ نذیراں غریب ضرور تھی مگر بے غیرت نہ تھی۔ اپنی شریف ذات کے متعلق وہ غلط بات نہ سن سکی اور شیخ کے رعب اور امارت کا بھی خیال نہ کیا تھا۔

شیخ خاموشی سے گاڑی سے اترا تھا۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ اپنی اس بے عزتی کا بدلہ ابھی لینا چاہتا تھا۔

وہ ماضی کے دھندلکوں میں کھو کر اس عورت کا وجود کھوجنے لگا۔ ایک غریب اور لاچار عورت کو اتنی جرأت اور حوصلہ کس نے دیا تھا کہ اس نے شیخ عمر حیات کے چہرے پر تھپڑ ہی مار دیے تھے۔

☆======☆======☆

"امیر علی۔ نام کا ہی نہیں بلکہ سچ مچ کا امیر علی تھا۔ ایک بہت بڑی ٹیکسٹائل مل کا مالک امیر علی اپنے اکلوتے بیٹے شیخ عمر حیات کو لے کر سید رشید حسین بخاری کی خدمت میں حاضر ہوا۔ باپ کو اتنی دولت اور امارت کے باوجود شاہ جی کے سامنے دو زانو بیٹھے دیکھ کر عمر حیات نے بھی باپ کی تقلید کی۔ کچی عمر کے عمر حیات کو علم نہ تھا کہ اس کا باپ اسے کیوں یہاں لے کر آیا ہے۔ وہ تو بس اتنا جانتا تھا کہ امیر علی ان بزرگوں کا مرید ہے اور اللہ کی رحمت سے امیر علی نے جتنا بھی کمایا ہے۔ مرشد کے فیض سے اور سخاوت کرنے سے دن بدن دوگنا ہی ہوتا جا رہا ہے۔ دولت اور پرتعیش زندگی نے بچپن میں ہی عمر حیات کو ضدی اور خودسر بنا دیا تھا۔ کوئی بھی چیز حاصل کرنے کے لیے وہ امیر علی کا ناک میں دم کر دیتا تھا۔ وہ بھی اکلوتے بیٹے کی ہر خواہش پوری کرنے کے لیے اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ پر پھول چڑھا دیتے تھے۔ اب شیخ عمر حیات نے بی اے کر لیا تو امیر علی اسے گاڑی میں بٹھا کر شاہ جی کے ڈیرے پر لے آیا تھا۔

شاہ جی اپنی مخصوص مسکراہٹ سے ان دونوں کو خوش آمدید کہہ کر زمین پر بچھی ہوئی کھجور کی چٹائی پر ہی بیٹھ گئے اور عمر حیات حیرانگی سے اپنے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ جو لکھ پتی ہونے کے باوجود اپنے نئے لباس کی پرواہ کیے بغیر دوزانو بیٹھ گیا تھا۔ اس طرح اسے بھی بیٹھنا پڑا۔ گو کہ دل میں خیال تھا کہ نئی پینٹ شرٹ مٹی سے گندی ہو جائے گی، لیکن باپ کا تھوڑا بہت رعب بھی تھا۔

''امیر علی!''......شاہ جی گویا ہوئے۔''میرے کام کا کیا ہوا۔''

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر میاں جی۔''امیر علی کے لہجے کی عاجزی نے عمر حیات کی طبیعت کو اور بھی مکدر کر دیا تھا۔ وہ حیرانگی سے امیر علی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جس کے ماتحت تقریباً ستر اسّی ملازم کام کرتے تھے۔ اس کے بعد دوسری شفٹ میں بھی تقریباً اتنے ہی آدمی کام کرتے تھے۔ مگر یہاں آ کر اس کو کیا ہو گیا تھا۔ وہ تو شاہ جی کے سامنے بھیگی بلی بنا ہوا تھا۔

''سرکار کے حکم کے عین مطابق تمام سامان اور کچھ نقدی بھی نذیراں کو پہنچا دی ہے۔ آپ کوئی اور حکم کریں۔''امیر علی نے کہا۔ تو شاہ جی کے چہرے پر طمانیت بخش مسکراہٹ پھیل گئی۔

''نذیراں نے اپنی بچی کی شادی کے بعد ایک اور درخواست ہم سے کی ہے۔'' شاہ جی بولے۔''وہ یہ کہ اس کا بیٹا پڑھنا نہیں چاہتا۔ وہ اسے کسی کام پر لگانا چاہتی ہے تا کہ اس کی آمدنی سے اس کے گھر کا چولہا جلتا رہے۔''وہ کچھ دیر کے لیے رکے۔''تم تو جانتے ہو کہ امام دین کی وفات کے بعد ان دونوں یتیموں کا کوئی پُرسانِ حال نہ تھا۔ تم نے ان کے سر پر دستِ شفقت رکھا تو ان کی زندگی کی گاڑی چل پڑی ہے۔'' شاہ جی خاموش ہوئے تو امیر علی تڑپ کر بولے۔

''میں کہاں؟؟ اتنی میری جرأت اور اوقات کہاں کہ ان کے سر پر دستِ شفقت رکھ سکوں۔''امیر علی کی نگاہیں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔''یہ تو اللہ کی کرم نوازی ہے کہ اس نے آپ کی ذات کو وسیلہ بنا کر مجھے نیکی کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ یہ سب آپ کے قدموں کے ہی طفیل ہوا ہے۔ نذیراں بے شک غریب ہے۔ مگر آپ کی مریدنی ہونے کے ناطے میری پیر بہن بھی ہے۔ میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ وہ کسی بھی چیز کی ضرورت محسوس کرے تو بھلا جھجک مجھے کہہ دے۔ ایک بھائی سمجھ کر۔''امیر علی خاموش ہو گیا۔

''تو پھر اس کے بیٹے کے روزگار کا کوئی حل ڈھونڈو امیر علی۔'' شاہ جی کی اس بات کو بھی عمر حیات نے ناپسندیدگی کے ساتھ سنا اور سوچنے لگا کہ سارے زمانے کے غرباء کا

صرف امیر علی نے ہی ٹھیکہ لے لیا ہے۔ اس سوچ کے ذہن میں آتے ہی اس نے متعجب سی نظروں سے شاہ جی کی طرف دیکھا۔ جو اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جیسے اس کی سوچ انہوں نے پڑھ لی ہو۔

''ان شاء اللہ یہ کام بھی آپ کے حکم کے عین مطابق ہو گا۔'' امیر علی نے کہا۔ اسی وقت باہر سے ایک اونچا لمبا نوجوان حویلی کے صحن میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں کپڑے کا ایک تھیلا تھا۔ جس میں سبزی وغیرہ بھری ہوئی تھی۔ اس نے امیر علی کو سلام کیا تو امیر علی نے بھی سر کے اشارے سے اس کے سلام کا جواب دیا۔ آنے والے نے تھیلا شاہ جی کے پاس رکھ دیا اور خود ان کے پیچھے کھڑے ہو کر ان کے کندھے دبانے لگا۔

''کیسے ہو اسمٰعیل؟''امیر علی نے پوچھا۔

''اللہ کا کرم ہے۔ حاجی صاحب اور مرشد کی مہربانی ہے۔ صدقہ پنجتن پاک کا بے حد مسرور ہوں۔''اسمٰعیل کے جواب نے عمر حیات کو مزید ورطۂ حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔

امیر علی اس کا جواب سن کر مسکراتے ہوئے بولے۔''اب تو دل نہیں کرتا کوئی شرارت کرنے کو؟''

اسمٰعیل کی نگاہیں جھک گئیں۔''جس در کی گدائی کرنے کے لیے شرارتیں کرتا تھا۔ اب اس در پر زندگی گزارنے کا موقع مل گیا ہے۔ اب تو کبھی ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔''اسمٰعیل کی بات سن کر شاہ جی مسکرا دیئے اور بولے۔

''اسمٰعیل، یہ امیر علی ہی ایسا فرد ہے جو تیری حقیقت کو جانتا ہے۔'' اسمٰعیل بھی مسکرانے لگا۔''اور نذیراں واحد عورت ہے۔ جس کو پتہ ہے کہ تم کون ہو؟'' شاہ جی کے بتانے پر اسمٰعیل کی نگاہیں جھک گئی تھیں۔

''شاہ جی!'' امیر علی پھر بولا۔ اس کی طبیعت میں بے چینی پائی جا رہی تھی۔ وہ ڈر رہا تھا کہ بات کرے یا نہ کرے۔''شاہ جی! میں اپنے اس اکلوتے بیٹے کو آپ کی غلامی میں دینا چاہتا ہوں۔''امیر علی نے ڈرتے ڈرتے بات کہہ دی۔ تو شاہ جی کی نظریں امیر علی کے پہلو میں بیٹھے ہوئے نوجوان عمر حیات کی طرف اٹھ گئیں اور بولے۔

''کیا چاہتے ہو امیر علی؟''

''میری اتنی اوقات نہیں کہ اپنی طلب بتاؤں۔'' وہی عاجزانہ لہجہ جو عمر حیات کو چڑانے کے لیے کافی تھا۔''بس میری درخواست ہے کہ آپ اسے بھی بیعت کر لیں۔'' دل کی بات امیر علی کے ہونٹوں سے نکلی تو عمر حیات نے چونک کر باپ کی طرف دیکھا لیکن امیر

علی کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ عمر حیات کو غصہ اور بے چینی نے منہ پھیرنے پر مجبور کر دیا۔

''بیعت کا مطلب ہے بک جانا اپنے آپ کو فروخت کر دینا۔'' شاہ جی بولے۔ ''جس مرشد کامل کے دستِ حق پر بیعت کر لی جائے۔ وہ ہاتھ پھر کبھی بھی ان ہاتھوں سے نہیں نکلنے چاہئیں۔ کیونکہ ساداتِ سلسلہ ہو یا غیر سادات۔ مرشد کامل کے ہاتھوں میں دیا جانے والا ہاتھ سلسلہ در سلسلہ چلتا ہوا۔ عشق و معرفت کی کٹھن منازل طے کرتا ہوا محسن کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے خوبصورت اور معطر ہاتھوں میں جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ جس نے میرے محبوب کا دامنِ رحمت تھاما گویا اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔'' وہ خاموش ہو کر عمر حیات کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر گویا ہوئے۔ ''اور پھر بیعت ہونے کے بعد مرشد کے ہاتھوں سے ہاتھ چھڑانے والا یقیناً بدبخت اور ٹھکرایا ہوا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ہاتھ بظاہر تو مرشد کامل سے چھڑاتا ہے۔ مگر نبی اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن بھی چھوڑ بیٹھتا ہے اور جو ان کا دامن چھوڑتا ہے۔ اللہ بھی اس سے نگاہِ رحمت کو پھیر دیتا ہے اور اس ناہنجار کو دنیا کے ظالموں میں شمار کرتا ہے اور بے شک ظالم کی رسّی لمبی کر دیتا ہے۔ مگر ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے۔ جب وہ اس کی طنابیں کھینچتا ہے تو اس منکر کی دنیا اتھل پتھل کر دیتا ہے۔ اس طرح کہ وہ گلیوں کا کتا بن کر در در بھونکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کے محبوب کے در کی گدائی مانگنی بہت آسان طلب ہے۔ مگر اس کو تاحیات نبھانا انتہائی کٹھن ہے۔''

شاہ جی خاموش ہوئے تو امیر علی کی آنکھیں آنسوؤں سے تربتر ہو رہی تھیں۔ وہ سمجھ گیا کہ اس کے بیٹے کا کوئی ارادہ نہیں ہے کہ وہ شاہ جی کی بیعت حاصل کرے۔ وہ جانتا تھا کہ شاہ جی آلِ رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر خاص نظر کرم کی ہوئی ہے۔ علم و معرفت کے خزانے کھولے ہوئے ہیں۔ وہ دلوں کے راز اللہ کی قدرت سے جان لیتے ہیں۔ اسرارِ خداوندی ان پر رضائے الٰہی سے آشکار ہوتے رہتے ہیں اور شاہ جی نے عمر حیات کے دل کا بھی حال یقیناً ایک نظر میں ہی جان لیا تھا۔ انہوں نے نوجوان عمر حیات کا دل نہ توڑتے ہوئے۔ بڑی لمبی اور جامع تشریح کی تھی۔

امیر علی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جنہیں وہ بیٹے سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''آپ نذیراں بہن سے کہہ دیں کہ وہ صبح اپنے بیٹے کو مل بھیج دے۔'' امیر علی بھرائی ہوئی آواز میں بولا تو بیٹے نے اچنبھے کی کیفیت میں باپ کی طرف دیکھا۔ اس نے شاہ جی سے اجازت طلب کی تو انہوں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ امیر علی نے احترام سے اسے بوسہ دیا اور بیٹے کی طرف دیکھا۔ مگر اس بار عمر حیات نے باپ کی تقلید نہ کی تھی۔

شاہ جی نے مسکرا کر انہیں جانے کی اجازت دے دی تھی۔ امیر علی الٹے قدموں شاہ جی کی حویلی سے نکلا اور گاڑی میں آ کر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ جبکہ عمر حیات نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ گاڑی ابھی تھوڑی ہی دور گئی تھی کہ امیر علی نے ایک کچے مکان کے سامنے گاڑی رکوائی۔ وہ اتر کر کچے مکان کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔

اندر سے دروازہ کھولنے والی ایک خوبصورت عورت تھی۔ جس کا حسن اس کی افسردگی کی چغلی کھا رہا تھا۔ اس نے دروازے پر امیر علی کو دیکھا تو خوشی سے پھولی نہ سمائی۔

''امیر بھائی آپ؟'' وہ شاید تصور بھی نہ کر سکتی تھی کہ ایک مل آنر اس غریب کے دروازے پر بھی کبھی دستک دے گا۔ ''آپ باہر کیوں کھڑے ہیں؟ اندر تشریف لائیں۔''

وہ ایک طرف ہٹ گئی تو امیر علی بولا۔

''نذیراں بہن! مجھے شاہ جی نے غفران کے بارے میں کہا ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے عمر حیات کو اشارے سے اپنے پاس بلوایا۔ اس کے پاس آنے پر امیر علی پھر بولا۔ ''یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ اب تمام انتظامات یہی سنبھالے گا۔ یہ صبح آ کر غفران کو اپنے ساتھ مل میں لے جائے گا۔'' نذیراں نے امیر علی کی بات سن کر عمر حیات کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔

''خدا آپ کو اس نیکی کا اجر دے گا۔ میں غریب تو دعا ہی کر سکتی ہوں۔ آپ نے ہمارے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ ان احسانوں کو میں کیسے اتار سکوں گی؟'' اس کی آواز بھرا گئی۔ تو امیر علی بولا۔

''بھائی بھی کہتی ہو اور بیگانگی بھی برت رہی ہو۔ بہنوں کے تو بہت حقوق ہوتے ہیں۔''

ابھی باتیں ہی ہو رہی تھیں کہ اندر سے ایک نوجوان لڑکی نے آواز لگائی۔ ''اماں کس سے باتیں کر رہی ہو؟'' وہ بھی ماں جی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ تو امیر علی نے اس کو پیار دیا۔

''ماشاءاللہ اب پرائے گھر کی ہو جاؤ گی۔ ماں سے پیار کو کم کرنا شروع کر دے۔'' امیر علی نے کہا تو عمر حیات نے آنکھیں اٹھا کر لڑکی کی طرف دیکھا بس پھر آنکھیں جھپکنا بھول گیا تھا۔ اسی ایک نظر نے اسے گھائل کر دیا تھا۔ وہ صبح غفران کو لینے نہ ہی آتا۔ مگر اب آنا پڑے گا۔

واپسی پر امیر علی نے غفران کے متعلق عمر حیات کو نصیحتیں کیں کہ اسے کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہئے۔ اس کے ساتھ اپنے بھائیوں جیسا سلوک رکھنا۔ کھانا پینا مل کی ذمہ داری ہے۔ تم اسے لے کر آنا بھی اور واپسی پر یہاں چھوڑ کر بھی جانا۔ یہ تمہاری ڈیوٹیاں ہیں۔

عمر حیات کی فطرت میں حکم مان کر نوکری کرنا شامل نہ تھا۔ مگر نذیراں کی لڑکی اس کے دل میں گھس کر بیٹھ گئی تھی۔ وہ اس نوکری کو دن میں کئی کئی بار کرنا چاہتا تھا۔ جبھی تو اس نے باپ کے حکم پر سرِ تسلیم خم کر لیا تھا۔ پھر بھی وہ پوچھ بیٹھا۔

''آپ ان لوگوں کا اتنا خیال کیوں رکھتے ہیں؟''

''اس لیے کہ یہ میرے پیر بھائی اور پیر بہن ہے۔ یعنی یہ بھی انہی مرشد کے مرید ہیں۔ جن کا میں مرید ہوں۔'' امیر علی نے بیٹے کو سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''بیعت ہونا کوئی ضروری ہوتا ہے۔'' عمر حیات کی سوئی اڑ گئی تھی۔

''اپنی بخشش اور آخرت سنوارنے کے لیے دین اسلام کو اچھی طرح جاننے کے لیے کسی نہ کسی مرشد کا دامن تھامنا پڑتا ہے۔ ورنہ انسان گناہوں کی زندگی گزار کر گناہ آلودہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اسے دین کی مکمل سمجھ نہیں ہوتی۔'' اس نے عمر حیات کی طرف دیکھا جو سڑک پر دیکھ رہا تھا۔

''زندگی میں مرشد کامل کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ یہ جو نیک لوگ ہوتے ہیں انہوں نے اللہ جل شانہ کا قرب حاصل کیا ہوتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ بھی اپنے ان بندوں پر مہربان ہوتا ہے۔''

''یہ جو نذیراں کی بیٹی ہے۔ اس کی شادی کب ہو رہی ہے؟'' اس کے دل کی بات لبوں پر آ رہی تھی۔

''ابھی ایک ماہ بعد اس کا نکاح ہو جائے گا۔'' امیر علی نے جواب دیا تو عمر حیات نے سکون کی سانس خارج کی۔ امیر علی نے حیرت سے بیٹے کی طرف دیکھا۔

اگلے دن صبح ہی صبح عمر حیات خلافِ توقع بیدار ہو گیا تھا۔ اس نے جلدی سے ناشتہ کیا اور گاڑی نکال کر نذیراں کے گھر کی طرف چل پڑا۔ دروازے پر دستک کے جواب میں اسی مہ جبیں نے دروازہ کھولا اور یک دم دروازے کا ایک پٹ بند کر دیا۔ اس نے عمر حیات کو پہچان لیا تھا۔ وہ اس کے محسن کا بیٹا تھا۔

''جی کہیے؟'' دروازے کے بھڑے ہوئے پٹ کے پیچھے سے آواز آئی۔ ایک ٹھنڈک سی اس آواز میں تھی جو عمر حیات کے روئیں روئیں میں بھر گئی تھی۔

''اندر آنے کے لیے نہیں کہو گی؟'' عمر حیات بولا۔

''وہ دراصل ماں جی گھر پر نہیں ہیں۔''

''میں ماں جی سے ملنے نہیں آیا ہوں۔''

''پھر کس سے ملنے آئے ہیں؟''

''تم سے!'' عمر حیات نے جھٹ سے کہہ دیا۔ اس نے غور کیا تو دروازہ لرز گیا تھا۔

''جی! مجھ سے؟'' سوال کیا گیا۔

''اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟'' باہر سے جواب دیا گیا۔

''میں غفران کو بھیجتی ہوں۔ وہ اب تک تیار ہو چکا ہو گا۔'' اس آواز کے ساتھ ہی دروازہ بند ہو گیا۔ مگر کنڈی لگنے کی آواز سنائی نہ دی۔ عمر حیات نے اس حرکت کو اپنی بے عزتی تصور کیا تھا۔ اس نے غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے دروازہ کھول کر اندر جانے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ پیچھے سے ماں جی کی آواز نے اسے اپنے قدم روکنے پر مجبور کر دیا۔

''بیٹا! آپ؟'' اس نے مڑ کر دیکھا تو ماں جی نے چادر سے اپنا پورا وجود ڈھانپ رکھا تھا اور منہ پر بھی نقاب کی صورت میں چادر کو لپیٹ رکھا تھا۔ وہ ماں جی کو دیکھ کر شرمندہ سی ہنسی ہنس کر رہ گیا تھا۔

''آپ ٹھہرو، میں ابھی غفران کو بھیجتی ہوں۔'' ماں جی اندر داخل ہو گئیں تو کچھ ہی دیر بعد اندر سے چھ سال کا لڑکا باہر نکلا۔ اس نے باہر نکلتے ہی عمر حیات کو سلام کھڑکا دیا۔

''سلام علیکم جی۔ میرا نام غفران امام دین ہے۔'' اس نے تیل سے سر چپڑ رکھا تھا۔ درمیان میں مانگ نکالی ہوئی تھی اور آنکھوں میں سرمہ ڈوئیوں سے لگایا گیا تھا۔

''یہ ابا جی بھی پتہ نہیں کن کن آفتوں کو گلے لگائے جی رہے ہیں۔'' عمر حیات نے غفران کا حلیہ دیکھ کر بڑبڑاہٹ کی۔ جو یقیناً غفران کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

شاندار گاڑی میں بیٹھتے ہی غفران کے ہوش گم ہو گئے تھے اور پھر جب اس نے گاڑی کو بہت بڑے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو اس کی حیرت دوچند ہو گئی۔ وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ کیونکہ اندر وسیع رقبے پر بنی ہوئی بلند و بالا بلڈنگ دیکھ کر وہ تو گم صم ہو گیا تھا۔

عمر حیات اسے اپنے دفتر میں لے گیا تھا۔ ہر کوئی اس کا حلیہ دیکھ کر ہنس پڑتا تھا۔ مگر لگتا تھا کہ غفران کو کسی کی پرواہ نہیں ہے۔ وہ اپنی مستی میں مگن رہنے والا بچہ تھا۔ عمر حیات نے مل میں اور اپنے آفس میں بہت سی تبدیلیاں کر دی تھیں۔ وہ اپنے حساب سے تمام کاروبار کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بہت جلد ہی تمام امور بخوبی انجام دینے شروع کر دیے تھے۔ اس نے والد کی نصیحت کے مطابق غفران کو اپنے آفس میں ہی رکھ لیا تھا۔ تمام ورکرز کو بتا دیا گیا تھا کہ غفران پر امیر علی کی خصوصی نظر کرم ہے۔ لہٰذا کوئی بھی اس کے ساتھ بدتمیزی یا

پھر مذاق کی جرأت نہ کرتا تھا۔

عمر حیات باپ کی نسبت بہت کرخت طبیعت کا مالک تھا۔ وہ کام کے وقت صرف کام لینے کا قائل تھا۔ اسی وجہ سے تمام مزدور اور ورکرز اس سے دبتے تھے۔ عمر حیات اپنی روٹین کے مطابق غفران کو پک اینڈ ڈراپ کر رہا تھا۔ اس نے کافی کوشش کے بعد ماں جی کے گھر میں داخل ہونے کے لیے اپنے آپ کو اہل بنالیا تھا۔ وہ اب ان کے صحن میں بچھی ہوئی ایک چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ مگر آنکھوں کی ٹھنڈک ابھی تک نظر نہ آرہی تھی۔ غفران کو سامنے والے کمرے سے نکلتے دیکھ کر اس نے آہ بھری جس کا مطلب تھا کہ اب جانا ہوگا۔ اسے اپنے ارمانوں پر اوس پڑتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ آج تو بہت اچھا موقع تھا۔ ماں جی بھی شاہ جی کے ہاں گئی ہوئی تھیں۔

اس نے غفران کے پیچھے ہی دیکھ لیا تھا کہ وہ قتالہ بھی چھپی کھڑی ہے۔ اس نے غفران کو چل کر گاڑی میں بیٹھنے کا کہا۔ آج وہ اس سے دو دو ہاتھ کر ہی لینا چاہتا تھا۔

غفران کے باہر جانے کے بعد اس نے آہستہ سے اندر سے دروازے کی کنڈی چڑھائی "حسینہ" نے سمجھا کہ عمر حیات بھی غفران کے ساتھ باہر نکل گیا ہے۔ وہ بیرونی دروازہ بند کرنے کے لیے آرہی تھی کہ دیوار کی اوٹ میں چھپے ہوئے عمر حیات نے اسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اس اچانک افتاد سے حسینہ کی جان نکل گئی تھی۔

اس نے گھبرا کر دیکھا تو عمر حیات اپنے لچر پن اور بے غیرتی سے مسکرا رہا تھا۔ اس نے مضبوطی سے حسینہ کو جکڑ رکھا تھا اور وہ چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر عمر حیات نوجوان تھا۔ چڑھتی جوانی اور پھر حسینہ کے حسن نے اسے بہت مضبوط اور بہادر بنا دیا تھا۔ اس نے بوسے لینے شروع کر دیئے تو حسینہ چیخنے لگی۔ رونے لگی عمر حیات گھبرا کر اسے چھوڑ کر باہر کی طرف بھاگا۔ کنڈی کھولتے ہی اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔

اس کے سامنے قہر کی صورت میں ماں جی کھڑی تھیں۔ جو خون آشام نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے ادھ کھلے دروازے سے اندر جھانکا تو حسینہ روتی ہوئی نظر آئی۔ ماں جی تمام معاملہ سمجھ گئی تھیں۔

عمر حیات ان سے آنکھ بچا کر نکل گیا۔ ماں جی نے اندر جا کر دروازے کی کنڈی لگائی اور حسینہ کو اپنے بازوؤں میں بھر کر خوب پیار کیا۔ اس کے آنسو چھلک چھلک کر اس کے دامن کو تر کر رہے تھے۔ وہ جب رو رو کر اپنا جی ہلکا کر چکی تو ماں جی نے پوچھا۔

"مجھے علم ہے کہ میری عزت اللہ کے حکم سے محفوظ رہی ہے۔ کیا اس میں تیری بھی

مرضی شامل تھی؟" حسینہ نے عجیب سی آنکھوں سے ماں کی طرف دیکھا۔

"آپ کو تو اپنے خون پر اعتماد ہونا چاہیے۔" وہ یہ کہہ کر پھر رونے لگی تھی۔ جبکہ ماں جی نے اسے اپنے سینے سے لپٹا لیا اور بولیں۔

"امیر علی بھائی کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔ تمہارے ابا کی وفات کے بعد انہوں نے پوری ذمہ داری اور خلوص سے اس گھر کی مدد کی ہے۔ میں کوئی بھی غلط بات یا الزام دے کر ان کے احسانات کو خاک میں نہیں ملانا چاہتی۔" وہ کچھ توقف کے بعد پھر بولیں۔ "اب تمہاری شادی پر تمام خرچ بھی وہی کریں گے۔ خدا سے دعا گو ہوں کہ وہ خیر خیریت سے یہ دن بھی گزار دے۔ بس میری عزت کی رکھوالی کرتا رہے تاکہ میں تیرے فرض سے باعزت سرخرو ہو سکوں۔" ماں جی کی آنکھیں بھی چھلک گئی تھیں۔ انہوں نے بیٹی کو بازوؤں سے پکڑ کر اپنے سامنے کر لیا اور اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالوں میں بھر کر بولیں۔

"اس بات کو اپنے آنسوؤں کے ساتھ ساتھ خاموشی سے پی جا۔ یہی تمہارے اور اس گھر کی عزت کے لیے بہتر ہے۔ اگر یہ بات باہر نکلی تو ہم لوگ محلّہ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے اور بیٹی پھر تُو نے بھی پرائے گھر جانا ہے۔ ایسی باتیں دوسرے گھر والوں کو معلوم ہو جائیں تو وہ بات بات پر طعنے دینے لگتے ہیں۔ جس سے زندگی کی گاڑی بہت مشکل چلتی ہے۔ میری بیٹی! اپنے آنسو پونچھ کر ہونٹوں پر چپ کی مہر لگا لے۔" انہوں نے بیٹی کو سمجھا کر اندر کمرے میں بھیج دیا تھا۔

حسینہ کی شادی تک عمر حیات ماں جی کا سامنا نہ کر سکا تھا۔ وہ گاڑی میں ہی بیٹھا رہتا ہارن بجا کر غفران کو بلاتا اور پھر خاموشی سے لے جاتا تھا۔

حسینہ کی شادی بڑی سادگی اور خاموشی سے ہوئی تھی۔ کیونکہ لڑکے والوں کو منع کر دیا گیا تھا کہ لڑکی یتیم ہے اس لیے کوئی ہلا گلا نہیں ہوگا۔

ماں جی نے رخصتی کے وقت حسینہ کی ساس اور سُسر کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"میری بچی کو اپنی بیٹی سمجھنا۔ یہ نادان ہے۔ اگر کوئی غلطی بھی کر لے تو بیٹی سمجھ کر اس کی پردہ پوشی کرنا۔ اس کی سزا مجھے دینا۔ میری بیٹی کو سخت لہجہ سے نہ بلانا۔ یہ میری عرضیاں ہیں۔" ماں جی نے سبھی کو رلا دیا تھا۔

بہن کی رخصتی سے غفران بھی دل مسوس کر رہ گیا تھا۔ اب وہ اس گھر میں اکیلا رہ گیا تھا۔ پہلے تو وہ باجی سے ہنسی مذاق کر لیتا تھا۔ اب وہ تھا اور ماں تھی۔ ابا پہلے ہی انہیں

داغِ مفارقت دے کر اجل سے یاری نبھا چکا تھا۔

''انگور کھٹے ہیں'' کے مصداق عمر حیات نے حسینہ کو بھلا دیا۔ مگر دل میں رنجش ضرور تھی کہ وہ پہلی ہی چوری پہلا پھاہ والی بات ہوئی تھی۔ جتنی دولت اس کے پاس تھی۔ وہ کئی حسینائیں خرید سکتا تھا۔ وہ غفران کو مل سے نہ نکال سکتا تھا۔ کیونکہ ابا کا حکم تھا اور وہ جان گیا تھا کہ ابا جی نذیراں بہن کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔ کہیں غفران کو نکالنے کی پاداش میں خود عمر حیات کو ہی نہ نکلنا پڑے اور ابا جی سے کچھ بعید نہ تھا۔ وہ کچھ بھی کر سکتے تھے۔ امیر علی نے ماں جی کو بہت سے روپے دے کر مکان کو سیمنٹ کا پلستر کروا کر پکا کرنے کے لیے کہا۔ ماں جی نہ لینے پر مصر تھیں جبکہ امیر علی نے بہن بھائی کے حقوق پر پُر اثر تقریر کر کے ان کو روپے لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ غفران کی تنخواہ اس کے علاوہ تھی۔

امیر علی بہت اچھی طرح اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ غفران کی چال ڈھال اور رہن سہن میں بہت فرق آ گیا تھا۔ کیونکہ کامیاب اور اچھے لوگوں کا ملنا ہی اچھے اور کامیاب مستقبل کی ضمانت ہوتا ہے۔

غفران کھلے ہڈ اور کھلے ذہن کا مالک تھا۔ وہ بھی اپنے باس عمر حیات سے بہت کچھ سیکھ رہا تھا۔ ایک دن وہ چائے بنا کر آفس کے ملحقہ کچن سے آفس میں داخل ہوا تو بہت سے غیر ملکی مہمانوں کو دیکھا جو چائے تو نہ پی سکے۔ مگر ان کے سامنے شیشے کے گلاسوں میں رکھا گیا مشروب بہت بدبودار تھا۔ مگر وہ اور اس کا باس عمر حیات بڑی بے فکری سے پی رہے تھے۔

بات آئی گئی ہو گئی تھی کیونکہ غفران کو کسی بھی معاملہ میں دخل نہ دینے کی تاکید اس کی اماں جی اور امیر علی نے کی تھی اور وہ اس پر سختی سے کاربند تھا۔

شیخ عمر حیات نے مل کے ساتھ ساتھ ایک سائیڈ بزنس بھی شروع کر لیا تھا۔ اس کی چالاکی اور چستی کام دکھا رہی تھی۔ وہ کاروبار پر حاوی ہو گیا تھا، لیکن سفید پاؤڈر بھی اس کے اس کاروبار میں شریک ہو گیا تھا۔ وہ پہلے پہل تو غفران سے چھپ چھپ کر سودے کرتا رہا۔ مگر ایک دن اس نے دیکھا کہ غفران نے تمام معاملات سمجھ لیے ہیں۔ بلکہ جان بھی گیا ہے کہ غیر قانونی دھندہ ہے۔ وہ کبھی بھی عمر حیات کو بلیک میل کر سکتا تھا۔

اس کے ساجھے داروں نے کئی بار عمر حیات کو کہا تھا کہ وہ غفران کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ مگر غفران اس کی ناک کا بال بن کر رہ گیا تھا۔ وہ اسے ختم نہ کروا سکتا تھا۔ بلکہ اپنے ساتھ ملا کر اسے بھی ''مال'' کی سپلائی پر لگا دیا۔ غفران کو کافی روپے ملنے لگے تھے۔ گھر کی حالت دن بدن بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ ماں جی تو امیر علی کو دعائیں دیتی نہ تھکتی تھیں۔

شیخ نے محسوس کیا کہ اب غفران بھی اس کے ساتھ ساتھ دو نمبر کام پر مکمل حاوی ہو گیا ہے اور قد کاٹھ بھی نکال لیا ہے۔ وہ بے فکری سے کام کرنے لگا تھا۔

ایک دن کسی گھر کے بھیدی نے لنکا ڈھا دی۔ مخبری کر دی تھی۔ پولیس کا کامیاب چھاپہ پڑا تھا۔ بہت سا مال ثبوت کے ساتھ پکڑا گیا تھا۔

امیر علی کی نیک نامی کو بٹا لگ گیا تھا۔ وہ اس برائی اور بدنامی کی زندگی سے تنگ ہو گئے تھے۔ ان کے اکلوتے بیٹے نے ان کی عزت کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا تھا۔ اس سنگین اور بے رحم وار کو نہ سہتے ہوئے اس نے اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی تھی۔ عمر حیات باپ کے جنازے کو کندھا بھی نہ دے سکا تھا۔

بڑے اونچے پیمانے پر ڈیل ہوئی تھی۔ اس وقت لاکھوں میں پولیس کا منہ بند کیا گیا تھا، لیکن ان لاکھوں نے شیخ عمر حیات اور غفران کو لائسنس جاری کر دیا تھا کہ وہ گھر گھر موت بانٹ سکتے ہیں۔ سفید پاؤڈر کا کام بڑھ جانے پر عمر حیات نے ٹیکسٹائل مل فروخت کر دی تھی۔ اس نے گارمنٹس کا یونٹ لگا کر چھوٹے پیمانے پر کام شروع کیا تو وہ باآسانی اپنی ہر خواہش کی تکمیل کرتا گیا اور کئی یونٹ مل کر فرم بن گئی۔

غفران بھی ساتھ ساتھ پروان چڑھتا گیا تھا۔ اس کی ماں جو کہ ساری عمر شیخ عمر حیات کے والد کے ٹکڑوں پر پلی تھی۔ آج اس نے بازار میں عمر حیات کے منہ پر تھپڑ مار کر بتا دیا تھا کہ اس نے پندرہ بیس سال بعد حسینہ کی بے عزتی کا بدلہ لے لیا ہے۔ عمر حیات خیالوں کی دنیا سے نکل آیا تھا۔

اس نے اپنے آپ کو مناسب موقع کی تلاش کے لیے روک لیا تھا۔ یہ وقت تحمل سے کام لینے کا تھا۔ کیونکہ اس کے مرشد کی سالگرہ کا دن نزدیک آ رہا تھا اور وہ بابا جی کی سالگرہ پر کوئی بدمزگی نہ چاہتا تھا۔ اس نے بابا جی کی زیارت کے لیے آستانہ کا دروازہ کھٹکھٹایا تو اندر سے کوئی جواب نہ پا کر وہ حیران ہوا۔ اس نے دباؤ ڈال کر دروازہ کھولا تو اندر کوئی بھی نہ تھا۔

وہ حیرانگی کے عالم میں کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پیچھے سے اُسے اپنی بیگم کی آواز سنائی دی۔

''بابا جی ملیحہ کو لے کر ڈاکٹر شارق کے ہاں گئے ہوئے ہیں۔'' عالیہ بیگم کی آواز پر اس نے اطمینان کی سانس لی اور پیچھے مڑ کر اپنی بیگم کو غور سے دیکھنے لگا۔

''کیا نظر لگانی ہے؟'' عالیہ بیگم شوہر کی نظریں بھانپتے ہوئے شرماتی سی بن گئی۔

''کیا اس خوبصورت مجسمے کو دیکھنا بھی منع ہے۔'' شیخ نے عالیہ بیگم کو بازوؤں میں بھر

کر پیار کرنا شروع کر دیا تو وہ مچل کر جدا ہو گئی۔ شیخ نے استفہامیہ نظروں سے دیکھا تو وہ بولی۔

''خود تو چلے جاؤ گے۔ مگر میرا کیا بنے گا؟''

''اچھا ٹھیک ہے۔ میں بھی شارق کے ہاں جا رہا ہوں۔'' وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولا اور عالیہ بیگم کی ''اونہہ'' نہ سن سکا۔ وہ بے چینی سے بابا جی کا انتظار کرنے لگی۔ اب اسے بابا جی کی مقناطیسی نگاہوں کا بھی سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ بس ''رضامندی ہی رضامندی'' تھی۔ شیخ نے گاڑی باہر نکالی اور سڑک پر دوڑا دی۔ وہ ڈاکٹر شارق کے گھر جا کر بابا جی کے ساتھ چائے پینا چاہتا تھا۔ اسے وہاں پہنچنے کے لیے بازار سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس بازار میں رش کافی ہوتا تھا۔ بس وہ غریبوں کا بازار زیادہ تھا۔ اسی لیے سبزی اور پھل فروش اپنی اپنی ریڑھیاں اور ٹھیلے بازار کے بیچوں بیچ لے آتے تھے۔ جس سے پیدل سواروں کو بھی کافی وقت ہوتی تھی۔ مگر میونسپل کارپوریشن کی گاڑی دیکھ کر بازار میں صفائی ہو جاتی تھی۔ سبھی اپنی اپنی متعلقہ جگہ پر پہنچ جاتے اور پھر زور وشور سے سودا سلف بیچنے لگتے۔ مگر اب تو رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا اور بازار خالی تھا۔ اس لیے وہ گاڑی دوڑاتا جا رہا تھا۔

وہ بازار سے باہر ہی نکلا تھا کہ ایک موٹر سائیکل سوار اس کے مقابلے میں گاڑی کو تیز دوڑانے لگا۔ شیخ نے اس کی طرف دیکھا اور پہچان نہ پایا۔ کیونکہ موٹر سائیکل سوار نے ہیلمٹ پہن رکھا تھا۔

چوک میں پہنچ کر گاڑی کو یک دم بریک لگانے پڑے کیونکہ چوک میں کسی نے راستہ بند کر رکھا تھا۔ کوئی چوک میں بہت بڑی چارپائی بچھا کر اس پر لیٹا ہوا تھا۔ شیخ نے پاس سے گزرنے والے ایک آدمی سے پوچھا تو وہ انجان بن کر چل دیا۔

شیخ گاڑی سے اتر کر خود اس کے پاس گیا۔ وہ کوئی تھرڈ کلاس غنڈہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے شیخ کو اپنی طرف آتا دیکھ کر دوسری طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا۔

''یہ کیا طریقہ ہے؟ اور کون ہو تم؟''

''دیکھو صاحب ہم، ہم ہیں، آپ کو راستہ دکھانے کے لیے ایک ہمسفر دیا تو تھا۔ وہ بے چارا ادھر مڑ گیا ہے۔'' اس نے ایک طرف اشارہ کیا جدھر وہ موٹر سائیکل والا کھڑا اس کے ایکسیلیٹر پر ہاتھ رکھ کر گاڑی کی چیخیں نکلوا رہا تھا۔ ''جاؤ صاحب وہ آدمی آپ کو آپ کی منزل تک پہنچا دے گا۔ میں تو یہاں سے اٹھنے والا نہیں ہوں۔'' اس نے اپنی چادر سے ایک گن نکالتے ہوئے کہا تو شیخ کو چلتے ہی بنی۔

وہ تذبذب کے عالم میں اس موٹر سائیکل والے کے پیچھے چل دیا۔ گاڑی اونچی نیچی

گلیوں سے گزر کر شیخ کا دل ڈراتی ہوئی مین روڈ پر پہنچ گئی تھی اور پھر اس کو موٹر سائیکل والا نظر نہ آیا تھا۔ اب شیخ نے ارد گرد نظر دوڑائی تو دکانوں پر لگے ہوئے بورڈز پر سے اندازہ ہوا کہ وہ ڈاکٹر شارق کے گھر کے بالکل ہی قریب کھڑا تھا۔ ''وہ موٹر سائیکل والا کیسے جانتا تھا کہ وہ ڈاکٹر شارق سے ملنے جا رہا ہے؟'' وہ جو بھی تھا۔ کافی ذہین تھا۔ شیخ نے سوچا اور گاڑی روک دی کیونکہ شارق کی کوٹھی آ چکی تھی۔ اب وہ بابا جی کے ساتھ چائے پی کر خود کو خوش قسمت تصور کر رہا تھا۔

☆======☆======☆

جانی نے شیخ عمر حیات کے گھر فون کر کے خود کو فرم کا ایک ملازم بتایا۔ عالیہ بیگم نے اسے عمر حیات کا ڈاکٹر کے ہاں جانے کا پروگرام بتایا۔ انہوں نے شیخ کو محض ڈرانے کی خاطر جو بھی منصوبہ بندی کی تھی۔ اس میں وہ پوری طرح کامیاب ہو گئے تھے۔

خالد کی وفات کے بعد سے اب عصمہ کچھ سنبھل چکی تھی۔ اس نے اپنے گھر کو تالا لگا دیا تھا اور وہ غفران کے گھر میں ہی ڈیرہ جما بیٹھی تھی۔ کیونکہ اس کے بہت اصرار کے باوجود بھی جانی نے اسے اپنے گھر نہ جانے دیا تھا اور پھر ماں جی کی محبت نے بھی اسے مجبور کر دیا تھا۔ اسے خالد کے متعلق صرف یہ بتایا گیا تھا کہ اس کی موت ہارٹ اٹیک سے ہوئی ہے۔ وہ بے چاری رضائے الٰہی سمجھ کر صبر وشکر کر کے بیٹھ گئی تھی۔

جس دن سے عمر حیات والا واقعہ ماں جی اور عمر حیات کے مابین پیش آیا تھا۔ عصمہ بہت ڈر گئی تھی۔ وہ احمد کے ساتھ چند دن ہی کام کر کے اتنا جان گئی تھی کہ ان کے تعلقات کافی اونچے لوگوں سے ہیں۔ اعلیٰ آفیسران کو اس نے احمد باؤ سے بڑے مہذب طریقے سے ملتے ہوئے دیکھا تھا۔ اگر احمد یا عمر حیات نے کوئی بکھیڑا کھڑا کر دیا تو بہت مسئلہ ہو جائے گا۔ وہ ہر لمحہ سہمی ہوئی رہتی تھی۔

اس وقت بھی وہ گھر میں اکیلی تھی۔ اسے ہر لمحہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں معاملہ خراب نہ ہو جائے۔ مگر دوسری طرف اسے غفران کا بھی حوصلہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس نے بھی کافی وقت عمر حیات کے ساتھ گزارا ہے۔ مگر آج کل فارغ ہی ہے۔

وہ گھر میں اکیلی ہوتی تو غفران نے کبھی بھی اسے نظر اٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ بلکہ وہ جلد از جلد گھر سے نکل جانے کی کوشش کرتا تھا اور عصمہ نے اس بات کو بہت محسوس کیا تھا کہ وہ اس کی بہت عزت کرتا ہے۔ عصمہ پچھلے کمرے میں ماں جی کے ساتھ سوتی تھی۔ غفران کبھی کبھار گھر آ بھی جاتا تو وہ صحن میں سو جاتا اور عصمہ کے بیدار ہونے سے پہلے ہی اٹھ کر

انجانی منزل کی طرف چل پڑتا اور کبھی کبھی شام کو گھر لوٹ آتا تھا۔

عصمہ نے یہ بات بھی محسوس کی تھی کہ اس گھر میں سادگی ہر چیز سے جھلک رہی تھی۔ مگر روپے پیسے کی فراوانی تھی۔ غفران اور جانی کیا کام کرتے تھے، کسی کو علم نہ تھا۔ خاص طور پر عصمہ کو۔ ماں جی جانتی تھیں کہ غفران نے شیخ عمر حیات کی ملازمت کے دوران میں کافی روپیہ اکٹھا کیا ہے۔ وہ کئی بار غفران کو سمجھا چکی تھیں کہ لڑائی جھگڑے اور دنگا فساد چھوڑ کر کوئی ڈھنگ کا کام کرلے۔ مگر نتیجہ ''کچھ'' بھی نہ نکلا تھا۔

عصمہ باقاعدگی سے اٹھ کر صبح کی نماز پڑھنے کے بعد قرآنِ حکیم کی تلاوت کرتی تھی اور اب تو ماں جی نے بھی اس سے ترجمہ سننا شروع کر دیا تھا۔ ماں جی صرف قرآن کریم کی تلاوت ہی کرتی تھیں، لیکن چونکہ عصمہ پڑھی لکھی تھی۔ انہوں نے عصمہ سے ترجمہ بھی سننا شروع کر دیا تھا۔ ان کی روح تازہ کرنے کے لیے یقیناً قرآنِ کریم کا ترجمہ ایک بہت ہی متبرک کلام تھا اور وہ بڑے انہماک سے سنتی تھیں۔ جبکہ عصمہ کا اندازِ بیان بھی بہت پیارا تھا۔

دروازہ کھٹکنے کی آواز سن کر عصمہ چونک گئی۔ وہ گھر میں اکیلی تھی۔ کہیں کوئی آفت ہی نہ آ گئی ہو۔

دراصل وہ ڈری ہوئی تھی۔ اوپر تلے حادثوں نے اس سے اس کی اعصابی قوت چھین کر ذہنی طور پر کمزور کر دیا تھا، لیکن دروازہ ٹوٹنے سے پہلے کھولنا ضروری تھا۔ وہ ہمت کر کے اٹھی اور دروازے کے پیچھے سے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''میں غفران ہوں جی!'' غفران کی آواز سن کر اس کی جان میں جان آئی تھی۔ اس نے کنڈی کھول دی۔ غفران نے اندر داخل ہو کر دروازہ بند کیا تو عصمہ نے چونک کر دیکھا اور بولی ''ماں جی گھر نہیں ہیں۔'' اور پھر وہ غفران کی عظمت کی قائل ہو گئی۔ اس نے دروازے کے دونوں پٹ وا کر دیئے۔ اس طرح کہ گلی سے گزرنے والا با آسانی ان کے صحن میں جھانک سکے اور عصمہ اس بات کا مقصد سمجھ گئی تھی۔ وہ کسی بھی لحاظ سے اسے بدنام نہ کرنا اور نہ ہونے دینا چاہتا تھا۔ وہ خود صحن میں آ کر بچھی چارپائی پر اس طرح بیٹھ گیا۔ جیسے کسی غیر کے گھر آیا ہو۔ جبکہ عصمہ باورچی خانہ میں چلی گئی۔ برتنوں کی آواز پر غفران سمجھ گیا کہ وہ اس کے لیے کھانا لا رہی ہے۔ پتہ نہیں وہ اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانے کے لیے کیوں چلا آتا تھا۔ اس سے پہلے وہ کبھی بھی روٹین کے ساتھ گھر نہ آیا تھا۔

لیکن اس ہفتہ میں تو یہ اس کا پانچواں چکر تھا۔ عصمہ اسے کیسے روک سکتی تھی۔ یہ اس کا اپنا گھر تھا۔ بلکہ وہ اس کے گھر میں رہ رہی تھی۔ یہ کم تھا کہ انہوں نے اس یتیم اور

لاوارث بچی کو پناہ دے رکھی تھی۔

''ہاتھ منہ دھولو'' عصمہ کی آواز پر اس نے اٹھ کر ہاتھ منہ دھونے شروع کر دیئے۔

اتنی دیر میں عصمہ نے کھانا اس کی چارپائی پر رکھ دیا تھا اور خود دوبارہ باورچی خانہ میں چلی گئی تھی۔ غفران نے کھانا کھانا شروع کیا تو ابھی پہلا ہی نوالہ لیا تھا کہ عصمہ کی آواز آئی۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، پڑھ کر کھانا شروع کرنا چاہیے۔'' یہ اس نے بہت حوصلہ کیا تھا کہ غفران کو ٹوکا تھا۔

اس نے اپنا ہاتھ روک لیا تھا کچھ توقف کے بعد اونچی آواز میں ''بسم اللہ'' پڑھنی شروع کر دی۔ عصمہ اس کے اس انداز پر مسکرا پڑی۔

وہ اسے کھانا کھاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ذہن میں شاہ جی کی آواز گونجنے لگی۔

''تمہارا مقدر اس گھر سے بندھا ہے۔ یہ گھر جنت بن جائے گا اور تمہارے لیے مقدر والا ثابت ہوگا۔'' شاہ جی نے کیوں کہا تھا؟ وہ سوچنے لگی کیا وہ اس گھر کی ہو کر رہ جائے گی۔ کیا غفران سے وہ شادی کرے گی؟ بظاہر تو ایسا کوئی ارادہ نظر نہ آ رہا تھا۔ مگر وہ شاہ جی کی بات کو جھٹلا نہ سکتی تھی۔ کیونکہ وہ آلِ رسول کی کہی ہوئی ہر بات کو پتھر پر لکیر سمجھتی تھی۔

جانی تو اس کا بھائی تھا اور شاہ جی نے کہا تھا کہ اب تمہارا ماں، باپ اور بھائی سب کچھ جانی ہی ہے۔ مگر اس گھر سے تعلق کس ناطے سے جوڑا تھا۔ غفران تو اس کی اتنی حیاء کرتا ہے کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا اور وہ بھی غفران کو اپنا محسن اور محسنہ کا بیٹا تصور کرتی تھی۔ اس نے کبھی بھی غفران کو اس نظر سے نہ دیکھا تھا۔ مگر اب دیکھنے کی ضرورت تھی۔ کیونکہ وہ لچا تھا۔ لفنگا تھا۔ یا پھر آوارہ تھا۔ مگر دلی اور ذہنی طور پر عصمہ کی حیاء کرتا تھا اور جب ایک لڑکی کو اس کی عزت اور حیاء کرنے والا مضبوط مرد مل جائے تو اسے گنوانا اپنے آپ سے زیادتی کرنے کے مترادف تھا۔

''یہ گھر تمہارے لیے مقدروں والا ثابت ہوگا اور پھر تمہاری وجہ سے اس گھر کے بھاگ بھی جاگ جائیں گے۔'' شاہ جی کی آواز پھر اس کے ذہن میں گونجی۔

اس کی توجہ سے اس گھر کے بھاگ کیسے جاگ سکتے ہیں۔ وہ تو بدنصیب ہے۔ والدین کی جدائی اور پھر بھائی بھی دیکھتے دیکھتے اس کے ہاتھوں میں ہی چلا گیا تھا۔ کہیں وہ اس گھر کی خوشیاں بھی نہ کھا جائے، کہیں اس گھر کو بھی اس کی نظر نہ لگ جائے۔ اس کی بدنصیبی کا سایہ کہیں اس گھر کو بھی آسیب زدہ نہ کر دے۔ پھر وہ کیا کرے گی؟ وہ کہاں جائے گی؟ کس کو اپنا کہے گی؟ مگر شاہ جی کی ہستی ایسی معتبر اور مستند تھی کہ ان کی بات پر بلا چون و

جر اں عمل اور یقین کیا جا سکتا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو مطمئن کر لیا تھا۔

اس نے دیکھا کہ غفران کھانے سے فارغ ہو چکا تھا۔ وہ برتن اٹھانے کے لیے آگے بڑھی تو دل کا چور باہر آ گیا۔

''اتنی بے شرمی اور بے حیائی سے اس کے سامنے جاؤ گی۔ شرم نہیں آتی؟''

''شرم کیسی؟ وہ کوئی غیر تھوڑا ہی ہے۔''

''پھر وہ تیرا کیا ہے؟ غیر ہی تو ہے۔''

''وہ میرا......'' اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

''احمد باؤ بھی تو تیرا ہی تھا۔ مگر پھر تجھے کیا ہوا؟ اسے کیوں چھوڑ دیا؟''

''وہ رب کریم کی ذات میں کسی انسان کو شریک بنا کر اسے سجدے کرتا تھا۔''

''مگر شریعت اور نماز روزہ کی پابندی تو یہ بھی نہیں کرتا۔''

''اسے میں سکھاؤں گی۔''

''اگر وہ نہ سیکھنا چاہے تو؟''

''میں اپنے پیار سے ایسا کروں گی۔ مجھے بھروسہ ہے۔ اپنے اوپر اور اپنے پیار پر۔''

''اگر وہ بھی تمہارے پیار کو ٹھکرا دے اور تمہیں گھاس ہی نہ ڈالے۔ یک طرفہ محبت کو لے کر کہاں جاؤ گی؟ کس کے در پر فریاد کرو گی؟''

''اگر ایسا ہو گیا تو پھر شاہ جی کا کہا ہوا غلط ہو گا۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ جس خاندانِ اعلیٰ سے شاہ جی کا تعلق ہے، ان کی کہی ہوئی ہر بات سچی ثابت ہوئی ہے اور تا قیامت سچی ہی ثابت ہو گی۔ تم مجھے ورغلانے کی کسی بھی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکو گے۔'' اس نے اپنے دل کے چور کو تسلی اور دھمکی دے کر بھگا دیا تھا۔

اس نے خاموشی سے اس کے سامنے سے برتن اٹھائے اور باورچی خانے میں گھس گئی تو غفران کی آواز آئی۔

''یہ ماں جی کدھر گئی ہیں؟''

''شاہ صاحب کے پاس، ان کی حویلی میں ختم شریف تھا۔'' اس نے باورچی خانہ کے دروازہ میں کھڑے ہو کر کہا۔ آج اس کا جی چاہتا تھا کہ غفران اس سے ڈھیروں باتیں کرے۔

''آپ کا دل ......'' غفران کی اس ادھوری بات پر وہ چونکی تو تھی۔ مگر دل بھی اس زور سے دھڑک اٹھا کہ ابھی پسلیاں توڑ کر سینے سے باہر آ جائے گا۔

''جی میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔'' اس نے بمشکل کہا تھا۔ وہ غفران کو تم کہہ کر ہی پکارتی تھی۔ مگر وہ عصمہ کی عزت و تکریم کرتا تھا۔ وہ اسے ''آپ'' ہی کہتا تھا۔

''میرا مطلب تھا کہ اس گھر میں آپ کا دل لگ گیا ہے؟ کوئی اداسی تو نہیں ہوتی نا۔''

اس کا منہ بدستور عصمہ کی مخالف سمت تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ وہ سامنے والی دیوار سے باتیں کر رہا ہو جبکہ عصمہ اس کے پیچھے کھڑی تھی۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے تاثرات دیکھنے سے قاصر تھے۔

''اداسی تو جانے والے لوگوں کو یاد کر کے چپکے سے دل میں آ کر بیٹھ جاتی ہے۔'' وہ غمگین لہجے میں بولی تو غفران کو پچھتاوا لگ گیا کہ اس نے اداسی کی بات کیوں کی۔ یہ نامراد ایسی ہی چیز ہے کہ اگر کہیں ٹھہر جائے تو پھر ٹھہر ہی جاتی ہے۔

''جانی نے آپ کے لیے کچھ روپے دیئے ہیں جی۔'' اس نے جیب سے بہت سارے روپے ہاتھ پیچھے کر کے عصمہ کو پکڑانے چاہے تو اس کی آواز گونجی۔

''یہ روپیہ اور پیسہ تو میری ضرورت نہیں ہے۔ مجھے تو بس خلوص اور رشتوں کی بھوک ہے پیار اور محبت کی متلاشی ہوں میں۔''

اس نے ہاتھ واپس کھینچ لیا تھا۔ عصمہ کا آخری فقرہ اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ گیا تھا۔ ایک ہلکی سی جھنجھناہٹ ہوئی تھی۔ اس نے روپے چارپائی پر رکھ دیئے۔ وہ پڑھا لکھا تو نہ تھا کہ عصمہ کی اس بات کا مناسب جواب دیتا۔ پھر بھی اس نے اپنی دانست میں الفاظ کو اپنے ذہن میں جمع کیا اور اپنی زبان سے ادا کرنے لگا۔

''پیار، محبت اور خلوص تو آج کل بمشکل ملتا ہے۔ کاغذ کے ان ٹکڑوں نے ان چیزوں کو نایاب کر دیا ہے۔ یہ چیزیں آپ اس روپے سے با آسانی خرید سکتی ہیں، لیکن میرے اس گھر سے آپ کو یہ چیزیں بالکل ''مفت'' مل جائیں گی۔ کیونکہ ہم ان چیزوں کو کسی بھی قیمت پر فروخت نہیں کرتے۔ بس اس کے بدلے میں آپ کو وہی چیزیں بطور قیمت ادا کرنا ہوں گی۔ جو ہم آپ کو دیں گے۔'' وہ خاموش ہوا تو عصمہ سوچنے لگی۔ یہ کیا ہے؟ اتنی اچھی بات اس اَن پڑھ اور علم سے دور شخص کے ذہن میں کیسے آ گئی۔ وہ سب کچھ جان کر سمجھ کر انجان اور ناسمجھ بن گئی۔

''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔''

''میرا مطبل ہے کہ۔'' عصمہ نے اسے درمیان میں ہی ٹوک دیا تھا۔

''مطبل نہیں، مطلب۔''

وہ کھسیانا سا ہو کر ہنسا۔ ''ہاں جی مطلب۔'' اس کی سوئی اپنی جگہ پر اٹکی ہوئی تھی۔ جبکہ اس کی سادگی عصمہ کو بہت بھلی لگی۔

''یعنی خلوص اور محبت کی اس گھر کو بھی بہت ضرورت ہے جی۔'' وہ چارپائی سے اٹھتا ہوا پھر بولا تھا۔ ''یہ روپے رکھ لیں جی۔ آپ کے بہت کام آئیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا اور دروازے پر کھڑے ہو کر آواز دی۔

''دروازہ اندر سے بند کر لیں جی۔ بس آواز پہچان کر کھولا کریں۔''

عصمہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مگر اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ عصمہ کو بہت پیارا اور معصوم لگا۔ اسی لمحے وہ اس کے دل میں گھس کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ عصمہ کا دل نہیں چاہتا تھا کہ دروازہ بند کرے۔ مگر آنے جانے والے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور یہ بات غفران کو ناگوار گزر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر امڈ آنے والے تاثرات اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ عصمہ کو اس کی آنکھوں کے سوا کوئی نہ دیکھے۔ مگر وہ خود بھی تو اسے نہ دیکھ رہا تھا۔ یہ اس کی نظروں کا احترام تھا۔

عصمہ نے دروازہ بند کیا تو وہ چلا گیا جبکہ عصمہ کتنی ہی دیر دروازے سے ٹیک لگائے اپنی منہ زور دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔ مگر بے سود، ناکام رہی۔ دل سینے سے باہر آنے کو مچل رہا تھا۔ اس تمام کیفیت کا کیا مطلب تھا؟

کیا وہ اسے چاہنے لگی ہے؟ اسے پسند کرنے لگی ہے۔ اس سے محبت ہو گئی ہے؟ مگر یہ تب کیوں نہ ہوئی جب وہ اس کے سامنے پہلی مرتبہ آیا تھا۔ محبت تو پہلی ہی نظر میں ہو جاتی ہے۔ ہاں یہ اس کی پہلی ہی نظر تھی۔ اس نے غفران کو کبھی بھی محبت کی نظروں سے نہ دیکھا تھا۔ مگر آج پہلی ہی نظر سے دیکھا تو محبت نے اپنا کام کر دکھایا تھا۔

عصمہ نے محبت کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ بہت کچھ پڑھا تھا۔ مگر ان خرافات سے دور ہی رہنا چاہتی تھی۔ اس کی ایک دوست ٹیچر اس سے کہا کرتی تھی کہ یہ محبت خود بخود ہی ہو جاتی ہے۔ اس پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ مگر عصمہ اس بات کی تردید کرتی تھی کہ کیسے اختیار نہیں ہوتا۔ ہر چیز انسان کے اختیار میں ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ تمام چیزیں اس کے اختیار میں دی ہیں۔ پھر یہ محبت ہے کیا بلا کہ اس پر انسان کا بس نہ چلے؟ عصمہ اس کی بات کو جھٹلا دیتی تو وہ جھلا کر کہتی۔

''جب تمہیں کسی سے محبت ہو گی۔ تب دیکھنا، اپنا کتنا اختیار اپنے دل پر استعمال کرتی ہو۔'' وہی ہوا تھا۔ وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی تھی۔ بے اختیار ہو گئی تھی۔ وہ کیوں ایسا کر رہی

تھی۔ نہیں نہیں وہ تو خود ایسا کر ہی نہیں سکتی۔ یہ سب کچھ اس سے محبت کروا رہی ہے۔

اس کے روزمرہ کے معمول میں کافی تبدیلی آ گئی تھی۔ صبح اٹھ کر غفران کا بستر جھاڑ کر اکٹھا کرنا۔ اس کے کپڑوں کو ترتیب سے رکھنا۔ اس کے جوتے پالش کرنا۔ اسے دیکھتے رہنا۔ یہ سب کیا تھا۔ محبت تھی اور ایک اور کام جو ہر روز رات گئے تک جاگنا اور غفران کا انتظار کرنا۔ وہ چاہتی تھی کہ غفران روزانہ گھر آئے۔ اپنے گھر میں سویا کرے۔ اس کے ساتھ، ماں جی کے ساتھ کھانا کھایا کرے۔ مگر وہ ہر بار کام کی زیادتی کا بہانہ بنا کر ماں جی کو بھی ٹال دیتا تھا اور عصمہ کو بھی سنا دیتا تھا۔

عصمہ کے چہرے پر غفران کو دیکھ کر جو رنگ بکھرتے تھے۔ وہ ماں جی نے بہتر طور پر محسوس کر لیے تھے اور خدا سے دعا گو ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ عصمہ کے ذریعے ہی غفران کو نیکی کی راہ پر ڈال دے۔ غفران نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ عصمہ اس میں خاطر خواہ دلچسپی لے رہی ہے۔ وہ کسی بھی فیصلے تک پہنچنے سے پہلے شیخ عمر حیات اور اس جعلی پیر سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتا تھا۔ اب بھی وہ سیدھا جانی کے پاس پہنچا تھا۔

''تیری بہن تجھے سلام کہہ رہی تھی۔'' اس نے اندر داخل ہونے پر جانی کو کہہ دیا۔

''کیسی ہے وہ؟'' جانی جو چائے بنا رہا تھا۔ چولہے کے پاس سے اٹھ کر غفران کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

''دودھ ہے تو ایک پیالی مجھے بھی دے دو۔'' غفران نے اس کی بات کا جواب تو نہ دیا اور اپنا چائے پینے کا مطالبہ پیش کر دیا۔

جانی نے دیگچی میں مزید دودھ ڈالا اور چائے بنا کر غفران کے پاس ہی زمین پر آ بیٹھا۔

''اچھی ہے۔ وہ پیسے ہی نہ لے رہی تھی۔'' غفران نے اب اس کی بات کا جواب دیا تو جانی مسکرا کر اس کے قریب ہو گیا۔ ''کہہ رہی تھی کہ مجھے یہ روپے نہیں بلکہ پیار اور محبت کی ضرورت ہے۔'' وہ پھر بولا اور چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ وہ چپ نہ رہ سکتا تھا۔

''دیکھ یار، میرا مطلب ہے پایا کہ جتنے جوگے ہیں اس کا خیال تو رکھ ہی رہے ہیں نا۔'' غفران بولا۔

''خیال رکھنا اور بات ہوتی ہے اور خیال کرنا اور بات، تم کیا کرتے ہو؟'' جانی نے سوال کیا۔ تو وہ اسے گھور کر دیکھنے لگا۔ چائے کی چسکی لیتے ہوئے بولا۔

''تو پڑھی لکھی بات کر کے مجھے پریشان کر دیتا ہے۔ تو بتا کیا کرنا چاہیے؟''

"لو الٹی آنتیں گلے کو پڑ گئیں۔ میں تو لڑکی کا بھائی ہوں میں کیسے بتا سکتا ہوں بھلا؟" جانی اس سے سچ اگلوانا چاہتا تھا۔

"تُو پہلے میرا یار بھی تو ہے۔ چل تُو یار بن کر ایک اَن پڑھ یار کو مشورہ دے دو جو مخلص اور مفت ہو۔" اس نے چائے کی پیالی ختم کر لی تھی۔

"تم اس کا کس لحاظ سے کتنا خیال رکھنا چاہتے ہو؟" جانی نے پوچھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ اسے میرے گھر میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ وہ میری کسی بات سے کبھی بھی ناراض نہ ہو۔" وہ دور خلاؤں میں گھورتا ہوا بول رہا تھا۔ "جانی بادشاہ، اس نے چھوٹی سی عمر میں ہی بہت سے دکھ دیکھ لیے ہیں۔ اب کوئی بھی دکھ اسے تنگ نہ کر سکے۔ کوئی بھی پریشانی اسے نہ ستا سکے۔ بس ایسا ہی خیال رکھنا چاہتا ہوں اس کا۔" اس نے بات ختم کی۔

"مگر کیوں؟" جانی بھی چائے پی چکا تھا۔ "وہ تمہاری کیا لگتی ہے؟ میرا مطلب ہے کہ تمہارا اس سے کیا رشتہ ہے؟"

"یہ تو مجھے پتہ نہیں کہ وہ میری کیا لگتی ہے۔" وہ جانی کی بات کا جواب پڑھے لکھے لوگوں کی طرح دینا چاہتا تھا۔ "پر میرا اس کے ساتھ انسانیت کا رشتہ ضرور ہے۔ میں نے ایک بار شاہ جی سے سنا تھا کہ انسانیت کی معراج کو بلند رکھو۔"

"اس تمام معاملات میں میرا خیال ہے کہ تم وہ بات بھول رہے ہو جس سے عصمہ کو بہت سکون ملے گا۔" جانی نے کہا تو اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور استفہامیہ نظروں سے پوچھا۔

"کون سی بات؟"

"خالد کا قتل۔" جانی کے اس چھوٹے سے جواب نے اس کے چہرے کا رنگ متغیر کر دیا تھا۔ وہ زمین پر سے اٹھتا ہوا بولا۔

"جانی بادشاہ!...... اس معصوم کا قتل میں ساری عمر نہیں بھول سکتا۔ تم دیکھنا میں اس کے قاتلوں کو کس اذیت ناک موت سے دوچار کروں گا۔ ان کی روحیں بھی کانپ اٹھیں گی۔"

کچھ دیر پہلے والا غفران ختم ہو چکا تھا۔ اس کی جگہ ایک وحشی اور خونخوار غفران نے لے لی تھی۔

"میں نے اس سلسلہ میں کافی کام کر لیا ہے۔ شیخ کو محض ڈرانے کے لیے جو ڈرامہ کیا تھا، وہ بھی کامیاب رہا ہے۔ اب ایمان اور ڈاکٹر شارق کو دیکھنا ہے۔" جانی نے بھی اس کا مزاج سمجھ کر بات کہی۔

"جانی بادشاہ!" وہ اس کی طرف مڑا۔ "میں اس کام میں مزید دیر برداشت نہیں کر سکتا اور احمد باؤ کا کیا بنا؟"

"آپ خود دیکھو گے غفران بھائی کہ احمد باؤ کس طرح اس لعنت میں پھنسے گا۔" جانی بولا۔

"وہ بھی تڑپ تڑپ کر مرے گا۔ جس طرح خالد مرا تھا۔ شیخ عمر حیات تمہارا یہ واحد چراغ تمہارے منہ سے نکلنے والی پھونک سے ہی بجھاؤں گا۔" غفران ایک بار پھر جانی سے مخاطب ہوا۔ "آج رات ہی ڈاکٹر کا کام تمام کرو۔ جو بھی طریقہ کار ہے۔ مجھے اس ڈھونگی اور جعلی پیر کا مکمل پتہ چاہیے۔ وہ تو شیخ عمر حیات کا خدا بن کر بیٹھا ہوا ہے۔"

"آپ فکر نہ کرو غفران بھائی۔ ایسا ہی ہوگا۔" جانی نے اسے کندھے پر ہاتھ مار کر تسلی دی۔

"میں ڈاکٹر کا بندوبست کرتا ہوں۔ آپ احمد باؤ کا پتہ کریں۔"

غفران نے جانی کی بات سن کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ جانی فوراً باہر نکل گیا۔ جبکہ غفران آئندہ کے لیے لائحہ عمل طے کرنے لگا۔ شیخ عمر حیات پر ہاتھ ڈالنے کے لیے یقیناً ایک لمبی چوڑی پلاننگ کی ضرورت تھی۔ باقاعدہ ثبوت بھی ہونے چاہئیں جن سے سرکاری محکموں کو آگاہ کیا جا سکے تاکہ وہ شیخ کی اینٹ سے اینٹ بجا سکیں۔ اس نے بھی ڈاکٹر شارق کو چیک کرنے کا پروگرام بنا لیا تھا۔ جانی اپنے طور پر معلومات اکٹھی کر لے گا۔ جبکہ وہ اپنے طور پر ڈاکٹر شارق کی شہ رگ پر پاؤں رکھ کر سب کچھ اگلوائے گا۔

اسے نہ جانے کیوں یہ ڈاکٹر بہت اہم مہرہ لگ رہا تھا۔ کیونکہ آخری مرتبہ اسی نے پارٹی اٹینڈ کی تھی۔ جس میں اس کی بہت بڑی ڈیل ہوئی تھی جو کہ عمر حیات نے کہا تھا کہ بابا جی کو اس تمام ڈیل کا پتہ نہیں چلنا چاہئے تھا۔ جب سے غفران، شیخ سے علیحدہ ہوا تھا۔ دونوں نے ایک ایک مرتبہ ایک دوسرے کو چوٹ پہنچائی تھی۔ غفران کو پولیس نے مارا تھا۔ جبکہ شیخ کو غفران نے اس طرح مارا تھا کہ وہ اپنے زخم کسی کو دکھانے کے قابل نہ رہا تھا۔

اب غفران، خالد کی موت کو سامنے رکھتے ہوئے اسے ایک بار پھر اس کی حرکت کا جواب دینے والا تھا۔ اس نے رات کو ڈاکٹر کے گھر کی تلاش کا پروگرام بنایا تھا۔ اب وہ آرام کرنا چاہتا تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے لیٹ تو گیا۔ مگر سامنے عصمہ آن کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں مگر آس پاس کسی کو نہ پا کر وہ خود ہی مسکرانے لگا۔

ذرا سی کوشش کے بعد وہ سونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کی گہری نیند نے اسے عجیب سا خواب دکھایا تھا۔ اس نے دیکھا۔

''ایک بہت بڑی مسجد ہے جس کی کوئی حد نہیں ہے۔جس کے فرش پر سرخ رنگ کے قالین بچھے ہوئے ہیں۔اس مسجد کی پہلی صف میں بہت سے لوگ جو کہ اعلیٰ لباس زیب تن کیے ہوئے ہیں۔دونوں طرف قطاروں کی صورت میں کھڑے ہیں۔باادب اور باملاحظہ انداز میں سروں کو جھکائے تمام افراد ایسے کھڑے ہیں جیسے انہیں کسی کا انتظار ہے۔ان میں ایک غفران بھی تھا۔جس نے میلا کچیلا لباس پہنا ہوا تھا مگر قطار میں موجود تھا۔اس کا بھی سر جھکا ہوا تھا۔ادب واحترام سے اس کی آنکھیں بھی دیدہ و[illegible]رشِ راہ تھیں۔اچانک دائیں طرف سے ایک آدمی آ کر آواز دیتا ہے۔''صفیں باندھ لو۔اپنی قطاریں درست کرلو۔''وہ'' آرہے ہیں اپنے دل اور آنکھیں بچھالو۔''وہ'' آرہے ہیں۔''حضرت پیران پیر آرہے ہیں۔''

اچانک ایک طرف سے ایک نورانی وجدانی اور قلب کو سکون دینے والی خوبصورت شکل کے بزرگ جنہوں نے سفید رنگ کا لمبا سا چغہ پہن رکھا تھا۔ان کے سر پر عمامہ شریف بھی سفید رنگ کا تھا۔جس پر ہیرے موتی جواہرات جڑے ہوئے تھے۔تشریف لا رہے تھے۔ان کے پیچھے پیچھے ہاتھ باندھ کر چلنے والے عقیدت منداپنے سروں کو جھکائے ہوئے چل رہے تھے۔دونوں قطاروں والے ان کو سلام پیش کررہے تھے۔

وہ جب غفران کے پاس پہنچے تو غفران کو کسی نے دھکا دے دیا۔وہ قطار سے نکل کر ان محترم بزرگ کے سامنے چلا گیا۔انہوں نے محبت بھری مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا اور اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔غفران نے محبت اور عقیدت سے ان کا ہاتھ چوم لیا۔اس کی آنکھوں سے گرم پانی کے قطرے بہنے لگے۔بزرگ نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر کہنا شروع کیا۔

''اب کسی بھی پریشانی کی ضرورت نہیں ہے۔کوئی بھی ناجائز کام مت کرنا۔اپنے تمام کام اور تمام فیصلے اللہ پر چھوڑ دو۔وہ بہتر عدل کرنے والا ہے۔مزید باتیں تمہیں تمہارا مرشد رشید حسین بخاری بتادے گا۔ہمارے پاس آتے رہنا۔اللہ تمہاری رہنمائی فرمائے گا۔''

انہوں نے غفران کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ نرمی سے علیحدہ کیا اور آگے کی طرف بڑھ گئے۔غفران کی آنکھوں نے ساون کی جھڑی لگا دی تھی۔بزرگ کے پاک وجود سے اٹھنے والی خوشبو اور نورانیت سے بھرپور چہرے نے غفران پر بڑا گہرا اثر کیا تھا۔وہ واپس اپنی قطار میں آیا تو وہاں شاہ جی کو کھڑے دیکھا جو اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔غفران نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی تو اپنے پاس کسی کو بھی نہ پا کر بڑا حیران ہوا۔تمام لوگ نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔وہ منظر بھی یکسر بدل گیا تھا۔اب وہ ایک لق ودق صحرا میں کھڑا تھا۔

جبکہ شاہ جی بھی غائب ہوگئے تھے۔اس نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا تو خوف کی شدت سے کانپ اٹھا۔اس کے سر پر گدھ ہی گدھ منڈلا رہے تھے۔وہ اسے مردہ تصور کرکے نوچنے کے لئے غوطے لگانے لگے۔غفران نے چیخ ماری اور ہاتھوں سے انہیں دور رکھنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔وہ جیسے کہہ رہا ہو کہ میں مرا نہیں ہوں۔ابھی زندہ ہوں۔اس کے کپڑے اور تمام وجود پسینے سے شرابور ہو چکے تھے۔وہ چیخ بھی رہا تھا اور رو بھی رہا تھا۔

اسی کشمکش میں اس کی آنکھ کھل گئی۔اس نے اپنے آپ کو وہیں چارپائی پر پڑے ہوئے پایا جبکہ اس کے تمام کپڑے پسینے سے شرابور تھے اور چہرہ بھی آنسوؤں سے تر ہو چکا تھا۔وہ اس خواب سے بڑا پریشان ہوا تھا۔اس کی دھڑکنیں بے قابو ہو رہی تھیں۔

اس نے جلدی سے اٹھ کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے شروع کر دیئے۔اس کے ہوش کچھ ٹھکانے آئے تو اس نے خواب پر غور کرنا شروع کر دیا۔آج سے پہلے اس نے کبھی بھی نورانی خواب نہ دیکھا تھا۔وہ تو ویسے ہی شاہ جی کے سامنے نہ جاتا تھا۔مگر اب وہ خواب میں آ کر اسے سیدھی راہ پر چلنے کو کہہ رہے تھے اور وہ نورانی صورت والے بزرگ کون تھے؟ ان کی موہنی سی صورت غفران کے تصور میں بس گئی تھی۔

اور وہ وسیع و عریض مسجد، وہ کون سی جگہ تھی؟ تمام لوگ عقیدت و احترام سے اس بزرگ کے پیچھے ہاتھ باندھ کر کیوں چل رہے تھے۔جبکہ دونوں طرف قطاروں میں بھی بزرگان ہی کھڑے تھے اور پھر ان بزرگوں کا یہ کہنا کہ تمام معاملات اللہ پر چھوڑ دو۔وہ بڑا بہتر عدل کرنے والا ہے، کن معاملات کی طرف اشارہ تھا اور پھر شاہ جی کے آتے ہی تمام نورانی منظر غائب ہو جانا اور اس کے سر پر مردار کھانے والے گدھوں کا منڈلانا۔وہ سب کچھ سوچ کر ایک بار پھر کانپ کر رہ گیا۔وہ اس واقعہ کا ذکر کس سے کرے جو اس کے ساتھ خواب میں پیش آیا تھا۔

وہ جانی سے بات کرے گا۔ہاں وہ پڑھا لکھا ہے۔وہ کچھ نہ کچھ ضرور بتائے گا۔
ہاں، وہ جانی سے ہی بات کرے گا۔

''لیکن میں نے تو سنا ہے کہ خواب تو خواب ہی ہوتے ہیں۔ان میں کوئی سچائی نہیں ہوتی۔'' وہ کبھی ذہن کو تسلی دیتا اور کبھی ذہن اسے ورغلانے لگتا۔

اس نے بہت سوچ بچار کے بعد جانی سے ہی بات کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

جانی اس وقت ایمان کی کوٹھی میں گھوم رہا تھا۔ایمان کا ایڈریس اس نے عصمہ سے لے لیا تھا۔

”جانی بھائی! کوئی خاص بات ہے۔“عصمہ نے اس کا پتہ بتاتے ہوئے مخصوص انداز میں پوچھا تو جانی جھینپتے ہوئے بولا۔

”میرا کوئی بھی ایسا ویسا ارادہ نہیں ہے کہ میں اس خاص قسم کے چکروں میں پڑوں اور تم بہن ایسا مت سوچو۔ ایک بہت ہی خاص بات ہے جو آپ کی سہیلی کو پتہ ہے۔“ وہ عصمہ کو کبھی تم اور کبھی آپ کہہ کر پکارتا تھا۔ جھجک کا امر ابھی بھی مانع تھا کہ وہ عصمہ کو تم نہ کہے لیکن وہ اس سے چھوٹی تھی۔ اس لیے کبھی کبھار ڈنڈی مار جاتا تھا۔

غفران کی صحبت اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ وہ اس کوٹھی میں تنہا گھوم رہا تھا۔ کوئی چوکیدار وغیرہ نہ تھا۔ غالبًا ایمان تنہائی پسند تھی۔ یا پھر بہت محتاط رویہ اختیار کرتی تھی کہ اس کے زیادہ دوست نہ ہوں گے۔ وہ محتاط انداز میں ایک سے دوسرے کمرے میں جاتا لیکن وہاں کسی کو نہ پا کر اسے حوصلہ ہو جاتا۔ اب وہ ایک ڈرائینگ روم میں تھا۔ جسے بہت سلیقے اور نفاست سے سجایا گیا تھا۔

بیڈ روم کی نسبت ڈرائینگ روم میں زیادہ قیمتی اشیاء رکھی گئی تھیں۔ تمام کوٹھی بلکہ ہر جگہ ہی کھلی پڑی تھی کسی بھی کمرے کو کوئی تالا نہ تھا۔ گھر میں بہت قیمتی اشیاء موجود تھیں۔ کوئی بھی با آسانی چرا سکتا تھا۔ پھر اتنی لاپرواہی سے وہ کیسے اور کہاں جا سکتی ہے۔ اس نے ڈرائینگ روم سے اوپر جاتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف دیکھا اور اوپر والے پورشن کو چیک کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ وہ آگے پیچھے دیکھتا ہوا احتیاط سے سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ ایک ناگوار سی بو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ وہ محتاط ہو گیا۔ اس نے اوپر جا کر دیکھا۔ تو سیڑھیوں کے سامنے والا کمرا بند ملا اس کے دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ ساتھ ہی کچن تھا۔ جبکہ اس کے ساتھ ہی ایک بیڈ روم تھا۔ اس نے کچن میں جھانکا۔ مگر مایوس ہوا۔ پھر اس نے بیڈ روم بھی دیکھا۔ مگر وہ بھی خالی ملا۔ اس نے بند کمرے کو چیک کرنے کا سوچا۔ وہ کچن میں داخل ہوا تو اسے احساس ہوا کہ ناگوار بو گیس کی تھی جو چل رہی تھی۔ اس نے چولہے کی ناب گھما کر اسے بند کر دیا اور کچن میں باہر کی طرف کھلنے والا روشن دان کھول دیا۔ اس نے دائیں دیوار کی طرف دیکھا تو ایک پردہ لگا ہوا نظر آیا۔ اس نے پردہ اٹھا کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ ایک چھوٹا سا دروازہ نما راستہ اس بند کمرے کی طرف جاتا تھا۔ وہ بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ یہ تو اس نے دیکھ ہی لیا تھا کہ تمام کوٹھی خالی پڑی ہے۔ اس نے دیوار ٹٹول کر بجلی کا سوئچ تلاش کر کے لائٹ آن کی تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ اس کا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا۔ ایک خوفناک منظر اس کی نگاہوں کا منتظر تھا۔ سامنے بیڈ پر ایمان کی

خون میں لت پت لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس نے وہاں سے بھاگ جانا چاہا کہ کہیں اس قتل کا الزام اس پر نہ آ جائے مگر وہ بزدل نہ تھا۔ اس نے قریب جا کر دیکھا تو گردن پر باریک تار لپٹی ہوئی نظر آ گئی۔ اس نے بہت احتیاط سے وہ تار اس کی گردن سے الگ کر لی۔ ایمان کی خوبصورت آنکھیں حیرت سے کھلی ہوئی تھیں۔ جیسے کہ اسے قاتل پر یقین نہ آ رہا تھا۔ وہ قاتل کو یقینی طور پر بہت قریب سے جانتی ہو گی۔ اس نے ایک چادر اٹھا کر اس کے جسم پر ڈال دی۔ کیونکہ بغور جائزہ لینے پر جانی کو معلوم ہوا کہ قتل کرنے سے پہلے اس کے ساتھ زیادتی بھی کی گئی ہے۔ جانی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کرے؟

وہ پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر نظر دوڑا رہا تھا۔ اس کی نظر کونے میں رکھے ہوئے میز پر پڑ گئی۔ وہ پاس گیا تو اس پر تین مگ جو کہ خالی تھے، پڑے ہوئے تھے۔ اس نے تینوں مگ باری باری سونگھے تو اس پر انکشاف ہوا کہ ایک مگ میں کوئی دوائی ملا کر کسی کو پلائی گئی ہے۔ یقیناً ایمان کو قاتل نے بے ہوشی کی دوا ملا کر کافی پلائی ہو گی اور پھر بے ہوش ہونے پر اس کا ریپ کر ڈالا ہو۔ ہوش میں آنے پر اس کے دوسرے ساتھی نے اس کے گلے میں تار ڈال کر موت کی نیند سلا دیا ہو۔

مگر قاتل نے کسی بھی چیز کو نہ چھیڑا تھا۔ ایمان کے بازوؤں میں یعنی اس کی کلائیوں میں سونے کے دونوں کنگن بھی بدستور موجود تھے۔ جانی نے دوبارہ لاش کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس نے ایمان کے دونوں کنگن بھی اتار لیے اور کانوں میں موجود ٹاپس بھی اتار لیے۔ اسے ڈر بھی لگ رہا تھا۔ مگر یہ کام بھی بہت ضروری تھا۔ اس نے کمرے کی تلاشی لی تو دیوار میں ایک الماری نظر آ گئی جو کھولنے پر خالی معلوم ہوئی۔ اس میں سے چند کاغذ نیچے آ گرے۔ جانی نے ان میں سے ایک کارڈ اٹھا لیا۔ اس نے غور سے کارڈ پڑھا تو اس کی آنکھیں مسکرانے لگیں۔ کارڈ کافی پرانا چھپا ہوا تھا۔ اس پر ایڈریس کراچی کا لکھا ہوا تھا۔ ایک نام جلی حروف میں لکھا دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ کیا معاملہ ہے۔ ایمان کو کس نے قتل کیا ہے۔ اب وہ بہت جلد قاتل اور اس کے شریک کو چیک کرنا چاہتا تھا۔

اس نے جلدی سے اپنے تمام وجود کا جائزہ لیا اور پھر حسرت سے لاش کی طرف دیکھا۔ کتنا معصوم حسن تھا جو بیدردی سے خاک میں ملانے کے لیے ختم کر دیا گیا تھا۔ خون کی چپچپاہٹ سے اندازہ ہوتا تھا کہ ایمان کو تقریباً چار پانچ گھنٹے پہلے ہی قتل کیا گیا ہے۔ اس نے اب گیٹ سے جانا مناسب نہ سمجھا تھا۔ وہ کوٹھی کی پچھلی دیوار پھلانگ کر خالی پلاٹ میں کود گیا۔ شام کو پھیلنے والے ملگجی اندھیرے نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ ویسے بھی اس ماڈرن

ایریا میں زیادہ تر اپنی اپنی کھال میں مست رہنے والے لوگ رہتے تھے۔ کوئی بھی کسی کے کام میں مداخلت نہ کرتا تھا اور نہ ہی کسی کی مداخلت اپنے کام میں برداشت کرتا تھا۔ جبھی تو ایمان کے قتل کا ابھی تک کسی کو پتہ نہ چلا تھا۔

اس نے تھوڑا سا آگے آ کر ایک پبلک کال آفس کے کیبن سے متعلقہ تھانے کا نمبر معلوم کرنے کے بعد انہیں کوٹھی نمبر اور ایڈریس سمجھایا اور بتا دیا کہ وہاں پر ایک خوبرو دوشیزہ کی لاش پڑی ہے جو پولیس کے لئے ایک امتحان ہوگا۔ وہ تقریباً پندرہ منٹ تک اسی ایریا میں ٹہلتا رہا۔ اس نے پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنے تو اسے اطمینان ہوا کہ اب ایمان کو قبر کی مٹی نصیب ہو جائے گی۔

وہ جلد از جلد غفران کو سب کچھ بتانا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو نارمل کر لیا تھا۔ ایمان کے دونوں کنگن اور اس کے کانوں کے ٹاپس اور اس کے گلے سے ملنے والا آلہ قتل یعنی تار جانی کے قبضے میں تھیں۔ وہ گھر پہنچا تو غفران کو پریشانی کے عالم میں ٹہلتے ہوئے پایا۔ جانی نے اندر داخل ہو کر باہر کا دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ وہ گھبرایا ہوا لگ رہا تھا۔ غفران اس کی ان حرکتوں کو مشکوک انداز میں دیکھ رہا تھا۔ اس نے جانی کو کبھی بھی اتنا نروس نہ دیکھا تھا۔

وہ تالا لگا کر واپس مڑا۔ اس سے پہلے کہ غفران کوئی سوال کرتا۔ اس نے اس کا بازو پکڑا اور تقریباً کھینچتا ہوا پچھلے کمرے میں لے گیا۔ غفران حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا اور جانی بھی منہ سے کچھ نہ بول رہا تھا۔ غفران کو اس کا یہ انداز بہت ہی عجیب لگا تھا۔ کیونکہ جانی کا سانس پھولا ہوا تھا۔

''غفران بھائی!'' وہ اپنے سانس کو درست کرتے ہوئے بولا۔ ''ایمان قتل ہو گئی ہے۔'' غفران پر ایٹم بم گر پڑا تھا۔ یہ خبر سن کر وہ اپنا خواب اور پریشانی بھول گیا تھا۔ گو کہ اس نے ایمان کو دیکھا نہ تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ بابا جی کی کھوج میں وہ ایک اہم حیثیت رکھتی تھی۔ اس نے خشمگیں نظروں سے جانی کے چہرے کا جائزہ لیا۔ جس پر غفران کی تجربہ کار نظروں نے سچ پڑھ لیا تھا۔

جانی اپنا سانس درست کر چکا تھا۔ اس نے غفران کی نظروں میں استفہامیہ انداز محسوس کر کے تمام بات اسے من وعن بیان کرنی شروع کر دی۔ جوں جوں جانی ایمان کے قتل کی روداد بیان کرتا جا رہا تھا۔ غفران کے چہرے پر رنگوں کا جال بکھرتا جاتا تھا۔ وہ اپنے چہرے کو متغیر ہونے سے محفوظ کرتا تو کوئی نہ کوئی انوکھی بات اس کے چہرے پر زلزلے کے

آثار پیدا کر دیتی تھی۔

جانی نے کنگن، ٹاپس اور تار نکال کر غفران کے سامنے رکھ دی۔ وہ تار کو غور سے دیکھنے لگا اور بولا۔

''قاتل کی سفاکی اور درندگی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ صرف ایمان کی عزت سے نہ کھیلنا چاہتا تھا۔ بلکہ اسے بے آبرو کرنے کے بعد اس کو ہمیشہ کے لئے موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا تھا۔ کیونکہ قاتل کے پاس اس دھاتی تار کا موجود ہونا اس بات کا ثبوت ہے۔'' غفران کے تجزیے نے جانی کو سر ہلانے پر مجبور کر دیا۔

''اور تمہیں جو کارڈ ملا ہے جس کا ذکر تم کر رہے تھے۔ اس پر کس کا نام و پتہ ہے۔ کیا وہ کسی کمپنی کا کارڈ ہے؟'' غفران نے جانی سے سوال کیا تو اس نے چونک کر جیب سے وہ کارڈ نکال کر غفران کی طرف بڑھا دیا۔

''اتنی سیریس کنڈیشن میں بھی تو ''مذاق'' سے باز نہیں آیا۔'' اس نے کارڈ پکڑے بغیر جانی کو کہا تو وہ شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ غفران اَن پڑھ ہے۔

''غفران بھائی! اس پر ڈاکٹر شارق کا نام و پتہ درج ہے، لیکن حیرانگی کی بات ہے کہ شارق کلینک کا پتہ یہاں کا نہیں ہے۔ بلکہ کراچی کے ایک بدنام علاقے کا ہے۔''

جانی نے کہا تو غفران نے اسے پتہ پڑھنے کو کہا۔ جانی نے پتہ پڑھا تو غفران ''ریڈ لائٹ ایریا'' کے نام پر چونک پڑا اور اور سختی سے بولا۔ ''پنجابی میں پڑھ ورنہ ابھی چھترول شروع کر دوں گا۔''

''غفران بھائی۔ لکھا ہی انگلش میں ہے تو پنجابی یا اردو میں کیسے پڑھ سکتا ہوں؟''

''اس کا ترجمہ کر؟''

''تمام پتہ تو آپ کو سمجھ آ گیا ہوگا۔ باقی الفاظ کا ترجمہ ہے کہ 'ہیرا منڈی'''

''ہوں، ں، ں۔'' وہ لمبی ہوں کر کے خاموش ہو گیا تو جانی کا تجسس بڑھ گیا۔

''کیا مطلب غفران بھائی؟''

''جانی بادشاہ!'' وہ جانی کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ ''اس شارق کو پکڑ کر یہاں تک لا سکتے ہو؟ میرا مطلب ہے کہ اس تہہ خانے میں؟''

''آپ کا مطلب ہے یعنی مطلب ہے کہ شارق ہی قاتل ہے؟''

''ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔'' وہ کافی سنجیدہ لگ رہا تھا۔ ''تم اسے یہاں لے کر آؤ۔ باقی اس سے سب کچھ اگلوانا میرا کام ہوگا۔''

''ٹھیک ہے غفران بھائی! کل وہ اس تہہ خانہ میں بند حا ہوا آپ کو مل جائے گا۔'' جانی نے کہا تو اس کی پریشانی کم ہوگئی۔ وہ پھر تنبیہہ کرنے والے لہجے میں بولا۔

''اس تمام معاملے کی بھنک عصمہ کو نہیں ملنی چاہیئے۔ کیونکہ تم نے اس سے ایمان کا پتہ معلوم کیا ہے اور اس کی نظر میں ہم کوئی اچھے کردار کے مالک نہیں ہیں۔'' جانی نے اس کی بات سن کر تائید میں سر ہلا دیا۔

''اب میں گھر جا رہا ہوں۔ پھر کل ملاقات ہوگی۔'' غفران نے کہا تو جانی کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''گھر میں جا رہا ہوں اور بتیسی تیری باہر نکل رہی ہے۔ کیا بات ہے؟ یہ مسٹنڈوں کی طرح کیوں ہنس رہے ہو؟''

''پہلے تو کبھی اتنی فکرمندی سے گھر نہیں گئے تھے۔ بس اسی لیے ہنس رہا ہوں کہ ماں جی کو اب تمہاری راہ نہیں دیکھنی پڑتی ہوگی۔''

''تمہارا جو بھی مطبل ہے۔ میں سمجھ گیا ہوں۔ حیاء کر حیاء۔ وہ تیری بہن ہے۔'' غفران کے دل کا چور باہر آ گیا تھا۔

''یہی بات میں آپ سے اگلوانا چاہتا تھا۔'' جانی نے کہا تو غفران اسے مارنے کے لیے دوڑا مگر پھر اس کے گلے لگ گیا اور کہنے لگا۔

''جانی بادشاہ! یہ عورت بھی اللہ تعالیٰ نے کیا چیز بنائی ہے یار؟'' وہ اسے اپنے سے الگ کر کے باہر کی جانب چل دیا۔ ''غفران کی عادتیں ہی بدل ڈالیں اس نے تو۔'' یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ جانی نے اس کے جانے کے بعد دروازے کو اندر سے تالا لگایا اور پُرسکون ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ حالانکہ ابھی رات گہری نہ ہوئی تھی۔ پھر بھی آج کی مشقت نے اسے کافی تھکا دیا تھا۔ وہ ڈاکٹر شارق کو قابو کرنے کا لائحہ عمل بناتا ہوا گہری نیند سو گیا تھا۔ یہ نیند بھی عجیب چیز ہے۔ اس نے آج ایک مقتولہ کو دیکھا تھا اور بہت قریب سے دیکھا تھا، لیکن ظالم نیند اُڑی نہ تھی۔

☆======☆======☆

بابا جی کی سالگرہ بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ شیخ عمر حیات کا پورا گھر بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ بہت سے مہمان ایسے بھی تھے جنہیں شیخ خود نہ جانتا تھا۔ وہ بابا جی نے مدعو کیے تھے۔ کسی کا تعارف مل اونر، اور کسی کا تعارف کامیاب بزنس مین کے طور پر کرایا گیا تھا۔ تمام مہمانوں کا تعلق کراچی شہر سے تھا۔ وہ بابا جی کے خاص مرید تھے۔ جو کراچی سے

خصوصی طور پر اس کی سالگرہ میں شامل ہونے کے لیے آئے تھے۔

تحائف سے شیخ صاحب کا گھر بھر گیا تھا۔ گاڑیوں کی لمبی لمبی قطاریں اور خصوصی طور پر وزراء کی آمد نے اس علاقے میں پولیس ہی پولیس اکٹھی کر دی تھی۔ نامور وزراء بھی بابا جی کو عقیدت و احترام سے نواز رہے تھے۔ کیونکہ شیخ عمر حیات نے اپنی کامیابی و کامرانی کا سہرا بابا جی کے سر باندھ دیا تھا۔ وہ ہر کام اور کامیابی کو بابا جی کا مرہون منت قرار دیتا تھا۔

ملیحہ اور عالیہ بیگم کے لباس بھی ہر خاص و عام کو دعوتِ نظارہ دے رہے تھے۔ جبکہ بابا جی کسی دولہے کی طرح خاموشی سے تمام منظر کا نظارا کر رہے تھے۔

احمد باؤ سٹیج پر آیا اور مائیک پکڑ کر حاضرین کی توجہ حاصل کی، تمام لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے تو وہ کچھ لمحہ کے لیے توقف کر کے بولا۔

''معززین محفل، آج ہم سب کا محبت بھرا اجتماع یقیناً بابا جی کا مرہون منت ہے اس لحاظ سے ہمارا گھرانہ بہت خوش قسمت ہے کہ ہمیں خاص اہمیت دے کر بابا جی نے اس گھر میں اپنی سالگرہ منانے کی خواہش ظاہر کی ہے اور ہم ان کے کرم سے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں، یہ آپ حضرات کی تالیاں بتائیں گی۔'' یک دم شیخ کی کوٹھی کا لان زوردار تالیوں سے گونج اٹھا۔

''آج ہم جس مقام پر کھڑے ہیں۔ وہ بابا جی کا خاص کرم ہے۔ اس سال ہماری فرم نے چار کروڑ روپے کا اضافی بزنس کیا ہے۔ جو کہ میں سمجھتا ہوں، ہم اکیلے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ یہ سبھی کرم بابا جی کے طفیل ہوا ہے۔'' احمد باؤ کی آواز پر ایک بار پھر بابا جی کی جے جے کار ہونے لگی۔

''اس دنیا میں یقیناً بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنا آپ تیاگ کر دوسروں کے کام آتے ہیں۔ میں بابا جی کا ممنون ہوں۔ بلکہ میرا تمام خاندان ہی ان کے قدموں کی خاک بننے پر فخر محسوس کرتا ہے۔'' ہال ایک بار پھر تالیوں سے گونج اٹھا تھا۔ جانی ہال میں موجود مہمانوں کی تصاویر بڑی احتیاط سے بنا رہا تھا۔

اس نے ابھی تک کسی کو بھی شبہ نہ ہونے دیا تھا کہ وہ بابا جی کے خلاف اپنی انکوائری شروع کر چکا ہے۔ اس ہجوم میں کسی کو بھی اپنا ہوش نہ تھا۔ وہ بڑے آرام سے وہاں سے نکل آیا۔ اب وہ ڈاکٹر شارق کے کلینک کو چیک کرنا چاہتا تھا۔ مگر اس وقت رات کے بارہ بجے تو چوکیدار اسے تالوں کو ہاتھ نہ لگانے دے گا۔ کوئی دوسری ترکیب استعمال کرنا ہوگی۔

کیوں نہ اس ڈاکٹر کے گھر بھی چلا جائے۔ کیونکہ وہ تو سالگرہ انجوائے کر رہا تھا اور

جانی کے لیے یہی سنہری موقع تھا۔ اس نے سوچا اور ڈاکٹر شارق کے گھر جانے کا پروگرام بنا لیا۔ آخر وہ ان کا پیر بھائی تھا۔ اسے آہستہ آہستہ اپنے تمام پیر بھائیوں کی رہائش گاہوں کا علم ہو گیا تھا۔ جبکہ اپنی باری پر وہ ہمیشہ ٹال مٹول کر جاتا تھا۔

وہ ڈاکٹر کے گھر کے پاس پہنچ چکا تھا۔ پانچ مرلہ پر ڈبل سٹوری بنے ہوئے مکان کے خوبصورت گیٹ کو لگا ہوا تالہ جانی کے لیے کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔ مکان کی دیواریں کافی بلند تھیں۔ بلکہ گیٹ اور اس کے ساتھ یقیناً ڈرائنگ روم کے دروازے کے علاوہ کوئی بھی راستہ نہ تھا جس سے وہ اندر جا سکتا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک مڑی ہوئی تار نکالی اور تالے پر قسمت آزمائی کرنا شروع کر دی۔ رات کی تاریکی نے اسے بہت فائدہ پہنچایا تھا۔ قسمت کی مہربان دیوی نے اس کا ساتھ دیا۔ وہ چپکے سے تالہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

اس نے داخل ہوتے ہی اندر سے گیٹ آہستگی سے بند کر دیا تھا۔ پورچ میں ایک موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ جبکہ ڈاکٹر شارق اپنی گاڑی لے کر پارٹی میں گیا ہوا تھا۔ وہ بلا جھجک اندر کمروں کی طرف بڑھے رہا تھا۔ اس کی نگاہیں ایک ہی جلتی ہوئی ٹیوب لائٹ میں ارد گرد کا بڑی تندہی سے جائزہ لے رہی تھیں۔ اسے یہ یقین تھا کہ وہ اس وقت ڈاکٹر کے گھر میں اکیلا ہی ہے۔ اس نے سامنے بنے ہوئے کمرے کے دروازے پر ہاتھ رکھ کر دبایا تو وہ کھلتا چلا گیا۔

وہ اندر داخل ہوا تو وہ ایک کشادہ اور بہترین ڈرائینگ روم میں تھا۔ اس میں اس کے لیے کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ وہ واپس پلٹا اور اوپر جانے والی سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ کمرے کا دروازہ لاک تھا۔ اس نے تار سے اپنا کمال دکھایا۔ دروازہ کھل گیا تھا۔ وہ اندر داخل ہوا تو ایک خوبصورت بیڈ روم میں اپنے آپ کو پایا۔ یہ یقیناً ڈاکٹر کا بیڈ روم ہو گا۔ وہ دیوار پر لگی ہوئی ڈاکٹر اور اس کی بیگم کی قد آدم تصویر نظر انداز کرتے ہوئے۔ ایک طرف بنی ہوئی الماریوں کی طرف بڑھ گیا جو کہ دیوار کے ساتھ بنائی گئی تھیں۔ اس نے جلدی سے ایک الماری کا پٹ کھولا تو اس میں سوائے کپڑوں کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ دوسرا پٹ کھولا تو اس میں تین دراز بنے ہوئے نظر آئے۔ اس نے باری باری تینوں کو کھولنے کی کوشش کی۔ دو دراز اسے لاکڈ ملے۔ تیسرے دراز میں ڈاکٹر کی ٹائیاں جرابیں اور پن وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔ زیرو واٹ کے بلب کی روشنی اس کمرے میں ناکافی تھی۔ مگر وہ لائٹ جلا کر کوئی بھی رسک لینے کے موڈ میں نہ تھا۔ اسے اسی دراز میں سے چابیاں مل گئیں جو یقیناً بند درازوں کی تھیں۔ اس نے دراز کھولا تو اس میں کسی مریض کے ایکسرے سی ٹی سکین کی رپورٹس اور دیگر بیماری کے متعلق رپورٹس موجود تھیں۔

دوسرے دراز کو کھولتے ہی وہ چونک پڑا۔ اس میں ایک ماؤزر، کچھ لفافے جن میں لازماً کوئی ضروری کاغذات تھے۔ جانی کو جو بھی کرنا تھا جلدی کرنا تھا کیونکہ اسے پارٹی چھوڑ کر آئے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی۔ اس نے ایک بڑے سے لفافے کو کھولا تو اس کی آنکھیں مزید کھل گئیں۔ اس میں تقریباً دس گیارہ بڑے سائز کی تصاویر تھیں۔ کوئی لڑکی اور بابا جی قابلِ اعتراض حالت میں ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے تھے۔ سبھی تصاویر میں مختلف پوز تھے۔ جو کہ ایک دوسرے سے بڑھ کر تھے۔ بابا جی اور لڑکی کپڑوں سے بے نیاز اپنے "کام" میں مصروف تھے۔ مگر تصاویر بنانے والے کا کمال تھا کہ ہر پوز بڑا واضح اور کلیر تھا۔ جانی نے جلدی سے وہ لفافہ اپنے قبضے میں لے لیا اور دوسرا لفافہ دیکھنے لگا۔

اس میں بھی کافی تصاویر تھیں۔ وہ ایسی تصاویر تھیں جنہیں دیکھ کر جانی ڈاکٹر شارق کا تمام منصوبہ سمجھ گیا تھا۔ ان دوسری تصاویر میں احمد باؤ، شیخ عمر حیات اور کئی نامور وزراء بھی تھے۔ جو شیخ کے بزنس پارٹنر تھے۔ وہ بھی کسی ریڈ لائٹ ایریا میں بنائی گئی تھیں۔ جانی نے وہ تمام تصاویر اور ماؤزر اپنے قبضے میں لیا اور تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا گیراج نما ڈیوڑھی میں آ گیا۔ اس نے آہستگی سے گیٹ کھولا اور باہر نکل گیا۔ تالا اس نے یونہی گیٹ کے کنڈوں میں پھنسا دیا تھا۔ کیونکہ بغیر چابی کے اب وہ تالہ دوبارہ لاک نہ ہو سکتا تھا۔ اس کی قسمت اس پر مہربان تھی کہ ابھی وہ ڈاکٹر کی گلی کراس کر کے سڑک کے دوسری طرف ہی گیا تھا کہ اس نے ڈاکٹر کی گاڑی آتی دیکھی۔ ڈاکٹر ڈرائیو کر رہا تھا۔ جبکہ اس کی بیوی اس کی برابر والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔

جانی کو اگر چند منٹوں کی بھی دیر ہو جاتی تو وہ یقینی طور پر پھنس گیا تھا اور اس بار بچنا بہت مشکل تھا۔ اس نے یہ سوچ کر اپنے چہرے پر پسینے کے قطرے محسوس کیے۔ وہ ایک بہت بڑا کام بخوبی انجام دے چکا تھا۔ اس نے ایک پُرسکون سانس لیا اور غفران کے گھر کی طرف چل پڑا۔ کیونکہ گزشتہ دو روز سے اس سے ملاقات نہ ہو سکی تھی اور پھر ڈاکٹر شارق کے گھر کی تمام کارروائی بھی اسے سنانا تھی۔ اس نے ماؤزر اپنی ڈب میں لگا لیا اور تصاویر کے دونوں لفافے اپنے سینے سے لگا کر شرٹ کے بٹن بند کیے اور رات کے تین بجے وہ ایسے ٹہلتا ہوا چل رہا تھا کہ وہ جیسے دوپہر کے وقت بازاروں کی رونق دیکھنے آیا ہو۔

☆======☆======☆

چودھویں کی رات تھی۔ چاند اپنے پورے جوبن پر تھا۔ چاندنی کی روشنی اور پیاری سی ٹھنڈک ہر سو پھیلی ہوئی تھی۔ چاندنی اپنی مستی میں مگن اٹھکیلیاں کرتی پھر رہی تھی۔ اس کی

اسمٰعیل علیہ السلام کے گلے پر چھری کا چلنا دیکھنا۔ غرض کہ کائنات کی اک اک حرکت کو میں نے حکم رب تعالیٰ جل شانہ سے دیکھا تھا اور اپنے حسن پر مان کرتا تھا۔

اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی جو انہوں بیت اللہ کی تعمیر کے وقت مانگی تھی کہ اے رب کائنات میرے اس بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل سے آخری نبی معبوث فرما۔ حق تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی اور پھر اس عظیم ہستی کا ظہور ہوا۔ کائنات کا ذرہ ذرہ ان کی خوشبو سے معطر ہو گیا تھا۔ پتہ پتہ، بوٹا بوٹا، ڈالی ڈالی، شجر شجر، دریا، پہاڑ، سمندر، سورج، تارے اور میں بھی خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔ رب کائنات نے اس نور کے ظہور کے لیے ایسا وقت چنا تھا جب ہر طرف جہالت اور فحاشی کا دور دورہ تھا۔ کفر اور شرک عام تھا۔ بیت اللہ کو بتوں سے سجایا جاتا تھا۔ آگ، پتھر، سورج اور بتوں کی پوجا کی جاتی تھی۔ وہ یتیم پیدا ہوا اور بڑا ہو کر محبّ الفقراؑ والغرباء والیتامیٰ والمساکین بن گیا۔''

یہ کہہ کر چاند خاموش ہوا تو نورانیوں کی بے چینی مزید بڑھ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتے چاند پھر بولا۔ وہ شاید الفاظ تلاش کر رہا تھا۔

''میرے محترم دوستو! جب میں نے اس بچے کو پہلی نظر دیکھا تو میں حیران رہ گیا تھا۔ اتنا نورانی چہرہ، پُر نور پیشانی، ختنے قدرتی طور پر ہوئے تھے ہر قسم کی نجاست اور پلیدگی سے پاک اس بچے کا ظہور ہی بتا رہا تھا کہ یہی خاتم النبین سید المرسلین اور رحمتہ للعلمین ہیں۔

وہ احمد مرسلین اکثر راتوں کو میرے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ ان کی نورانی صورت دیکھ کر میں خوش ہوتا تھا۔ میرا زعم میرا مان غرض کہ میرا وجود بھی سب کچھ ان کے تابع ہو گیا تھا۔ میں کچھ نہ رہا میں چاند تو تھا مگر آسمان پر، وہ جو زمین پر چمکنے دمکنے والا چاند تھا میری روشنی کو ماند کر رہا تھا۔ اس کی مثل کوئی نہ تھا۔

تم خود ہی بتاؤ میں کس طرح آپؐ کے حسن کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ میری اتنی جرأت اور ہمت نہ تھی کہ میں اس بات کو بھی اپنے من میں لاؤں۔ نورانی نورانی اور میٹھی میٹھی زبان سے نکلنے والے الفاظ اکثر یہ ہوتے تھے۔ ''اے میرے رب میری اُمت کی بخشش فرمانا۔''

میں رشک میں مبتلا ہونے لگتا کہ کاش میں چاند نہ ہوتا بلکہ اس نورانیت سے بھرپور نبی آخرالزمان ؐ کا ایک ادنیٰ سا اُمتی ہوتا۔ بلکہ ایک نبی نے تو اللہ تعالیٰ سے یہ تک کہہ دیا تھا کہ مجھے اپنے پیارے محبوب کا اُمتی بنا دو۔

اس ظالم دور کے ظالم لوگوں نے اس عظیم ترین بشر کو طرح طرح کی اذیتیں دیں۔ طرح طرح کی تکلیفیں دیں۔ یہاں تک کہ ان پر پتھر برسائے۔ ان پر گندگی پھینکی۔ مگر وہ

رحمتہ للعلمین ہر ظلم ہر جبر ہر زیادتی کو ہنس کر میٹھی سی مسکراہٹ سے ٹالتے رہے۔ مشرکین، منکرین اور کفار مکہ نے ان کی نبوت کو جھٹلانے کے لیے ان سے طرح طرح کے سوالات کرنا شروع کر دیئے۔ وہ ان کی کسی بات کا سختی اور ڈانٹ ڈپٹ سے جواب نہ دیتے تھے۔ بلکہ اپنی محبت اور پُر خلوص مسکراہٹ سے ان کی باتوں کے وہی جواب دیتے تھے جو رب کائنات ان کے دماغ میں ان کے ذہن میں ان کے دل میں بذریعہ وحی ڈالتا تھا۔ وہ اپنی طرف سے کچھ بھی نہ کہتے تھے۔ بس اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی فرماتے تھے۔

مشرکوں اور کافروں کو رب واحد پر یقین دلانے کے لیے انہوں نے بڑے سے بڑے مصائب کو بھی مسکرا کر جھیلا۔ ان کے لبوں پر کبھی بھی اپنے رب سے شکوہ کا کوئی لفظ نہ نکلا تھا۔ کفار مکہ ان سے معجزات کی فرمائش کرتے تھے۔ وہ کبھی کہتے کہ فلاں درخت کو اپنے پاس بلا کر دکھاؤ کبھی کہتے کہ سوکھے ہوئے درختوں پر کھجوریں اگا کر دکھاؤ۔ کبھی ان کی فرمائش ہوتی کہ کنویں تو خشک ہیں اگر تم نبی ہو تو ان میں سے پانی نکال کر دکھاؤ۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سب کچھ حکم ربی اور اللہ کی مرضی سے کر دیتے تھے۔ آپ کسی درخت کو اشارہ کرتے تو وہ دائیں بائیں ہلتا ہوا اپنی جڑوں سے زمین کو چیرتا ہوا سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں آ گرتا۔ جبکہ واپسی کا اشارہ پا کر واپس اپنی جگہ پر اسی حالت میں چلا جاتا۔ ایسے کہ جیسے کسی نے اس کی جڑوں کو چھیڑنا تو درکنار چھوا تک نہ ہو۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اگر خشک کنویں کے کنارے پر بیٹھ کر پانی کی کلی اپنے منہ مبارک سے اس کنویں میں ڈالتے وہ کنواں پانی سے لبالب بھر جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اس میں سے کبھی پانی ختم نہ ہوتا تھا۔'' یہ کہہ کر چاند خاموش ہو گیا۔ تمام نورانیوں کے وجود متورم ہو گئے تھے۔ گیلے پتھروں نے حسرت و یاس کی تصویر بنے ہوئے چاند کو دیکھا تو وہ مزید غمگین ہو گیا۔ وہ نورانیوں کے بولنے سے پہلے ہی بول پڑا۔

''اور پھر ایک دن ایسا معجزہ طلب کر لیا گیا کہ آج تک میں اس معجزے کو دوبارہ دہرانے کے لیے ہر روز سرکار مدینہ کے درِ اقدس پر حاضری دیتا ہوں۔ مگر اب قیامت تک میری فریاد فریاد ہی رہے گی۔ میری بے بسی اسی طرح مجھے غمگین اور اداس رکھے گی۔ میں بلک بلک کر فریاد کرتا ہوں۔ دوبارہ اسی اشارہ رحمت کا منتظر ہوں۔ مگر ناکام مایوس رہوں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ رب کائنات نے اپنے اس محبوبؐ پر عالم اسلام پر جو آخری کتاب معجزہ کی صورت میں اتاری تھی۔ اس میں صاف صاف اور واضح لکھ دیا ہے کہ تمام نبی کوئی نہ کوئی معجزہ لے کر آئے تھے۔ جبکہ محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات معطر و مطہر بذات خود

ایک معجزہ ہے۔ان پر نازل ہونے والی آخری الہامی کتاب ایک ایسا معجزہ ہے جسے قیامت تک کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔نہ کوئی ردوبدل کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کی چھوٹی سی آیت کے مقابلہ میں کوئی آیت لا سکتا ہے۔

معجزہ نبی کی واضح دلیل ہوتا ہے۔لہٰذا معجزہ کا منکر دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا گیا ہے۔ہوا یوں کہ عمرو بن ہشام المعروف ابوجہل اپنے دوست حبیب بن مالک الیمنی کو بلا کر لایا۔تاکہ وہ لوگوں کو اسلام سے روکنے میں اس کی مدد کرے۔۔جب وہ مکہ معظمہ میں آیا تو ابوجہل کی معیت میں حضور نبی کریم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔اس نے کہا کہ ہم آپ کو آگاہ کئے بغیر دو معجزات دیکھنا چاہتے ہیں۔

اگر تم اللہ کے نبی ہو اور سچے رسول ہو تو ہمیں دو ایسے معجزات دکھاؤ۔جن میں ایک آسمانی معجزہ ہو اور دوسرا زمینی معجزہ ہو۔میرے بھائیو۔اس حبیب بن مالک کی باتیں سن کر میری سوئی ہوئی قسمت جاگ اٹھی۔سرکار مدینہ سرور قلب وسینہ ان کو ساتھ لے کر ابو قبیس پہاڑ پر تشریف لے گئے۔اس لمحہ میں اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ آسمان کے سینے پر چمک دمک رہا تھا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نورانی انگلی سے مجھے اشارہ کیا اور اپنی انگلی پہاڑ کے دائیں اور بائیں گھمائی۔میں سرکار کے اشارے کو سمجھ کر دو ٹکڑے ہو کر۔دائیں اور بائیں سمت چل دیا جبکہ دوسری مرتبہ اشارہ پر میں دوبارہ اپنی حالت میں جڑ گیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حبیب کو فرمایا کہ تم نے آسمانی معجزہ تو دیکھ لیا ہے۔اب زمینی معجزہ بھی دیکھنا چاہتے ہو تو تمہاری بیٹی جو کہ اندھی اور گونگی ہے اپنے گھر جا کر دیکھ لو اسے شفا مل گئی ہے۔حبیب الیمنی تو ان معجزات کو دیکھ کر ایمان لے آیا۔جبکہ ابوجہل نامراد تھا وہ نامراد ہی رہا۔اس نے ان معجزات کو بھی جھٹلا دیا۔" یہ کہہ کر چاند غمگین ہو گیا۔

"تب سے لے کر آج تک ہزاروں سال گزر گئے ہیں میں دوبارہ اسی اشارہ رحمت کا طلبگار ہوں۔مگر اب ویسا کوئی نہ ہوگا جو مجھے اشارے سے شق کر سکے۔لہٰذا میں خوش نصیب نہیں ہوں۔بلکہ مجھ سے خوش نصیب آسمان ہے۔جس پر ایک زمینی بشر نے قدم مبارک رکھ کر اس کا مان بڑھایا ہے۔باقی تمام حقائق تمہیں آسمان بتا سکتا ہے۔اللہ حافظ۔" یہ کہہ کر چاند آگے بڑھ گیا اور نورانیوں کو مزید غمگین کر گیا پہلے سے گیلے پتھر مزید گیلے ہو گئے تھے۔

☆======☆======☆

سولہ مئی کی آمد آمد تھی۔شاہ جی کے والد صاحب کا عرس شریف آنے والا تھا۔دربار شریف کو سفیدی اور پینٹ ہونا شروع ہو گیا تھا۔حویلی میں بھی مٹی اور توڑی ملا کر لپائی وغیرہ شروع کر دی گئی تھی۔ماں جی ان تمام کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتی تھیں۔اب بھی وہ دربار پر شاہ جی اور اسمٰعیل کے ساتھ بڑے شاہ جی کی قبر مبارک پر کھڑی تھیں۔

"نذیراں!" شاہ جی گویا ہوئے تو ماں جی اور اسمٰعیل ہمہ تن گوش ہو گئے۔"اس برس بہت تیاری کرنا پڑے گی۔" ماں جی نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔مگر وہ نذیراں کی متعجب نظروں سے بے نیاز دور کہیں دیکھ رہے تھے۔ان کے چہرے پر ابھرنے والے تاثرات اسمٰعیل نے بھی بغور دیکھے تھے۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی شاہ جی!" ماں جی نے کہا تو شاہ جی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا انداز ایسا تھا کہ وہ جیسے اپنی کہی ہوئی بات بھول گئے ہوں۔پھر بڑے شاہ جی کی قبر کے ساتھ خالی جگہ پر اشارہ کر کے بولے۔

"مجھے یہیں لٹا دینا۔میں اپنے والد اور اپنے مرشد کے پہلو میں ہی سونا چاہتا ہوں۔"

ان کی اس بات کو اسمٰعیل اور نذیراں بخوبی سمجھ گئے تھے۔مگر دل کی تیز ہوتی ہوئی دھڑکنوں پر ناکام قابو پانے کی کوشش میں صرف سر ہلا کر رہ گئے۔کچھ دیر خاموشی رہی۔پھر ماں جی نے ہمت کر کے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"ابھی تو آپ کی بہت ضرورت ہے ہمیں۔آپ کے بغیر تو ہماری دنیا ہی اندھیر ہو جائے گی۔" یہ کہہ کر ماں جی رونے لگیں۔مگر شاہ جی مخصوص مسکراہٹ لبوں پر سجائے ہوئے بولے۔

"میں نے کب کہا ہے کہ میں کل ہی مر رہا ہوں؟"

ماں جی اور اسمٰعیل نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ان کے لبوں پر پرطمانیت بھری مسکراہٹ تھی۔

"شاہ جی!" ماں جی پھر بولیں۔ "میرے غفران کا کیا ہوگا؟"

"اللہ تعالیٰ ہمیشہ اچھا ہی کرتا ہے۔" وہ ماں جی کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

"تمہارے غفران کو اللہ تعالیٰ نے برکت اور نیک کاموں کے لیے چن لیا ہے۔ تم دیکھنا اس کا اندر اسے رب کریم کی چوکھٹ پر سجدہ کرنے کے لیے مجبور کرے گا، لیکن اس سے پہلے وہ ایک فریضہ سرانجام دینا چاہتا ہے۔ وہی اس کی آزمائش ہے۔ شکر کر نذیراں!" وہ کچھ توقف کے بعد پھر بولے۔

"اس وحدہٗ لاشریک نے تمہارے بیٹے کو ایسے کام کے لیے چنا ہے جس کا وہ حقدار تھا۔ حق تعالیٰ کے اسرار وہی بہتر جانتا ہے اور میں ابھی غفران کو اس راستے سے ہٹا کر فوراً ہی بدلنا نہیں چاہتا۔ اس طرح تو مشیتِ ایزدی میں دخل اندازی ہوگی اور میں گناہگار نہیں ہونا چاہتا ہاں! البتہ تم جلدی ہی دیکھنا اس کے اندر واضح تبدیلی محسوس کروگی۔"

ماں جی ان کی طرف دیکھتی ہوئی بولیں۔

"وہ ابھی تک تو شیطان عمر حیات کے ہتھے چڑھا ہوا ہے۔"

"نہیں!" شاہ جی مسکرانے لگے۔ "وہ اس کے ہتھے نہیں چڑھا ہوا۔ بلکہ اس کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ اب وہ اپنی تمام عمر کا حساب اس سے لے گا۔ اپنی محرومیوں اور گناہوں میں گزاری ہوئی زندگی کا ازالہ کر رہا ہے۔ وہ ان شاء اللہ اس میں کامیاب ہوگا اور تم دیکھنا اس جہنمی شیخ کا اللہ تعالیٰ کیا انجام کرے گا۔ وہ اس وحدہٗ لاشریک کو جھٹلا کر، اس کے محبوب ﷺ کی سنتوں کو ٹھکرا کر پھر آلِ رسول کا دامن جھٹک کر ایک ڈھونگی اور مشرک کے دامن سے بندھ گیا ہے۔ وہ ان گلیوں میں بھیک مانگتا پھرے گا۔ کوئی اس کا پرسان حال نہ ہوگا۔ جس طرح خس وخاشاک کا بنا ہوا ایک گھونسلہ تیز اور خونی آندھی سے بکھر جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک طوفان آئے گا۔ ایک بہت بڑی غلطی کا خمیازہ شیخ کو بھگتنا پڑے گا۔ وہ اس طوفان سے اپنے مضبوط محل اور اپنی فیکٹریوں کو بچا نہ سکے گا۔ کبھی نہ بھولنے والا حادثہ اس کی ذہنی رو بہکا دے گا۔ وہ اپنے آپ کو بھول کر گلی کے کتوں کے ساتھ بیٹھا کرے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ وہ انسان کی ہر غلطی ہر گناہ ہر تقصیر کو حقیر سمجھ کر معاف کر دے گا۔ مگر شرک کرنے والے مشرک کو کبھی بھی معاف نہیں کرے گا۔ دنیا و آخرت میں وہ ہمیشہ رسوا اور ذلیل ہوگا۔" شیخ کے بارے میں شاہ جی کی پیشین گوئیاں سن کر ماں جی اور اسمٰعیل لرز کر رہ گئے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ شاہ جی اللہ کی رضا اور اس کے حکم سے آئندہ آنے والے واقعات کے بارے میں بتانے کی طاقت رکھتے تھے۔ یہ ان کا کوئی کمال نہیں تھا۔ بلکہ اللہ کی

عطا اور خاص کرم تھا۔ کیونکہ قربِ الٰہی حاصل کرنے کے لیے انہوں نے راتوں کو اٹھ اٹھ کر گڑگڑا کر اپنے رب کو منانا شروع کیا تھا اور اللہ کی خاص کرم نوازی سے ان پر اسرارِ خداوندی آشکار ہو جاتے تھے۔ شاہ جی اسمٰعیل کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ نگاہیں جھکا کر ان کی بات سننے کے لیے انہماک سے ان کے قدموں کی طرف دیکھنے لگا۔ کیونکہ اسمٰعیل نے کبھی بھی نظریں اٹھا کر شاہ جی کا حکم نہ سنا تھا بلکہ حکم ہونے سے پہلے ہی اس کا سر احتراماً جھک جاتا تھا۔

"نذیراں تمہاری اصل حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے۔ اس لیے اس کے سامنے بات کرنے لگا ہوں۔" وہ اب نذیراں کی طرف مڑے اور بولے۔ "اسمٰعیل تمہارے بیٹے کا سایہ بن جائے گا۔ آج کے بعد وہ اس کی ہر طرح کی مدد کرے گا۔ کیونکہ میں جلد از جلد غفران کو رب کے حضور سجدہ ریز دیکھنا چاہتا ہوں۔ مگر یہ تمہارے گھر میں نہ آئے گا۔ اسے صبح نماز فجر کے بعد قرآن کریم کا ترجمہ سنایا کرو۔ اب اس کا ذہن تبدیل ہونے لگا ہے۔ وہ دنیا کی آسائشیں چھوڑ کر اللہ کا بندہ بننا چاہتا ہے۔" وہ خاموش ہو گئے۔ تو نذیراں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

غفران کی طرف سے ان کی فکرمندی ختم ہو گئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اسمٰعیل غفران کے پیچھے ہوگا اور اسمٰعیل کے پیچھے شاہ جی کی مہربان آنکھیں ہوں گی۔ شاہ جی وہاں سے اپنی حویلی کی جانب چل دیئے اور ماں جی اپنے گھر کی جانب۔ حویلی پہنچ کر شاہ جی اسمٰعیل سے مخاطب ہوئے۔

"تم غفران کے ساتھ نہیں رہوگے۔"

اسمٰعیل نے شاہ جی کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ وہ پوچھ نہ سکا کہ آپ نے تو نذیراں کے سامنے کچھ اور کہا تھا۔ شاہ جی اس کی دلی کیفیت بھانپتے ہوئے بولے۔

"دراصل غفران کو رب تعالیٰ نے جس کام کے لیے چنا ہے۔ اس میں کسی قسم کی کوئی امداد نہیں پہنچائی جاسکتی۔ اس کا امتحان سخت سوالوں پر مشتمل ہے۔ اس میں کسی بھی قسم کی نقل نہیں چلے گی۔ وہ اپنا کام خود کرے گا۔ اپنے طریقے سے۔ اللہ رب العزت جہاں چاہے گا کہ اسے مدد کی ضرورت ہے، وہ بڑی عظمت والا رب اپنی رحمت فرمائے گا۔ کیونکہ اس کی راہ میں مشرکوں کے خلاف اعلانِ جنگ کرنے والوں کو ہمیشہ تائید غیبی حاصل رہی ہے اور وہ کامیاب و کامران ہوئے ہیں۔"

شاہ جی خاموش ہوئے تو اسمٰعیل کی چند لمحے قبل بے قراری قرار اور سکون میں بدل گئی۔

''اسمٰعیل!'' شاہ جی پھر گویا ہوئے۔ ''آج طبیعت بہت اداس ہے۔ نعت کا وہ شعر تو سناؤ۔ جو تم کبوتر کی مثال دے کر پڑھتے ہوتے ہو۔''

اسمٰعیل بھی کافی عرصہ سے بے چین تھا کہ کوئی اس سے نعت شریف سنے۔ وہ اکثر تنہائی میں نعت شریف پڑھنے لگتا تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا جس عظیم اور پاکیزہ ہستی کی مدح سرائی کرتا ہے ان تک یہ کلام ضرور پہنچتا ہے۔ اس کی آواز میں سوز اور خواہشات کا غم جھلکنے لگتا تھا۔ کیونکہ نعت کے اشعار ہی کچھ ایسے تھے۔ وہ باادب ہو کر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ شعر کہنے سے پہلے ہی اس کا چہرہ غم اور حزن وملال کی تصویر بن گیا تھا۔

''بھول سکتا نہیں مجھ کو منظر پیارا مدینے کا
ہے نگاہوں میں بس وہی اک سہارا جینے کا

خوش بخت پرندے ہیں اڑتے ہیں ان فضاؤں میں
کاش میں بھی کبوتر ہوتا اک پیارا مدینے کا

اسمٰعیل کی آواز بھرا گئی تھی۔ جبکہ شاہ جی کہیں دور دیکھ رہے تھے۔ مگر ان کی تمام تر توجہ اس کی پُرسوز آواز پر لگی ہوئی تھی۔

خوشبوؤں سے معطر ہو یہ سیاہ بخت سینہ میرا
مل جائے اگر آقا ﷺ اِک قطرہ پسینے کا

☆======☆======☆

غفران کی زندگی میں بڑی واضح تبدیلی جانی اور ماں جی نے بھی محسوس کر لی تھی۔

جانی نے اسے تمام تصاویر کے متعلق بتا دیا تھا۔ مگر غفران نے اسے یہ کہہ کر واپس بھیج دیا کہ ان اشیاء کے بارے میں وہ اپنی متعلقہ جگہ پر بات کریں گے۔

عصمہ اور جانی ایک دوسرے پر جان چھڑک رہے تھے کیونکہ جانی کو محبت بھرا رشتہ مل گیا تھا۔ جبکہ عصمہ کو جانی کی صورت میں والدین اور بھائی کا پیار مل گیا تھا اور پھر شاہ جی نے بھی اس کی ضمانت دی تھی کہ جانی ایک پُر خلوص اور محبت کرنے والا بھائی بنے گا۔ شاہ جی کی محبت بھری شخصیت سے عصمہ بھی بہت متاثر تھی۔ وہ جلد از جلد شاہ جی سے باقاعدہ بیعت ہونا چاہتی تھی۔ اس بات کا اس نے ماں جی سے بھی ذکر کر دیا تھا اور ان کی خوشی دیدنی

تھی اور پھر وہ پُرنور لمحات بھی آ گئے۔ جب شاہ جی نے اسے بیعت کر کے اپنی مریدنی بنا لیا تھا۔ نماز، روزہ اور شریعتِ مطہرہ کی پابندی لازمی تھی۔

قرآنِ کریم تو اس کے سینے میں دل بن کر دھڑک رہا تھا۔ نماز کی وہ پابندی پہلے بھی کرتی تھی۔ غفران جب کبھی رات گھر میں گزارتا تھا تو عصمہ اسے نمازِ فجر کے لیے جگاتی تھی۔ اس کے جگانے پر غفران کو اپنی نیند ٹوٹنے پر بہت غصہ آتا تھا، لیکن جب وہ عصمہ کو دیکھتا تو اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا اور جب عصمہ نماز کے لیے جاءنماز پر کھڑی ہو جاتی تو وہ دوبارہ سو جاتا تھا۔

ابھی نمازِ فجر کے لیے مؤذن کی پُرسوز آواز محبت بھرے انداز میں تقریباً ہر گھر میں پہنچ رہی تھی۔ ''الصلوٰۃ خیر من النوم'' نماز نیند سے بہتر ہے۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی عصمہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ غفران بھی صحن میں سویا ہوا تھا۔ عصمہ نے فیصلہ کیا تھا کہ آج اسے نماز کے لیے جاء نماز پر لازمی کھڑا کرے گی۔ وہ کمرے سے اٹھ کر باہر نکلی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ کیونکہ غفران اس کے جگانے سے پہلے ہی جاگ چکا تھا اور مزید حیرت یہ تھی کہ وہ صحن میں پڑے ہوئے حمام سے وضو بھی کر رہا تھا۔ وہ الٹا سیدھا وضو کر رہا تھا۔ عصمہ اسے دیکھ رہی تھی اور خدا کا شکر ادا کر رہی تھی کہ یہاں تک تو پہنچا ہے۔ آگے بھی اللہ اسے ہدایت عطا کرے گا۔ ان شاء اللہ۔ وہ غفران کے سامنے آ کر اس کی محویت کو نہ توڑنا چاہتی تھی۔ اس نے چپکے سے ماں جی کو جگایا ان کے کان میں کچھ کہا تو وہ حیرت سے عصمہ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ایسے جیسے کہ انہیں اس کی دماغی کیفیت پر شک ہو۔ کیونکہ غفران کا مذہب سے دور کا بھی کبھی رابطہ نہ رہا تھا۔ وہ کبھی بھی ماں جی کے کہنے پر نہ جاگا تھا۔ اب یہ حیرت انگیز اور خوشگوار تبدیلی ماں جی کے لیے یقیناً بہت بڑی برکت اور سعادت تھی۔ کیونکہ روزِ محشر اولاد کی تعلیم و تربیت اور ان کی بہترین پرورش کے بارے میں سوال پر وہ رب کریم کو کیا منہ دکھاتیں۔ یہ سب تو اللہ ہی کا کرم تھا اور مرشد کی مہربانی بھی تھی۔ جنہوں نے فرمایا تھا کہ تم عنقریب غفران میں تبدیلی دیکھو گی۔

اور وہ سب سے بڑی تبدیلی یہی تھی کہ غفران ان کے بھی جاگنے سے پہلے جاگ چکا تھا بلکہ وضو بھی کر رہا تھا۔ ماں جی کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر عصمہ نے ان کے کندھے پر محبت سے تھپتھپاہٹ کی تو وہ اوپر آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔ جیسے کہ نہ نظر آنے والے رب کو سامنے دیکھ کر اس کا شکریہ ادا کر رہی ہو۔ بظاہر تو رب اپنا جلوہ کائنات کے ہر ذرے سے دکھاتا ہے مگر اس طرح اپنا روپ دکھانے پر انسان اس عظیم اور مہربان رب کو اپنے سامنے

دیکھنے کی آرزو کرنے لگتا ہے۔ یہی حال ماں جی کا تھا۔

اتنی دیر میں غفران کی بھی ان پر نگاہ پڑ گئی تھی۔ وہ شرمندہ سا ہوا۔ مگر ایک مضبوط قوتِ ارادی اور نیک نیتی سے اٹھا اور جاء نماز لے کر صحن میں بچھائی اور نماز پڑھنا شروع کر دی۔ مگر صرف ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جانے سے ہی نماز نہیں ہوتی۔ اس رب کی حمد و ثناء کے لیے جو الفاظ جو قابل تعریف مواد۔ جو محبت اور خلوص الفاظ میں بیان کی جاتی ہے۔ وہ الفاظ کہاں سے لائے۔ اسے کچھ بھی تو نہ آتا تھا۔ وہ اپنی اس بے بسی اور کم علمی پر پریشان ہو گیا۔ وہ سمجھ نہ پا رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

بس اسی سوچ پر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ماں جی اور عصمہ اس وقت بہت حیران ہوئیں۔ جب غفران نے رکوع کرنے کی بجائے سیدھا ہی سجدہ میں اپنا سر جھکا دیا۔ وہ اسے اسی حالت میں چھوڑ کر اپنی اپنی نماز پڑھنے کے لیے کمرے میں چلی گئیں۔ عصمہ نے سوچ لیا تھا کہ غفران کو ابھی بہت کچھ سکھانے کی ضرورت ہے۔

غفران سجدے میں پڑا ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا سجدہ تھا جو اس نے غفور و رحیم رب تعالیٰ کی بارگاہ میں ادا کیا تھا۔ اس سجدے نے اسے جہاں لذت و سرور سے آشنا کروایا تھا۔ وہاں اس کی کم علمی پر سوگ بھی منایا تھا۔ اس کا وجود ہولے ہولے ہل رہا تھا۔ وہ اپنے رب کی حمد و ثناء بیان کرنے سے قاصر تھا۔ مگر اس کی زبان کام نہ کر سکی تو اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کی زبان نے اس کے دل کی کیفیات کی ترجمانی کر دی تھی۔

وہ کتنی ہی دیر سجدے میں پڑا روتا رہا۔ وہ اس رحمت کے بے پایاں سمندر سے چند بوندیں لینا چاہتا تھا۔ جو الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ وہ معلوم نہ تھے۔ اسے معلوم نہ تھا کیا کہے گا تو گناہ ہو گا اور کیا کہے گا تو ثواب ہو گا۔ اس نے اپنے آنسوؤں سے دل کی باتیں رب کریم کی بارگاہ میں عرض کی تھیں۔

اس نے جانی سے سنا تھا کہ سجدہ صرف اور صرف اس وحدہٗ لاشریک کی ذات کو واجب ہے۔ اس سجدے میں حمد و ثنا بیان کرتے وقت کسی کو بھی شریک کرنا۔ گناہ کبیرہ بلکہ ناقابل معافی گناہ ہے۔ اس وقت انسان اپنا دل بارگاہ رب تعالیٰ جل شانہ میں جھکاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس لمحہ سجدہ کرنے والے کے ارادہ اور نیت کو جان لیتا ہے۔ پھر اس کا سجدہ اسی مناسبت سے قبول ہوتا ہے۔ جیسی سجدہ کرنے والے کی نیت ہوتی ہے۔ یہاں تو غفران نے اپنا دل اور آنکھیں بھی جھکا کر رب تعالیٰ کے حضور اپنے آپ ایک گندگی اور گنا ہوں میں

لتھڑے ہوئے انسان کی نسبت پیش کیا تھا۔ اسے اس کی سجدہ ریزی کی قبولیت کی سند اسی وقت رحمٰن و رحیم نے عطا کر دی تھی۔ ایک پُرخوشبو اور ٹھنڈی ہوا کا جھونکا غفران کے وجود کو معطر کر کے آگے گزر گیا۔ یہ خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی تو اس نے گھبرا کر سجدہ سے سر اٹھایا! اپنے دائیں بائیں حیرت و استعجاب سے دیکھنے لگا۔ مگر اسے کوئی بھی نظر نہ آیا تھا۔ کیونکہ وہ تو خوشبو تھی۔ جسے قید نہیں کیا جا سکتا۔ جسے پکڑا نہیں جا سکتا۔ جسے کسی بھی طرح سے پابندِ سلاسل نہیں کیا جا سکتا۔ بس محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس کائنات کے ہر جلوے میں ہر رنگ میں ہر ترنگ میں ہر امنگ میں ہر خار و سنگ میں، ذرے ذرے اور ذرے ذرے کے ہر ذرے میں وہ اپنا آپ دکھاتا ہے۔ بس دیکھنے والی آنکھ اور محسوس کرنے والا دل ہونا ضروری ہے اور غفران کے پاس ابھی نہ ہی آنکھ تھی اور نہ ہی محسوس کرنے والا روشن دل تھا۔

ابھی بہت کچھ کرنا تھا۔ بہت کچھ سیکھنا تھا۔ بہت سی کٹھن منازل طے کرنی تھیں۔ ابھی تو اسے میلوں پیدل چلنا تھا۔ منزل کا نام و نشان بھی معلوم نہ تھا۔ مگر رہبر و رہنما اور پاسبان پر اعتماد بحال ہو چکا تھا۔ وہ ابھی مرشد سرکار کی زیارت کرنا چاہتا تھا۔ وہ شاہ جی کا باقاعدہ مرید نہ تھا۔ مگر اس نے اپنی اطاعت اور فرمانبرداری سے کبھی بھی ان کو کسی شکایت کا موقع نہ دیا تھا۔ یہ اس کی سوچ تھی۔ وہ فوراً اٹھا اور جاء نماز تہہ کر کے چارپائی پر رکھی۔ اس نے نہ رکوع کیا تھا، نہ قعدہ، نہ تشہد پر بیٹھا تھا اور نہ ہی سلام پھیرا تھا بس اک سجدہ ہی کیا تھا اور اسی ایک سجدہ نے اس کی دنیا بدل دی تھی۔

ماں جی کے روکنے پر وہ رک گیا۔ وہ بیٹے کے قریب آئیں اور بغور اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ پہلی بار نذیراں نے اپنے بیٹے کو آنسوؤں کے پانی سے باوضو دیکھا تھا۔ انہیں اس کے چہرے پر عجیب سا تقدس ملا تھا۔ ان کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو اُمڈ آئے۔ وہ متورم آنکھوں سے غفران کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

''سجدہ دل کا ہوتا ہے۔ تم نے اپنا دل بارگاہِ الٰہی میں جھکا کر جو سجدہ کیا ہے۔ میں جانتی ہوں۔ وہ جو ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ یقیناً تمہاری نیت اور تمہارے دلی سجدے کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے گا۔'' وہ خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگیں تو عصمہ بھی قریب آ کر بول پڑی۔

''رب کریم کی اس محبت بھری دنیا میں داخل ہو کر زندگی کا کٹھن سفر طے کرنے کے لیے ایک پیر کامل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر تم بُرا نہ مانو تو مرشد کامل کے پاس جا کر شریعت

مطہرہ کے اصول سیکھو۔ جس پروردگار نے تمہیں اپنی بارگاہ میں جھکنے کی توفیق دی ہے، وہ تمہاری ضرور مدد کرے گا۔ ماں جی کی دعائیں اور میری وفائیں تمہارے ساتھ ساتھ ہوں گی۔'' اس نے پہلی بار غفران کو اپنی وفا کا یقین بے دھڑک ہو کر دلایا تھا۔ اس کی اس بات پر غفران حیران رہ گیا تھا۔ اس نے عصمہ کی طرف بڑی محبت سے دیکھا تھا۔ جس نے غفران کے اس انداز پر شرما کر نگاہیں جھکالی تھیں اور گالوں پر شرم وحیاء کی سرخی نے اسے مزید حسین وخوبصورت بنا دیا تھا۔ وہ غفران کی نظروں کی تمازت زیادہ دیر برداشت نہ کر سکی اور اندر کمرے کی طرف چلی گئی۔

ماں جی نے غفران کی پیشانی پر بوسہ دیا اور دعائیں دے کر بیٹے کو رخصت کیا۔

غفران مرشد کامل سید رشید حسین بخاری کے دستِ شفقت پر بیعت ہونے کے لیے گھر سے نکلا تو رب کریم کی رحمتوں نے اس پر اپنا سایہ کر دیا۔ وہ اتنی صبح صبح کبھی بھی نہ جاگا تھا۔ اسے صبح کا پُرنور اجالا عجیب مگر آنکھوں کو بھلا لگ رہا تھا۔

خاکروب اپنی ڈیوٹی پر پہنچ چکا تھا۔ وہ روزانہ گلی میں جھاڑو دیا کرتا تھا۔ اب بھی وہ اپنی ڈیوٹی پوری ایمانداری اور فرض شناسی سے انجام دے رہا تھا۔ وہ کونوں کھدروں میں دبکے ہوئے گند کوڑے اور کاغذات کو اپنے لمبے جھاڑو سے ایک جگہ اکٹھا کرتا جاتا تھا۔ وہ جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی ڈھیریوں کی شکل میں کوڑا کرکٹ وغیرہ اکٹھا کر دیتا تھا۔ پھر اس کے بعد ریڑھی والے جمعدار کی باری آتی۔ وہ تمام جگہوں سے دو لکڑیوں کی مدد سے کوڑا اٹھا اٹھا کر اپنی ریڑھی میں ڈالتا اور آگے چلا جاتا تھا۔

یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا۔ مگر غفران کو یہ کام بڑا عجیب لگا تھا۔ یک دم اس کی سوچ انتہائی بلندیوں پر پہنچ گئی۔ وہ ایک ایک ڈھیری کے پاس جاتا اور اسے کھنگالنے لگتا۔ کچھ پسند کی چیز نہ ملنے پر آگے بڑھ جاتا اور وہ کوڑا کرکٹ کی ڈھیریوں کو اس طرح کھنگالتا تھا کہ اس کی کوئی بہت ہی قیمتی چیز کھو گئی ہے۔ وہ مایوس ہو کر چل دیا۔ گلی کے کونے پر لگی ہوئی بڑی ڈھیری کے پاس سے گزرتے ہوئے اس کی نظر اس گوہرِ مقصود پر پڑ گئی جس کی اسے تلاش تھی۔

اس کوڑے کے ڈھیر کو آگ لگا دی گئی تھی۔ اس میں کاغذات اخبارات ورسائل اور دیگر گھاس پھوس کو آگ لگی ہوئی تھی۔ اللہ نے اسے عقل عطا کی۔ اس نے جلتی ہوئی آگ میں ہاتھ ڈال کر اس اخبار کو بلاخوف وخطر پکڑ لیا جس پر کلمہ طیبہ چھپا ہوا تھا۔ کلمہ کا پہلا حصہ ''لا الہ الا اللہ'' آگ میں جل چکا تھا۔ جبکہ دوسرے حصے کو ابھی آگ نے اپنی لپیٹ میں نہ لیا تھا کہ غفران نے اپنا ہاتھ جلتی ہوئی آگ میں ڈال کر وہ کاغذ پکڑ لیا اور جلدی سے

اپنی مٹھی میں دبوچ کر آگ بجھا دی۔ اس نے اخبار پر پرنٹ کیا ہوا کلمہ کا دوسرا حصہ ''محمد رسول اللہ'' بچا لیا تھا۔ اس کے ہاتھ پر جل جانے کے نشان پڑ گئے تھے۔ جن پر ہونے والی جلن نے اسے احساس دلایا کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔ کدھر جانے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں لپٹے ہوئے اخبار کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں نے ایک بار پھر ساون کی جھڑی لگا دی تھی۔ وہ پڑھا لکھا نہ تھا۔ مگر دل اور دماغ کا جو رشتہ کلمہ طیبہ سے جڑا ہوا تھا۔ اس نے اس لمحہ اسے تمام سیاق وسباق پڑھا دیے تھے وہ لفظ تو نہ جانتا تھا۔ مگر اس کے معنی اچھی طرح جانتا تھا کیونکہ جانی نے اسے بتایا تھا کہ صرف کلمہ طیبہ کا پہلا حصہ پڑھ لینے سے ہی انسان مسلمان نہیں ہو جاتا۔ بلکہ دوسرا حصہ بھی اسی طرح اہم ہے۔ جس طرح زندہ رہنے کے لیے زندگی سے بھرپور سانسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس عربی زبان کے فقرے سے ہر ان پڑھ مسلمان کی پہچان قدرتی طور پر اس کے ذہن میں محفوظ ہو چکی ہے۔ یہی حال غفران کا بھی تھا۔ وہ رو رہا تھا کہ اگر کچھ دیر پہلے پہنچ جاتا تو وہ پہلے حصے کو بھی جلنے سے بچا سکتا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی تو بجلی کے کھمبے کے ساتھ لگا ہوا ٹین کا ڈبہ لگا نظر آیا۔ جو پہلے ہی مقدس اوراق سے بھر بھر کر باہر ابل رہا تھا۔ اس نے انتہائی دکھ سے اس ڈبے کی طرف دیکھا اور اپنا ہاتھ بلند کر کے اس میں وہ کاغذ ڈال کر اسے اپنے ہاتھ سے نیچے دبانے لگا تاکہ کوئی بھی کاغذ باہر نہ گر سکے۔ سورج کی پہلی کرن نے اجالا بکھیرا تو غفران کو وقت کے گزرنے کا احساس ہوا۔ وہ جلدی سے شاہ جی کی حویلی کی طرف چل پڑا جو کہ اس کے گھر سے چند قدم کے فاصلے پر تو نہ تھی مگر دور بھی نہ تھی۔ بس تین چار گلیوں کو کراس کرنا پڑتا تھا۔

وہ ابھی حویلی کے دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا اور اندر سے حاجی عبداللہ نکل رہے تھے۔ انہوں نے غفران کو دیکھا تو غفران نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا۔ غفران نے انہیں سلام کرنے میں پہل کی تو حاجی عبداللہ نے حیرت بھرے انداز سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا بات ہے؟'' حاجی عبداللہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور بے قراری سے بولے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ غفران ان کے سیاسی مخالف شیخ عمر حیات کا دایاں بازو ہے۔ اس نے کبھی بھی حاجی عبداللہ کے ساتھ بدتمیزی نہ کی تھی۔ کیونکہ ماں جی ان کے گھر میں کھانا پکایا کرتی تھیں اور وہ اسی نسبت سے ان کی عزت کیا کرتا تھا۔

حاجی کو بھی غفران سے کوئی شکایت نہ تھی۔ بس گلہ تھا تو صرف اتنا کہ وہ اچھا آدمی تھا

اور غلط جگہ پر جا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ حاجی عبداللہ بھی شاہ جی کا مرید تھا۔ وہ بھی ان کی خدمت میں حاضری دینے آیا تھا اور غفران بھی ایک نیک اور خاص مقصد کے لیے آیا تھا۔ حاجی عبداللہ کی حیرت بجا تھی۔ کیونکہ اس نے اپنی زندگی کے معمول میں کبھی بھی غفران کو مرشد کے در پر اتنی صبح صبح نہ دیکھا تھا۔ جبھی تو وہ خاموش نہ رہ سکے۔

''آج سورج تو ہمیشہ کی طرح مشرق سے ہی نکلا ہے۔'' وہ اوپر دیکھنے لگے۔ ''مگر آج اس کی تپش کم کیوں معلوم ہوتی ہے؟'' ان کا اشارہ غفران کے جھکے ہوئے چہرے کی طرف تھا۔ انہوں نے غور سے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں جھلملانے والے آنسو دیکھ کر حاجی صاحب مزید حیران بلکہ پریشان ہو گئے۔ کیونکہ غفران نے بڑی آہستگی اور نرمی سے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ سے چھڑا لیا تھا۔ مگر کچھ نہ بولا تھا اور اندر کی طرف بڑھ گیا اس نے اندر داخل ہوتے ہی اپنے جوتے اتارنا شروع کر دیے۔ حالانکہ وہاں ایسی کوئی ممانعت نہ تھی۔ شاہ جی دیوار کے ساتھ صف بچھا کر اس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ غفران کے پیچھے ہی حاجی عبداللہ بھی دوبارہ حویلی میں داخل ہو گئے۔

غفران لرزتے وجود کے ساتھ چلتا ہوا صف تک پہنچا۔ شاہ جی اس کی دلی کیفیت جان گئے تھے اسمٰعیل بھی حیرانگی سے غفران کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ لرزتے پاؤں سے صف پر پہنچا اور شاہ جی کے سامنے دوزانو بیٹھ گیا۔ اس نے ہاتھ باندھ کر اپنے پیٹ پر رکھ لیے اور سر جھکا کر آنسو بہانے شروع کر دیے تھے۔ شاہ جی اس کی طرف مسلسل دیکھے جا رہے تھے۔

غفران کو سمجھ نہ آ رہی تھی کہ کیا کہے؟ اگر کہے تو کیسے بات شروع کرے؟ وہ تو بس تمام باتیں اپنے آنسوؤں سے کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں زبان بھی آنسوؤں کی استعمال کر رہی تھیں اور آنسو غفران کے دل کی ترجمانی کر رہے تھے۔ وہ مسلسل روئے جا رہا تھا۔ پھر اس کا بدن ہچکولے کھانے لگا۔ وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ اس کی ہچکی بندھ گئی تو شاہ جی نے آگے بڑھ کر اسے بیٹھے بیٹھے ہی اس کے جلے ہوئے ہاتھ سے پکڑ کر کھینچا اور اپنی گود میں اس کا منہ چھپا لیا۔

اب تو حاجی عبداللہ اور اسمٰعیل کی آنکھیں بھی متورم ہو گئی تھیں۔ حاجی سمجھ گیا تھا کہ غفران برائی کو چھوڑ کر نیکی کے راستے پر چلنا چاہتا ہے۔ اب وہ اپنے سابقہ گناہوں کے ازالے کے لیے مرشد کامل کے پاس آ کے دستِ حق پر بیعت ہونے کے لیے آیا ہے۔ حاجی عبداللہ نے اس بات کو سراہا اور غفران کے بدن پر تھپکی دینے لگے۔ پھر جب اس کا دل ہلکا ہو گیا تو شاہ جی نے پیار سے اس کی پشت پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا۔

غفران نے کتنی ہی دیر بعد اپنا سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سرخ ہو کر سوج گئی تھیں۔ مگر وہ دھل کر پاکیزہ ہو گئی تھیں۔

''میں تم سے یہاں آنے کا مقصد پوچھ کر تمہارے مقصد کو فوت نہیں کرنا چاہتا۔'' شاہ جی نے کہنا شروع کیا تو غفران کی نظریں مزید جھک گئیں۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اب اس کی گناہوں سے آلودہ زندگی کی فلم شروع ہونے والی ہے۔ اب وہ ننگا ہو جائے گا کیونکہ شاہ جی اس کا تمام کچا چٹھا کھول کر بیان کرنے والے ہیں۔ یہ اس کی سوچ تھی۔ وہ شرم سے مزید چھوئی موئی ہو گیا تھا۔

''صبح کا بھولا شام کو گھر واپس آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔'' شاہ جی کی آواز آئی۔ ''تم نے جو کرنا تھا کر لیا۔ اب جو ہم نے کرنا ہے۔ کریں گے تم اپنے گناہوں اور تقصیروں پر شرمندہ ہو کر آئے ہو۔ میں تم سے یک دم اس تبدیلی کی وجہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ یوں سمجھ لو کہ تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔ کیونکہ گناہوں کی دلدل سے باہر نکلنے کے لیے ایک مضبوط اور مدلل دلیل کے علاوہ ایک طاقتور سہارے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ کون سی چیز ہے جس نے تمہیں گناہوں سے بیزار کر دیا ہے۔ اپنی سابقہ زندگی کے بارے میں کچھ بھی بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ بچپن سے لے کر اب تک تم اور تمہارا تمام کام ہمارے سامنے ہے۔''

شاہ جی نے غفران سے کہا تو حاجی عبداللہ بھی سنبھل کر بیٹھ گیا اور اسمٰعیل بھی مؤدب ہو گیا تھا۔ غفران نے جھکی ہوئی نگاہوں سے ہی کہنا شروع کیا۔

''میں شاید کبھی بھی گناہوں اور مکر و فریب کی زندگی نہ چھوڑتا۔ مگر شاہ جی......''

وہ خاموش ہوا۔ تو شاہ جی نے اس کی ہمت بڑھائی۔ وہ حوصلہ پا کر پھر بولا۔

''آپ نے جس دن میرے گھر میں بیٹھ کر عصمہ کے بھائی خالد کے اندر سے عیسائی جن نکالا تھا۔ اس دن ایک نگاہ میں عصمہ میرے دل میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔ میں اس سے اپنے دل کی بات کبھی بھی نہ کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ انتہائی خوبصورت اور پڑھی لکھی تھی اور پھر حافظ قرآن بھی تھی۔ جبکہ اس کی نسبت میں اَن پڑھ، گنوار، جاہل، بدتمیز اور بدمعاش تھا۔ ان تمام باتوں کو وہ تو نہ جانتی تھی۔ مگر میں جانتا تھا کہ میں خود کو کبھی بھی اس کے قابل نہیں بنا سکتا۔ اگر میں اسے اچھا بن کر دکھانے کی خاطر نمازیں اور نیکیاں شروع کر دیتا تو وہ یقیناً ایک دکھاوا ہوتا اور گناہِ کبیرہ بھی کیونکہ میرا ضمیر نہیں مانتا تھا کہ میں اس کے لیے تو نماز نہ پڑھوں جس کی نماز ہے اور اس کے لیے پڑھوں جس کی نماز نہیں ہے۔ میں کبھی بھی رب تعالیٰ کے حضور سجدہ نہ کر سکا۔ مگر اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ عصمہ کو بھی دل سے نہ نکال سکا۔ ایک ہلکی سی

جوت میرے من میں جاگ گئی تھی۔ جسے محبت کہتے ہیں۔'' وہ کچھ توقف کر کے پھر بولا۔

''میں محبت اور عشق جیسے حساس اور نازک جذبوں سے نابلد اور گریزاں تھا۔ میں جس طرح اپنی زندگی ایک درندے کی طرح گزار رہا تھا۔ اس زندگی میں محبت جیسے عظیم اور پاکیزہ جذبے کو شامل نہیں کر سکتا تھا، لیکن میرے دن اور راتوں کا سکون اس ایک لمحہ نے ہی چھین لیا تھا۔ جب میری اور عصمہ کی نظریں ٹکرائی تھیں۔ میں کئی راتوں کو سو نہیں سکا۔ اللہ تعالیٰ نے میرے من میں اس جذبے کو جگایا تو دوسری طرف میرا دل گناہوں سے اچاٹ بھی رہنے لگا، لیکن اس زندگی میں آنے کے بہت سے راستے تھے۔ مگر باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ بس ایک ہی راستہ تھا۔ ''موت'' اور میں ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ بس میں نے سنا تھا کہ محبت اور عشق ایک ہی نظر میں ایک ہی لمحہ میں ہو جاتا ہے۔ میں اس بات کو کبھی بھی نہ مانتا تھا، لیکن اس لمحہ نے عملی طور پر میری زندگی میں دخل دیا تو دل پر لگے ہوئے کالے داغوں میں سے ایک داغ مٹتا گیا۔ اس جگہ پر محبت نے اپنا ڈیرہ جما لیا اور پھر رب کریم نے مجھے اپنی محبت کا عملی نمونہ بھی چند دن بعد ہی دکھا دیا۔ میں نے دیکھا کہ شیخ عمر حیات ایک نام نہاد پیر کو اپنا مرشد بنا کر گھر لایا ہے۔ اس نے اس کی تعظیم اور عقیدت میں شرک کی انتہا کر دی۔ وہ اس ڈھونگی کے قدموں میں سجدہ کی کیفیت میں گر گیا۔ مجھے یہ سب یک دم اتنا برا لگا کہ مجھے اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ بس! بس...... شاہ جی۔ یہ ایک بار پھر وہی لمحہ تھا۔ وہ گھڑی ایک بار پھر آ گئی تھی۔ جب انسان کو کچھ اچھا لگتا ہے اور کچھ بُرا لگتا ہے۔ اس لمحہ میں مجھے انسان کا انسان کو سجدہ کرنا بہت بُرا لگا۔ یہ میرا کوئی نیک عمل نہ تھا۔ بلکہ قدرت کی عطا تھی۔ اس پروردگار نے ایک بار پھر میرے دل میں محبت کی ہلکی سی جوت جگائی اور پھر ایک اور کالا داغ میرے دل سے ہٹ گیا۔ مگر اس بار اس داغ کی جگہ پر کسی انسان کی محبت نے جگہ نہ لی۔ بلکہ اس عظیم رب کی عظمت والی ذات نے اپنی جگہ بنائی۔ میں نے اپنے دوست جانی سے تمام بات بیان کی تو اس نے مجھے سجدہ پر طویل لچکر دیا۔ (لیکچر) لیکن اس نے یہ بھی کہا کہ رب العزت نے کلمہ طیبہ میں جو عظمتوں اور برکتوں والا نام اپنے نام کے ساتھ لگایا ہے۔ سجدہ تو اس کو بھی جائز نہیں ہے۔ سجدہ صرف اللہ تعالیٰ کی بے نیاز ذات کو ہی واجب ہے۔ میرا مطبل ہے کہ اگر اس عظیم انسان کو اتنا مرتبہ اور مان اور اعلیٰ درجہ رب العزت نے عطا کیا ہے۔ تو مجھے ان کے بارے میں بتایا جائے، لیکن جانی کے پاس وقت کم ہوتا ہے۔ وہ اس وقت بھی بہت مصروف ہوگا۔ میں بہت پریشان ہو گیا تھا۔ بس ذرا سی بات پر شیخ سے تلخ کلامی ہوئی اور میں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے جی۔ ہمارے درمیان معاہدہ طے ہوا کہ وہ

مجھے اور میں اسے کبھی بھی پرانے تعلقات کے حوالہ سے بلیک میل نہیں کریں گے، لیکن وہ بڑا خبیث الفطرت بندہ ہے جی۔ اس نے مجھے تھانہ میں پٹوایا۔ اس نے وعدہ خلافی کی پہل کی اور میں نے بھی اسے نقصان پہنچایا ہے۔ مگر مجھ سے یہ بات اب بھی برداشت نہیں ہوتی تھی کہ وہ جو ایک ڈھونگی بابا جی بن کر اس کو اور اس کی عزت کو نوچ کھسوٹ رہا ہے۔ میں اس کا اتا پتہ کرنا چاہتا ہوں۔ جانی یہ کام بخوبی کر رہا ہے۔ ہم عنقریب اس کی مکمل فلم دنیا کو پیش کر دیں گے۔ مگر پھر ایک رات میں نے خواب دیکھا۔'' پھر غفران نے شاہ جی کو تمام خواب سنایا۔ وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا تو اسمٰعیل نے اس کی طرف دودھ کا گلاس بڑھایا۔ غفران نے حیرانی سے وہ گلاس اس کے ہاتھوں سے لے لیا۔ کیونکہ اس کے تمام واقعات سنانے کے دوران اسمٰعیل کہیں بھی نہ گیا تھا۔ غفران نے گھونٹ گھونٹ کر کے دودھ پینا شروع کر دیا۔ دودھ نے اسے ایک نئی طاقت عطا کی تھی۔ وہ پھر بولا۔

''اس مسجد میں جو بزرگ ملے تھے۔ وہ بہت نورانی چہرے کے مالک تھے۔ میں نے ان سے ہاتھ ملایا تو انہوں نے کہا تھا کہ تمام معاملات اللہ پر چھوڑ دو۔ وہ بہتر عدل کرنے والا ہے۔ باقی باتیں تمہیں...... انہوں نے آپ کا نام لے کہا تھا کہ آپ مجھے بتائیں گے۔ میں مانتا ہوں کہ میں نے کبھی بھی زندگی میں رب تعالیٰ کو سجدہ نہیں کیا ہے، لیکن آج رب کریم کی بارگاہ میں سجدہ کرنا چاہا تو نہیں کر سکا کیونکہ مجھے علم ہی نہیں ہے کہ سجدہ کیسے کرتے ہیں؟ اس رحمتوں والے رب کو کیسے مناتے ہیں؟'' وہ پھر رونے لگا تھا۔ شاہ جی نے اس کا جلا ہوا ہاتھ پکڑا تو اس کی سسکاری نکل گئی۔ شاہ جی نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر اس کے جلے ہوئے ہاتھ پر پھونک ماری تو اس کو کافی سکون محسوس ہوا۔ شاہ جی نے بدستور اس کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ وہ بولے۔

''جس طرح تم نے اپنے رب کو منایا ہے۔ شاید ہی کوئی مناتا ہو؟''

''اچھا جی! وہ کیسے؟'' وہ حیرت و بے قراری سے بولا۔

''قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ''جس نے رسول کا حکم مانا اس نے یقیناً اللہ کا حکم مانا۔ وہ برکتوں والا رب جس رسول کو اتنی اہمیت دے کہ اس کا حکم اللہ کا حکم ہے۔ اس کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ اس کے نام کی تعظیم اللہ کے نام کی تعظیم ہے۔ وہ کوئی معمولی یا عام بشر کے بارے میں ایسا نہیں فرماتا بلکہ اپنے پیارے محبوب محمد مصطفٰی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ایسا فرماتا ہے اور اس رب کو راضی کرنے کے لیے پہلے اس کے محبوب کو راضی کرنا پڑتا ہے اور میرے خیال میں (انہوں نے غفران کا جلا ہوا ہاتھ پکڑتے

ہوئے کہا) تم نے اس کے محبوب کے نام کی عظمت وسربلندی کے لیے جلتی ہوئی آگ میں ہاتھ ڈال کر اس کے محبوب کے نام کو جلنے سے بچا کر رب العزت کو منالیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ بڑا غفور ورحیم ہے۔ تمہیں اپنے پیارے محبوب کے پیارے نام کی سربلندی کے صدقے سے معاف فرمائے گا۔'' شاہ جی خاموش ہوئے تو غفران ان کی طرف شادی مرگ کی کیفیت میں مبتلا دیکھ رہا تھا۔

وہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ کیسے رب تعالیٰ اتنی آسانی سے مان جاتا ہے؟

''تم نے اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کی ہے۔'' شاہ جی نے غفران کی حیرت دور کرتے ہوئے کہا۔'' قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، اور ہم نے تمہارے ذکر کو بلند کر دیا۔ اللہ تعالیٰ بڑا بے نیاز اور بے پرواہ ہے۔ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ ہر چیز اس کی رحمت سے مستفید ہوتی ہے۔'' شاہ جی کہہ رہے تھے اور حاجی عبداللہ، غفران، اسمٰعیل خاموشی سے سن رہے تھے۔

''اس کائنات کو محض تخلیق کرنا ہی اس عظمت وشان والے رب کا مقصد نہ تھا اور نہ ہی اسے انسانوں کی عبادت کی ضرورت تھی۔ کیونکہ اس کی عبادت کرنے کے لیے اَن گنت ملائکہ ہر لحہ موجود اور عبادت کی حالت میں رہتے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ انسان کی تخلیق کرنے لگا تو ملائکہ نے کہا یا باری تعالیٰ آپ ایسا انسان تخلیق کرنے لگے ہیں جو کائنات پر فتنے وفساد برپا کرے گا۔ جبکہ تیری عبادت کے لیے ہم موجود ہیں۔ یہ بات سن کر حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا کہ تم وہ بات نہیں جانتے جو میں جانتا اور دیکھتا ہوں۔ انسان کی تخلیق محض اپنی عبادت کے لیے نہیں کر رہا ہوں۔ بلکہ اسی مخلوق میں سے ایک ایسا عظیم انسان بھی پیدا کروں گا جو میرے تمام انبیاء میں سے آخری نبی ہوگا، لیکن اس کا درجہ تمام انبیاء کرام سے اعلیٰ وافضل ہو گا۔ جو میں کہوں گا۔ وہی اپنی امت کو فرمائے گا۔ جو بظاہر ﷺ بشری روپ میں دنیا میں ظہور پذیر ہوگا۔ مگر اس کے منہ میں میری زبان ہوگی۔ اس کی بات میری بات ہوگی۔ تم دیکھ رہے ہو کہ میں نے اپنے نام کے ساتھ اس کا نام ابھی سے لکھ لیا ہے۔ جو بھی اس نام کی عظمت و سربلندی کو گواہ بنا کر مجھ سے مدد مانگے گا۔ اس نام کو بطور وسیلہ بنا کر میری بارگاہ میں گناہوں سے تائب ہونے کی دعا کرے گا۔ اپنے گناہوں، غلطیوں اور تقصیروں پر اس نام کو وسیلہ بنا کر توبہ طلب کرے گا۔ میں اس کی توبہ قبول کروں گا۔ میں اس کے گناہ بخش دوں گا۔ اس کے بتائے ہوئے اصول اور سیدھے راستے درحقیقت میرے بنائے ہوئے ہوں گے۔ اس کی تقلید کرنے والوں کے لیے میں جنت کے تحائف دوں گا۔ جو میرے اس عظیم محبوب

کا نام بلند کرے گا۔ روزِ قیامت میرا محبوب اس شخص کی مغفرت وبخشش کے لیے اپنی سفارش پیش کرے گا۔ میں اس کی بات کبھی بھی نہ ٹالوں گا۔ اس عظیم انسان کی امامت میں تمام انبیائے کرام جو بظاہر دنیا سے بلالیے جائیں گے۔ وہ بھی مقتدی بن کر اس کے پیچھے نماز ادا کریں گے۔ اس ہستی پر دینِ اسلام مکمل ہوگا نبوت ختم ہوگی۔ ملائکہ وحورانِ جنت اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس پر درود وسلام پیش کرے گا۔ حتیٰ کہ میں خود بھی اس کی مدح سرائی کیا کروں گا اور تم تو بخوبی جانتے ہو کہ میرے لیے یہ تمام کام بہت آسان ہے۔ کیونکہ میں ''کن'' کہوں تو سب کچھ ہو جاتا ہے۔''

شاہ جی کچھ دیر کے لیے خاموش ہوئے تو ان تینوں کی طرف دیکھا۔ جو مبہوت ہو کر حیرت و بے قراری کی کیفیت میں شاہ جی کے منہ سے تخلیق کائنات اور باعث تخلیق کائنات کی باتیں سن رہے تھے۔ وہ کسی بھی قسم کی جرأت نہ رکھتے تھے کہ وہ کوئی سوال کریں۔ بس اس بات کے منتظر تھے کہ شاہ جی اس عظیم ذات محبوب کے متعلق مزید کچھ بتائیں۔ شاہ جی کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ وہ ایسے بول رہے تھے جیسے یہ تمام باتیں ان کے دل سے عشقِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں ادا ہو رہی ہیں۔

''اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو یہ عظمت بخشی کہ فرشتوں کو ان کے آگے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلیل اللہ بنایا اور ان کی جائے سکونت کو حج کا مرکز بنایا۔

حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو ذبیح اللہ کے لقب سے سرفراز کیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح اللہ کے خطاب سے نوازا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کلیم اللہ کہہ کر پکارا۔

اپنے محبوب حضور پُرنور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کریم میں کئی کئی محترم و مقدس ناموں سے پکارا، نوازا، مخاطب کیا، یہاں تک کہ ان کے ذکر کو اپنا ذکر قرار دیا۔ ان کے نام کو اپنا نام قرار دیا اور ان کی مدح سرائی کو دن رات اپنا شعار بنا کر ملائکہ اور تمام اہل ایمان سے فرمادیا کہ'' بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے درود بھیجتے ہیں ان نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اے ایمان والو آپ بھی ان پر درود اور خوب سلام بھیجو۔''

تقاضۂ محبت یہی ہے کہ محبوب کی ہر دم تعریف کی جائے۔ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے محبوب لاثانی ہیں۔ سید الانبیاء ہیں۔ حبیب کبریا ہیں۔ تاجدار عرب وعجم ہیں شفیع المذنبین ہیں۔ رحمتہ للعلمین ہیں۔ سراج منیر ہیں۔ ساقی کوثر ہیں۔ محب الفقراً

والغرباء والیتامیٰ ہیں اور اللہ تعالیٰ جل شانہ محبت ہے۔ یعنی حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے والا ہے۔

اس لیے جب اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق کر لی تو وہ تخلیق نور کی شکل میں تھی۔ تو اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے محبوب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنے لگا اور اپنے ملائکہ یعنی اپنی مخلوق کو بھی حکم دیا کہ تم بھی میرے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی خوب تعریف کرو۔ جس طرح میں کر رہا ہوں۔ اس حکم الٰہی کے تحت انسانوں کے لیے حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس۔ معطر ومطہر پر درود وسلام پڑھنا ضروری ٹھہرا ہے۔ اس کے علاوہ محسن کائنات کی ذات مقدس بنی نوع انسان کے لیے اور مخلوق خدا کے لیے اللہ رب العزت کا سب سے بڑا قیمتی ترین انعام ہے۔ کیونکہ فلاح، بھلائی۔ عظمت وعزت کا جو بھی راستہ انسان کو ملا ہے، وہ حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت اور وسیلہ سے ہی ملا ہے۔ جس ہستی رحمت کا نام اور ذکر اللہ تعالیٰ بلند کرے اور پھر اس کے محبوب کا ایک امتی جو کہ گناہگار اور پُرتقصیر ہو۔ جب اس کے محبوب کے نام کو جلنے سے بچالے تو اللہ رب العزت اس نام کی عظمت سے اس بندہ کے تمام گناہوں کو معاف کر کے اسے دین کی سوجھ بوجھ عطا کر دیتا ہے۔''

شاہ جی خاموش ہوئے تو ان کی ایمان افروز باتیں سن کر تینوں کی آنکھیں چھلک رہی تھیں۔ انہوں نے باری باری تینوں کی طرف دیکھا اور غفران سے کہنے لگے کہ وہ وضو کر کے آئے۔ غفران کو تذبذب کی کیفیت میں دیکھ کر شاہ جی سمجھ گئے کہ غفران اچھی طرح وضو نہیں کر سکتا انہوں نے اسمٰعیل کی طرف اشارہ کیا۔ تو وہ غفران کو لے کر صحن میں لگے ہوئے ہینڈ پمپ پر لے گیا۔ اسمٰعیل بتاتا جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ نلکا بھی چلاتا جا رہا تھا۔ جبکہ غفران اس کے بتانے پر وضو بھی کرتا جا رہا تھا اور روتا بھی جا رہا تھا۔

شاہ جی نے اس کے دائیں ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا اور اسے دوزانو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ غفران کے بیٹھ جانے پر شاہ جی نے اس کا بایاں ہاتھ اپنے باہر والے ہاتھ پر رکھ لیا اور کہنے لگے کہ میں جو کچھ پڑھتا جاؤں۔ تم بھی میرے پیچھے پیچھے کہتے جانا۔ غفران نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شاہ جی نے اسے چھ کلمے پڑھائے۔ ایمان کی صفات پڑھائیں۔ ارکان ایمان واسلام کے متعلق بتایا اور سمجھایا۔ غفران کو شاہ جی نے بیعت کر لیا تھا۔ اب وہ ان کا باقاعدہ مرید بن گیا تھا۔ حاجی عبداللہ اور اسمٰعیل نے اسے باری باری اپنے گلے سے لگایا تھا۔ بلکہ حاجی صاحب نے تو اسمٰعیل کو اپنی جیب سے دو سو روپے دیئے کہ جا کر مٹھائی خرید کر لاؤ۔ آج

ایک اور بھٹکا ہوا اپنے گھر کو جا رہا تھا۔ اللہ کی مدد اور نصرت سے غفران سیدھے راستے پر چل پڑا تھا۔ اب وہ حاجی عبداللہ کا پیر بھائی تھا۔ غفران کی نظریں جھکی ہوئیں تھیں۔ وہ اپنے آپ کو بالکل ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ یک دم اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کے دل ودماغ سے کوئی بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے۔ اس کے لبوں پر مخصوص مسکراہٹ تھی اور غفران کو خود محسوس ہوا تھا کہ وہ کتنے دنوں کے بعد دل سے مسکرایا تھا۔ اسمٰعیل مٹھائی لے کر خلاف توقع جلدی آگیا تھا۔

حاجی عبداللہ نے ڈبہ کھول کر شاہ جی کے آگے کر دیا۔ انہوں نے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھ کر ایک ٹکڑا اٹھا کر حاجی عبداللہ کو دے دیا اور پھر ایک ٹکڑا اسمٰعیل کو دے دیا اور آخر میں ایک امرتی غفران کو دے دی۔ انہوں نے وہ بسم اللہ پڑھ کر کھالیں۔ تو شاہ جی غفران سے مخاطب ہوئے۔

''اپنے تمام معاملات اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دو۔ مذہب کی طرف توجہ اور دلجمعی سے لگن لگاؤ، جس کام کا بیڑہ تم نے اور تمہارے دوسرے پیر بھائی نے اٹھایا ہے اس کو اسی کام پر لگا رہنے دو۔ اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا۔ تم بھی اس کا اخلاقی طور پر ساتھ دے سکتے ہو۔''

شاہ جی حاجی عبداللہ کے سامنے جانی کا نام نہ لینا چاہتے ہوں گے۔ جبھی تو انہوں نے غفران کے دوسرے پیر بھائی کا ذکر کیا تھا اور غفران سمجھ گیا تھا کہ شاہ جی کا اشارہ کس کام کی طرف تھا۔

''پانچوں وقت نماز پابندی سے ادا کرتے رہو۔'' شاہ جی پھر گویا ہوئے تو غفران نے اپنے ذہن کو جانی کی طرف سے ہٹا کر ان کی طرف دھیان دیا اور ان کی باتیں غور سے سننے لگا۔

''قرآن کریم جب پڑھا جا رہا ہو تو پُرسکون ہو کر سنتے رہو۔''

شاہ جی نے غفران کو مزید کئی نصیحتیں کیں۔ جنت ودوزخ کے متعلق سمجھایا۔ اللہ پاک کی واحدانیت اور عشق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بہت کچھ بتایا۔ وہ تمام باتوں کو بغور سن رہا تھا اور سمجھ بھی رہا تھا۔ دھوپ کافی چمک رہی تھی۔ حاجی عبداللہ نے اجازت طلب کی اور رخصت ہوتے وقت ایک بار پھر غفران کو گلے لگایا۔

اب شاہ جی نے غفران کو بھی اجازت دی اور کہا کہ اپنی ماں جی کو میری طرف سے مبارکباد دینا۔ غفران ان کے ہاتھوں پر بوسہ دے کر اسمٰعیل سے ہاتھ ملا کر الٹے قدموں واپس حویلی سے باہر آگیا۔ اس نے اپنا جوتا پہنا اور گھر کی طرف چل پڑا۔

وہ اللہ تعالیٰ کا ممنون تھا کہ اس برکت والے رب نے ایک گناہگار کو فقط ایک ہی لمحہ میں ایک ہی نظر میں گناہ آلودہ زندگی سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور دوسری طرف

ایک ہی نظر میں عصمہ کی نظروں سے محبت کا پیغام بھی سنا دیا تھا۔ محبت اور عشق نے اس کے دل میں جگہ بنانا شروع کر دی تھی۔ اب وہ بدمعاش اور غنڈہ نہ رہا تھا بلکہ محمد غفران بن گیا تھا۔ انہی سوچوں اور خیالات کی یلغار میں وہ گھر کی دہلیز تک پہنچ گیا تھا۔

اسے شدید حیرت کا جھٹکا لگا جب اس نے شیخ عمر حیات کی گاڑی اپنے دروازے کے سامنے کھڑی دیکھی۔ وہ اس گاڑی کو پہچانتا تھا۔ سینکڑوں مرتبہ اس میں سفر کیا تھا، لیکن ان کے دروازے پر اس گاڑی کا موجود ہونا یقیناً کوئی نہ کوئی بڑی گیم ہو سکتی ہے جو اس وقت شیخ نے کھیلنی شروع کی ہوگی۔ وہ ہر طرح کی پریشانی کا مقابلہ کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکا تھا۔

☆======☆======☆

عالیہ بیگم کو بابا جی کی ''خدمت'' کر کے جو خوشی اور سکون مل رہا تھا، وہ اس نشے اور مستی کی کیفیت میں سب کچھ بھول گئی تھی۔ حتیٰ کہ شیخ صاحب کو بھی بہت کم وقت دے پاتی تھی۔ بابا جی اس کے دل و دماغ پر مکمل طور پر حاوی ہو گئے تھے۔ گھر کے تمام افراد ہی اس کی جہالت اور گمراہی سے بھرپور باتوں کے قائل تھے۔ وہ ہر صبح اس کو سجدہ کر کے گھر سے نکلتے تھے۔ احمد باؤ اور شیخ عمر حیات کا مؤقف تھا کہ ہمیں ایسا کرنے سے روزی ملتی ہے اور جس دن ہم بابا جی کو سجدہ نہ کریں۔ ہمیں نقصان ہو جاتا ہے۔

ملیحہ بھی بابا جی کے علوم کا شکار بن گئی تھی۔ احمد باؤ تو ویسے ہی جہالت کی انتہا کر چکا تھا۔ وہ پڑھا لکھا ہونے کے باوجود بھی جاہل تھا اور شیخ عمر حیات ابوجہل تھا۔ تمام کا تمام گھرانہ ہی جہالت و شرک کی تصویر بن گیا تھا۔

بابا جی کچھ دنوں کے لیے کسی دوسرے مرید کے گھر کا کہہ کر گئے تھے۔ شیخ اپنی فیملی کے ساتھ ناشتے کی میز پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے باری باری تینوں کے چہروں کی طرف دیکھا تو احمد باؤ کے چہرے پر کچھ خاص ہی مردنی چھائی ہوئی ملی۔ وہ کافی دنوں بعد اکٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ بابا جی کی موجودگی میں تو ان کے پاس ایک دوسرے کا حال دریافت کرنا تو درکنار، شکل دیکھنے کا بھی وقت نہیں ہوتا تھا۔ اب جو مہینوں بعد اکٹھے ہوئے تو اسے عالیہ بیگم اور ملیحہ تو خاصی فریش دکھائی دیں۔ جبکہ غور کرنے پر احمد باؤ کا چہرہ مرجھایا ہوا لگا تھا۔

''احمد!'' شیخ عمر حیات نے اپنی پلیٹ میں سلائس اور فرائی انڈے لیتے ہوئے بیٹے کو مخاطب کیا۔ مگر بیٹے نے آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔

''کیا بات ہے۔ کوئی کاروباری پریشانی ہے؟''

''نہیں ڈیڈی!'' وہ اپنی پلیٹ میں رکھے ہوئے ٹھنڈے سلائس کے ساتھ چمچ اور

کانٹے سے کھیل رہا تھا۔ مگر کھا نہیں رہا تھا۔ اس کی نگاہیں بدستور جھکی ہوئی تھیں۔

''پھر کیا مسئلہ ہے؟'' شیخ نے دوبارہ پوچھا۔

''بابا جی کا بڑا کرم ہے ڈیڈ، ان کے ہوتے ہوئے کوئی مسئلہ نہیں ہو سکتا۔'' احمد باؤ نے اسی انداز میں جواب دیا جو کہ جہالت کی عکاسی کی انتہا تھی۔

''میں دیکھ رہا ہوں کہ کافی دنوں سے تم کچھ کمزور کمزور سے ہو رہے ہو۔ کیا کوئی عشق کا معاملہ ہے؟'' شیخ نے چوٹ کی تو سبھی ہنس پڑے۔ ملیحہ اور عالیہ بیگم نے بھی احمد باؤ کی طرف اچنبھے سے دیکھا۔

''میں عصمہ کے بغیر مر جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر احمد باؤ اپنی کرسی چھوڑ کر چلا گیا۔ مگر سب کے چلتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ وہ ہاتھ جو ابھی سلائس کا سینہ چیر رہے تھے۔ اب ایسے ہو گئے کہ جیسے بے جان اور مٹی کی کوئی مورت ہوں۔

شیخ عمر حیات اور عالیہ بیگم کا چہرہ لٹک گیا تھا۔ جبکہ ملیحہ بھائی کے ساتھ تھی۔ کیونکہ وہ دلی طور پر چاہتی تھی کہ احمد باؤ کا رشتہ عصمہ سے ہو جائے۔ پھر وہ بھائی کی مرضی سے غفران کے متعلق اپنی بات والدین سے منوا سکتی تھی۔

''کیا ہو گیا ہے اس لڑکے کو؟'' شیخ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے عالیہ بیگم سے بولا۔ ''ایک معمولی اور غریب گھرانے کی لڑکی کی خاطر وہ اپنا آپ تباہ کر رہا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ میں اس غریب اور لاوارث لڑکی کو اپنے گھر کی بہو بناؤں۔ جس کا نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ نہ کوئی سر نہ کوئی پیر اور تو اور وہ اس عورت کے گھر میں رہ رہی ہے جو ساری عمر ہمارے ٹکڑوں پر پلتی رہی ہے۔ ایک نوکرانی اور ایک ایسی عورت سے میں اس کا رشتہ مانگنے جاؤں جس نے بھرے بازار میں مجھے تھپڑ مار کر ذلیل و رسوا کر دیا تھا۔ ناممکن ہے ناممکن ہے عالیہ بیگم، ناممکن ہے۔'' شیخ کا پارہ یک دم اپنی تذلیل کے احساس سے چڑھ گیا تھا۔ ''میں تو غفران اور اس کی ماں کو ختم کرنے پر تلا ہوا ہوں اور یہ احمد باؤ کہتا ہے کہ میں ان کے در پر سوالی بن کر جاؤں۔ یہ کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔''

''عالیہ بیگم! اس بیوقوف لڑکے کو سمجھاؤ۔'' شیخ ایک بار پھر بیگم کی طرف مڑا۔ ''اسے زمانے کی اونچ نیچ کی سمجھ کب آئے گی؟ اسے کب پتہ چلے گا کہ کون سجن اور کون دشمن ہے؟ اس سے کہہ دینا کہ آئندہ اس لڑکی کے لیے کوئی بھی بات میں احمد کے منہ سے سننا نہیں چاہتا۔ ورنہ بہت برا ہوگا۔'' شیخ یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔ وہ اپنے خفیہ اڈے پر جانا چاہتا تھا۔ گاڑی نکال کر تیزی سے ڈرائیونگ کرتا ہوا جا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں غفران اور نذیراں کے

علاوہ اب عصمہ نے بھی گھر بنالیا تھا۔اس نے غفران کا خیال ذہن میں آتے ہی ایکسیلیٹر پر پاؤں دبا کر رفتار بڑھادی۔جیسے وہ غفران کو اپنے پاؤں تلے روندنا چاہتا ہو۔

اس کی حرکات اس کے ذہن کی عکاس تھیں۔وہ اب کسی بھی موقع پر غفران کو زبردست نقصان پہنچانا چاہتا تھا۔انہی خیالوں میں غلطاں وہ اپنے خفیہ اڈہ پر پہنچ گیا تھا۔ اس نے گاڑی مخصوص جگہ پر پارک کی اور اپنی منزل کی جانب چل پڑا۔

☆======☆======☆

عالیہ بیگم پریشانی کے عالم میں اِدھر اُدھر ٹہل رہی تھی۔وہ اس وقت ایک پرائیویٹ کلینک پر اپنی بیٹی ملیحہ کے ساتھ موجود تھی۔شیخ عمر حیات کے جانے کے بعد اچانک ملیحہ کی طبیعت خراب ہوگئی۔وہ قے پر قے کیے جارہی تھی۔بالآخر وہ نڈھال ہو کر گر پڑی۔عالیہ بیگم نے فون پر لیڈی ڈاکٹر سے رابطہ کیا تو اس نے بتایا کہ میں اس وقت بہت مصروف ہوں۔آپ اپنی بیٹی کو لے کر میرے کلینک پر پہنچ جائیں۔

عالیہ بیگم ملیحہ کی اس حالت پر بُری طرح پریشان تھی۔طرح طرح کے خیالات اور وسوسوں نے اسے گھیرا ہوا تھا۔یورین ٹیسٹ کی رپورٹ آگئی تھی۔ملیحہ اور عالیہ بیگم ڈاکٹر کی طرف دیکھ رہی تھیں جو کہ فون پر کسی مریض کو علاج کے متعلق بتارہی تھی۔ڈاکٹر نے فون رکھ کر اپنی کرسی گھمائی اور ملیحہ کی یورین ٹیسٹ رپورٹ کھول کر دیکھی تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔مگر اس کی مسکراہٹ نے دونوں ماں بیٹی کے دلوں پر چھریاں ضرور چلادی تھیں۔

''مبارک ہو مسز شیخ !! ملیحہ ماں بننے والی ہے۔'' ڈاکٹر کی آواز نے ان پر ایٹم بم گرادیا تھا۔وہ دونوں ساکت و جامد رہ گئیں۔کتنے ہی لمحے دونوں کے کانوں میں ڈاکٹر کی آواز گونجتی رہی۔''ملیحہ ماں بننے والی ہے......ملیحہ ماں بننے والی ہے۔''

''کیا کوئی پریشانی کی بات ہے۔آپ دونوں تو خاموش ہوگئی ہیں۔جبکہ یہ تو خوشی کی بات ہے کہ پہلا بچہ......''

''اپنی منحوس زبان بند رکھو ڈاکٹر۔'' عالیہ بیگم نے لیڈی ڈاکٹر کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کاٹ دی بلکہ اپنی کاٹ کھانے والی زبان سے اسے ڈانٹنا شروع کردیا۔ڈاکٹر حیرانگی سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔عالیہ بیگم کی آواز پھر گونجی۔

''اپنے الفاظ کو اور زبان کو یہیں بند کرلو ڈاکٹر۔شی!''......وہ ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے بولی۔''یہ بات کسی تیسرے فرد کو معلوم نہ ہو ورنہ تمہاری نسلیں بھی تمہارا نشان نہ ڈھونڈ

پائیں گی۔'' اس تمام معاملہ میں ملیحہ نظریں جھکائے ہوئے پریشان بیٹھی تھی۔عالیہ بیگم کے تحکمانہ رویہ پر ڈاکٹر کو بھی اپنی حیثیت کا احساس ہوا۔وہ عالیہ بیگم کی بکواس کافی دیر سے سن رہی تھی۔اس کی برداشت جواب دے گئی تو وہ عالیہ بیگم سے بولی۔

''حرام چھپانے کا اتنا ہی شوق ہے تو حرام کھانا چھوڑ دو مسز شیخ!'' اب وہ ملیحہ کی طرف مڑی۔''اپنی جوانی کا مزا اگر اپنے کسی یار کو چکھا ہی چکی ہو تو میرے پاس آنے سے پہلے اپنی اس عقل کی اندھی ماں اور غرور کی پڑیا کو گھر ہی چھوڑ کر آنا تھا۔''

''میں نے جو کہا ہے......'' اس سے پہلے کہ عالیہ بیگم کوئی مزید دھمکی دیتی۔ڈاکٹر بھی اپنی توہین کے احساس سے سرخ ہوگئی تھی۔اس کی بات کاٹ کر بولی۔

''اپنے الفاظ، اپنی دھمکیاں اپنی زبان کے ساتھ ہی بند رکھو تو بہتر ہے۔شاید تم نے میرے نام کا بورڈ نہیں پڑھا۔جس پر جلی حروف میں لکھا ہوا ہے۔لیڈی ڈاکٹر مسز وقار علی (ر) جنرل۔'' وہ خاموش ہوئی تو عالیہ بیگم کے چہرے پر سراسیمگی پھیل گئی۔اب وہ اپنی دولت اور طاقت کے نشے سے باہر آرہی تھی کہ ڈاکٹر کی آواز نے اس کا ذہن ایک بار پھر اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

''میں بے وقوف نہیں ہوں۔تمہارا درد سمجھ سکتی ہوں۔یہ بات یہیں ختم ہوگئی ہے۔اب اس گناہ کی گٹھڑی کو اٹھاؤ اور دفع ہوجاؤ یہاں سے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی کرسی گھما کر فون اٹھایا اور کسی سے بات کرنے میں مصروف ہوگئی۔

عالیہ بیگم اور ملیحہ اپنا منہ لے کر اس کے کلینک سے باہر آگئیں۔راستے بھر میں دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی تھی اور ویسے بھی وہ ڈرائیور کی موجودگی میں کوئی ایسی بات نہ کرنا چاہتی تھیں جو ان کی کمزوری بن جاتی۔

عالیہ بیگم نے گھر داخل ہوتے ہی ملیحہ کو ایک کمرے میں بند کردیا۔اس نے فون پر فوراً شیخ صاحب سے رابطہ کیا اور ایمرجنسی کی صورت میں گھر پہنچنے کا کہا۔

شیخ نے پُرتجسس لہجے میں پوچھا۔''کیا بابا جی واپس آگئے ہیں؟'' لیکن عالیہ بیگم کے انکار پر وہ طیش میں آگیا۔''ایک تو تمہارے لاڈلے نے پریشان کررکھا ہے اور دوسرے تم نے۔'' مگر عالیہ بیگم کے منہ سے یہ الفاظ سن کر کہ اب تمہاری لاڈلی بھی گل کھلارہی ہے، شیخ کی سٹی گم ہوگئی تھی۔وہ ہوا کے دوش پر اڑتا ہوا گھر پہنچا تھا۔اس لمحہ عالیہ بیگم نے ٹہل ٹہل کر اپنے آپ کو تھکا لیا تھا۔شیخ کو سامنے دیکھ کر اس نے اس کا بازو پکڑا اور اس کمرے کی طرف لے گئی۔جس میں ملیحہ کو بند کیا تھا۔

شیخ حیرت واستعجاب کی تصویر بنا عالیہ بیگم کے منہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کمرے میں بند ملیحہ کو دیکھ کر دہل کر رہ گیا تھا۔ ابھی تک کوئی بھی بات اس کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ جبکہ ملیحہ باپ کو سامنے دیکھ کر کانپ کر رہ گئی تھی۔ بے شک وہ ایک آزاد اور ایلیٹ فیملی سے تعلق رکھتی تھی، لیکن اس بات کو برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ ایک ناجائز بچے کی ماں بننے والی تھی اور وہ بخوبی جانتی تھی کہ اس ناجائز بچے کا باپ کون تھا؟

''عالیہ بیگم! یہ سب کیا ہے؟ اور اتنا تجسس کس معاملے پر برت رہی ہو؟'' شیخ کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا تھا۔

''پوچھو اس لاڈلی اور چہیتی بیٹی سے کہ اس کی کوکھ میں پلنے والا بچہ کس کا ہے؟''

عالیہ بیگم نے بغیر تمہید باندھے شیخ کے کانوں کے پردے کھول دیئے تھے۔ وہ گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کی شاید سمجھ میں نہ آیا تھا کہ بیگم صاحبہ نے کیا فرمایا ہے؟ وہ استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے وہ بات دوبارہ سننا چاہتا ہو۔

''ملیحہ ماں بننے والی ہے شیخ صاحب!'' عالیہ بیگم نے اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ انڈیلا تو اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔ وہ کبھی بیٹی کی طرف دیکھتا اور کبھی بیگم کی طرف اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کس سے کیا کہے؟ وہ کتنی ہی دیر گم صم کھڑا رہا اور پھر ایک ٹھنڈی آہ بھر کر بولا۔

''میں نے آج تک تم پر کبھی بھی کسی بھی قسم کا پریشر یا دباؤ نہیں ڈالا۔'' وہ ملیحہ سے براہِ راست مخاطب تھا۔ اس کی آنکھوں سے کرب جھلک رہا تھا، لیکن وہ معصوم و مظلوم نہ تھا۔ ''اس بچے کو ضائع کروا دیا جائے گا، لیکن صرف اس کا نام بتا دو۔ جس کے ساتھ تم نے اپنی جوانی برباد کی ہے۔''

''ڈیڈی!'' ملیحہ نے ڈرتے ہوئے انداز میں کچھ کہنا چاہا تو شیخ بھی اس سے نظریں نہ ملا سکا تھا۔ ''مجھے تھوڑا سا وقت چاہیے ڈیڈی۔''

''یہی ایک چیز تو میں تمہیں دے نہیں پایا۔'' شیخ کی بات میں بے بسی تھی۔ اپنی غفلت کا اعتراف یا پھر کچھ اور۔ ''اب بھی ایسا ہی ہے۔ الیکشن سر پر آ رہے ہیں۔ میں یہ الیکشن بابا جی کی رحمت سے ہر حال میں جیتنا چاہتا ہوں۔ لہٰذا وقت نہیں ہے میرے پاس جو کچھ بھی کہنا ہے ابھی اور اسی وقت کہو۔ بتاؤ کہ وہ کون ہے؟''

ملیحہ تذبذب کا شکار نظر آ رہی تھی۔ اگر وہ بابا جی کا نام لیتی تو کوئی بھی اس کی بات کا یقین نہ کرتا۔ بلکہ عالیہ بیگم اور عمر حیات تو شاید اس کا گلا ہی دبا دیتے اور پھر وہ بھی کون سا

اپنے حواس میں تھی۔ بابا جی کے ''دم'' نے اس کی عزت کو چیتھڑوں میں تبدیل کر کے اسے کلی سے پھول بنا دیا تھا۔ بلکہ پھول بنا کر اس کی ایک ایک پتی الگ الگ کر دی تھی۔ اس پھول کی خوشبو اتنی اچھی طرح سونگھ لی تھی کہ پھول ہی خوشبو سے خالی ہو گیا تھا۔

وہ دل ہی دل میں غفران کو پسند کرتی تھی۔ حالانکہ غفران اور اس کی عمر کا کافی فرق تھا، لیکن دل ان چیزوں کو کب مانتا ہے۔ وہ غفران کو حاصل نہ کر سکتی تھی، لیکن بابا جی کا نام بھی نہ لے سکتی تھی۔ جبکہ شیخ اور عالیہ بیگم غفران کے خلاف اور بابا جی کے حق میں تھے۔ وہ بابا جی پر لگنے والی فردِ جرم کو محض ایک گھٹیا مذاق سمجھتے اور ملیحہ کو قتل کر دیتے۔ وہ بابا جی کا نام نہیں لے گی۔ وہ غفران کا نام لے دے گی۔ وہ اسے حاصل تو نہیں کر سکتی تھی۔ اگر شیخ اسے قتل بھی کروا دے گا تو اسے کوئی دکھ نہ ہو گا۔ خود غرضی کی ذلیل ترین انتہا اور کیا ہو گی کہ اپنا نام اور مان مرتبہ بچانے کے لیے ملیحہ نے ایک بے گناہ کو پھانسنے کی ٹھان لی تھی۔ غفران کا کانٹا نکل جانے کے بعد وہ بابا جی کے ساتھ بات کر کے ہی انہیں خدمت کا موقع دیا کرے گی۔ ایک بار اسقاطِ حمل کروانے کے بعد وہ یقیناً مزید بے باکی سے بابا جی کی ''خدمت'' کر سکے گی۔

وہ اپنے باپ کے لمبے ہاتھوں کو اچھی طرح جانتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کئی نامور وزراء اور کئی نامی گرامی غنڈے ڈیڈی کی جیب میں پڑے رہتے ہیں اور پھر غفران کی والدہ نے بھی تو اس کے ڈیڈی کی سرِعام بے عزتی کی تھی۔ یہی موقع تھا کہ غفران کو اس بات کا بھی احساس دلایا جائے کہ اس نے ملیحہ کو ٹھکرا کر کتنا بڑا جرم کیا تھا۔

''میں تم سے بھیانک سے بھی بھیانک انتقام لوں گی غفران، تم دیکھنا مجھے ٹھکرانے اور جھٹلانے کا انجام!'' وہ اپنی محبت اور اپنی ذات کی نفی کو اس لمحہ برداشت نہ کر پا رہی تھی۔

غلط خیالات کی یلغار نے اسے لپیٹ لیا تھا۔ اب وہ باپ کو اپنے بچے کے باپ کا نام بتانے والی تھی۔

''بہت سوچ چکی ہو ملیحہ، اب میری برداشت کا امتحان مت لو۔'' شیخ عمر حیات کی کھردری آواز نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

وہ بڑی ہمت اور طاقت مجتمع کر کے بولی۔ ''غفران۔''

یہ نام اس کی زبان سے نکل کر شیخ اور عالیہ بیگم کے علاوہ اس کمرے کی دیواروں نے بھی سنا تھا۔ کمرے میں موجود دونوں افراد کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ جبکہ بتانے والی کے ہونٹ ذرا بھی نہ کپکپائے تھے۔ اس کا دل ذرا بھی نہ لرزہ تھا۔ اس کے ضمیر نے اسے ذرا بھی ملامت نہ کی تھی۔ وہ ضمیر فروش بن گئی تھی۔

جبکہ سننے والے غیرت مند بن کر اپنے ازلی دشمن کو ٹھکانے لگانے اور بدنام کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ ان کے دل، ان کے دماغ اور ان کی زبان ان کے ذہن کا ساتھ نہ دے رہے تھے۔ شیخ عمر حیات جانتا تھا کہ غفران اس کا راز دان رہا ہے۔ اس پر ہاتھ کسی خاص منصوبہ بندی سے ہی ڈالا جائے گا۔ وہ عالیہ بیگم کو لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

''تم اور ملیحہ ان کے گھر جاؤ اور کوشش کرنا کہ یہ بات صرف غفران اور اس کی عزت دار ماں کو ہی پتہ چلے۔ اگر طیش میں ہم نے شور مچایا تو بدنامی ہماری ہوگی۔'' شیخ نے عالیہ بیگم سے کہا تو وہ بے یقینی کی کیفیت میں شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔ جیسے اسے سمجھ نہ آ رہی ہو کہ شیخ صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔

''ملیحہ کو ساتھ لے کر ابھی جاؤ اور اس حرام زادی عورت کی عزت کی دھجیاں اس طرح بکھیرو کہ اپنے آپ میں ہی مر جائے۔'' یہ کہہ کر شیخ باہر نکل گیا۔ جبکہ عالیہ بیگم واپس کمرے کی طرف پلٹیں۔ وہ بیٹی کے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔

''تم نے اپنے باپ کو کس عجیب سی الجھن میں ڈال دیا ہے ملیحہ؟''

''مما!'' وہ ماں کی طرف سے مڑے بغیر کہنے لگی۔ ''میں آپ کے ساتھ غفران کے گھر جانے کو تیار ہوں۔ ابھی اور اسی وقت۔''

دونوں ماں بیٹی گاڑی میں سوار غفران کے گھر کی طرف چل پڑیں۔ ملیحہ خود ہی گاڑی چلا رہی تھی۔ اسے کسی بھی احتیاط کی ضرورت نہ تھی۔ وہ کون سا بچہ جنم دینا چاہتی تھی۔ وہ تو چاہتی تھی کہ حمل ضائع ہو جائے۔ بس غفران کو سخت سزا ملے۔ اس کی یہی تمنا تھی۔ کیونکہ غفران نے اس کی محبت کو ٹھکرا کر اس کی جو توہین کی تھی۔ وہ اس کا بھیانک ترین انتقام لینا چاہتی تھی اور اب وہ اپنے تمام منصوبے کو عملی جامہ پہنانے جا رہی تھی۔

گاڑی غفران کے دروازے کے سامنے روک کر دونوں ماں بیٹی نے حقارت سے اس کے کچے پکے مکان کی طرف دیکھا اور دروازے پر دستک دی تو دروازہ یک دم کھول دیا گیا۔ شاید دروازہ کھولنے والی کو کسی کا شدت سے انتظار ہوگا۔ مگر وہ سامنے ملیحہ اور عالیہ بیگم کو دیکھ کر حیران ہو گئی۔ کیونکہ عصمہ ان کے لیے اور وہ عصمہ کے لیے اجنبی نہ تھیں۔ عصمہ جانتی تھی کہ ایک احمد کی مما اور ایک اس کی بہن ہے۔ مگر اس طرح غفران کے دروازے پر ان کی موجودگی حیران کن بات تھی۔

جبکہ عالیہ بیگم اور ملیحہ کی بھی یہی کیفیت تھی۔ وہ عصمہ کو غفران کے گھر کی دہلیز کے اندر کھڑا دیکھ کر حیرت و استعجاب کی تصویر بن گئی تھیں۔ یہی وہ عصمہ تھی جس نے عالیہ بیگم

کے بیٹے کا سکون و قرار چھین لیا تھا۔ وہ اس کی یاد میں گھل گھل کر اپنے آپ کو مجنوں کی شکل میں ڈھال رہا تھا۔ اس دو ٹکے کی لڑکی کی خاطر احمد نے اپنا کیا حال بنا لیا تھا۔ عالیہ بیگم کو ایک دم تمام منظر بھولنے کے لیے اپنا سر جھٹکنا پڑا۔

''نذیراں ہے؟ میرا مطلب ہے نذیراں گھر پر ہے؟'' عالیہ بیگم کے پہلے فقرے کی شاید عصمہ کو سمجھ نہ آئی تھی۔ تبھی اسے وضاحت کرنی پڑی تو عصمہ نے اثبات میں سر ہلا کر انہیں اندر آنے کے لیے راستہ دے دیا اور دروازہ کھلا چھوڑ کر ان کے پیچھے پیچھے اندر چلی آئی۔

ماں جی اپنے بیٹے کی راہ دیکھ رہی تھیں۔ وہ بیعت ہونے کے لئے شاہ جی کی حویلی گیا ہوا تھا، لیکن بیٹے کی بجائے انہوں نے عالیہ بیگم اور ملیحہ کو دیکھا تو حیران رہ گئیں، لیکن اخلاق و آداب کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے انہوں نے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر ان کا استقبال کیا۔

انہوں نے عصمہ کو اندر کمرے سے کرسیاں لانے کا کہا تو عالیہ بیگم کا غرور بول پڑا۔

''میں تمہارے اس گندے گھر کی طرف تھوکنا بھی پسند نہیں کرتی اور تم بیٹھنے کی بات کرتی ہو۔'' ماں جی اور عصمہ اس اچانک تند و تیز فقرے سے گھبرا گئیں۔ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگیں۔ ماں جی نے آگے بڑھ کر کہا۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی بیگم صاحبہ؟''

''تمہاری اتنی اوقات ہی کہاں ہے کہ تم میری زبان سے نکلنے والی بات کو سمجھ سکو اور پھر تمہارا کون سا کسی اونچے خاندان سے تعلق ہے کہ تم مجھ جیسی امیر کبیر عورت کی بات سمجھ سکو۔'' عالیہ بیگم نے اپنے بے لگام غرور کو مزید زبان دے دی تھی۔

''بیگم صاحبہ! آپ میرے ہی گھر میں میری توہین کر رہی ہیں۔ آپ میرے گھر میں چل کر آئی ہیں۔ آپ کی عزت اور خاطر داری میرا فرض ہے اور میرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بھی۔ اگر میں خاموش ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میرے منہ میں زبان نہیں ہے۔ اس لیے کسی بھی بات کو کرنے سے پہلے اپنے مقابل کھڑی اس نذیراں کو کمزور مت سمجھنا۔'' ماں جی نے بھی اپنے لہجے کو قابو میں رکھنے کی کوشش کی تھی، لیکن عالیہ بیگم نے ان کی توہین کر دی تھی۔ غریب آدمی کے پاس صرف عزت ہی تو ہوتی ہے۔ جس کو بچانے اور اس کی سربلندی کی خاطر وہ زندگی گزار دیتا ہے۔

''بہتر یہی ہوگا کہ ہم انسانوں کی اس گندی جنگ میں خدا اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی بھی بات کو شامل نہ کریں۔ تمہارے منہ سے یہ باتیں زیب نہیں دیتیں نذیراں کہ

تم جیسی نے تمام عمر ہمارے ٹکڑوں پر گزاری۔ اب مجھ سے بدزبانی کرو۔'' عالیہ بیگم کا رخ اب عصمہ کی طرف مڑ گیا تھا۔ وہ بڑی حقارت سے ناک بھوں چڑھا کر بولی۔

''تو یہ ہے وہ کتیا! جس نے میرے بیٹے کا سکون برباد کیا ہوا ہے۔''

''عالیہ بیگم! بہتر یہی ہو گا کہ تم اپنی زبان کو لگام دو۔ ورنہ ایک غریب کی بدزبانی سارا عالم جانتا ہے۔'' ماں جی نے عصمہ کی توہین کا جواب دیا۔ جبکہ عصمہ اپنی بے عزتی کی وجہ سے روتی ہوئی اندر داخل ہوگئی۔ وہ کمرے میں جا کر اپنے آنسو چھپانے لگی۔

''تمہارا وہ گندا خون کہاں ہے جس نے میری عزت پر داغ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔''

''میرا بیٹا میرا غرور ہے، میرا فخر ہے، میرا سرمایہ ہے، میرے بڑھاپے کی لاٹھی ہے۔ عالیہ بیگم! اپنے آپ کو میری نظروں میں اتنا مت گراؤ کہ میں بھائی امیر علی کے تمام احسانات بھول جاؤں۔'' ماں جی غفران کی بھی بدخوئی کیسے برداشت کر سکتی تھی۔ آخر وہ ماں تھیں۔ عالیہ بیگم کا پارہ ایک دم چڑھ گیا تھا۔ وہ امیر علی کے نام پر بھڑک اٹھی تھی۔

''امیر علی کو اپنا بھائی کہتی ہو۔ شرم آنی چاہئے تمہیں نذیراں بیگم، شرم آنی چاہئے۔ جس بھائی کے دیئے ہوئے روپوں پیسوں پر آج تک زندہ چلی آ رہی ہو۔ اسی کی نسل کشی پر تل گئی ہو۔ اتنی نیچ اور گھٹیا ہو کہ اسی تھالی میں تھوک دیا ہے جس میں کبھی کھاتی رہی ہو۔'' عالیہ بیگم کے منہ سے کف بہہ رہی تھی۔ وہ غصہ کی انتہائی شدید حالت میں بول رہی تھی اس کے چہرے کا رنگ سرخ اور رگیں تن گئی تھیں۔

''جس بیٹے کو اپنا غرور اور تکبر کہہ رہی ہو۔ کاش، کاش کہ تم نے اسے انسانوں میں زندگی گزارنے کی اصول بھی بتائے ہوتے۔ اسے محسن کشی کی تعلیم نہ دی ہوتی۔ مجھے تو لگتا ہی نہیں کہ وہ تمہارا جائز بیٹا ہے۔ بلکہ جس امیر علی کو بھائی کہہ رہی ہو، وہی تمہارا خصم تھا۔''

عالیہ بیگم کے منہ سے نکلنے والی چنگاریاں ماں جی کے پاکیزہ وجود کو جگہ جگہ سے جھلسا گئی تھیں۔ وہ زمین میں دفن ہونے کو جگہ ڈھونڈ رہی تھیں، لیکن ابھی موت کا بلاوا مہربان بن کر نہ آیا تھا۔ ایک بہن بھائی کے مقدس اور عظیم رشتہ پر کیچڑ اچھالا گیا تھا۔ نہ ہی زمین پھٹی تھی اور نہ ہی آسمان گرا تھا اور نہ ہی ماں جی کو زمین نے اپنے اندر سمٹنے کی جگہ دی تھی، لیکن یک دم ایک زناٹے دار تھپڑ کی آواز نے ماں جی اور عصمہ کو نگاہیں اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ غفران آگ اور غصہ کی تیز تمازت چہرے پر لیے ہوئے عالیہ بیگم کے سامنے کھڑا تھا۔ جبکہ عالیہ بیگم کا ایک ہاتھ اپنے اس گال کو سہلا رہا تھا۔ جس پر غفران کے زوردار طمانچے

نے اس کے ہاتھ کی انگلیوں کے نشان چھوڑ دیے تھے۔

وہ اپنے غصہ کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور عالیہ بیگم اور ملیحہ سہم کر وہیں کھڑی رہ گئیں۔ ماں جی نے آگے بڑھ کر غفران کا بازو پکڑا اور اسے اندر کمرے کی طرف دھکیل دیا۔ اس کی سرخ اور انگارہ آنکھیں دیکھ کر ایک بار تو عصمہ بھی دہل کر رہ گئی۔

''میں نے کہا تھا نا عالیہ بیگم کہ میرا بیٹا میرا غرور ہے میرے غرور کو کبھی بھی مت للکارنا۔'' ماں جی نے آگے بڑھ کر عالیہ بیگم سے کہا۔

''عورتوں پر ہاتھ وہی اٹھاتے ہیں جو میدان جنگ میں جانے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں۔ تم نے میرے منہ پر تھپڑ مار کر اپنی مردانگی نہیں دکھائی بلکہ اپنی موت کو اپنے قریب کر لیا ہے۔'' عالیہ بیگم کا غرور ابھی بھی نہ ٹوٹا تھا۔

غفران کو ایک بار پھر اندر سے آتا ہوا دیکھ کر وہ مزید سہم گئی تھی۔ مگر اس کی دولت اور اس کی حیثیت اسے بات مکمل کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

''بولو عالیہ بیگم! میرے گھر میں کیا لینے آئی تھی؟'' غفران کے کہنے سے پہلے ماں جی بول پڑیں، لیکن عالیہ بیگم کے بولنے سے پہلے غفران بول پڑا۔

''کچھ بھی کہنے سے پہلے میری ماں سے معافی مانگو عالیہ بیگم۔''

''کس بات کی معافی۔ فرمانبردار بیٹا۔'' اس کی اس بات سے جھلکنے والا طنز غفران اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ وہ آگے بڑھنے لگا تھا۔ مگر ماں جی نے اس کا بازو پکڑ رکھا تھا۔

''اس بات کی معافی کہ تم نے ماں ہو کر ایک ماں کی توہین کی ہے۔ اس کی ذات پر اس کی عزت پر کیچڑ اچھالا ہے۔ اس بات کی معافی کہ تم نے اس عورت کی توہین کی ہے جو پاکباز اور تہجد گزار بھی ہے۔ اس بات کی معافی مانگو عالیہ بیگم! کہ تم نے اس مقدس رشتہ پر اپنی نیچ اور گھٹیا ذات کا جو زہر اگلا ہے۔ ایک بہن اور بھائی کے رشتہ کو اتنی گھٹیا سوچ سے ایک غلط رنگ میں جوڑا ہے۔ ان تمام باتوں کی معافی میرے کہنے کے بغیر ہی مانگ لو تو بہتر ہے۔ ورنہ تمہیں اپنی ماں کے ان قدموں کو چاٹنے پر مجبور کر دوں گا۔ جن کے نیچے آنے والی خاک کے برابر بھی نہیں ہو تم۔'' غفران اب پہلے جیسا غفران بن گیا تھا۔ ابھی وہ تازہ تازہ ہی بیعت ہو کر آیا تھا۔ سکھ اور چین کے لمحات اس کی زندگی سے رخصت ہو گئے تھے۔ وہ تو یہی سوچ رہا تھا۔ مگر تقدیر اپنی آزمائش پر خنداں تھی۔ وہ آل رسول کے دست حق پر بیعت کی شرف یابی حاصل ہونے کے بعد امتحانات کے کڑے سے کڑے سوالات لے کر طرح طرح کے نظارے لے کر آ گئی تھی اس کی آزمائش کے لیے۔

"تمہاری فرمانبرداری دیکھ کر دل خوش ہوا غفران میاں۔" عالیہ بیگم اب اینٹوں سے بنے ہو صحن کے فرش پر ٹہلنے لگی تھی۔ "مگر تم بہت بھولے ہو۔ تہجد گزار مائیں کبھی ایسے بیٹوں کو جنم نہیں دیتیں جو دوسروں کی عزتوں سے کھیلتے پھریں۔" وہ خاموش ہوئی تو عصمہ بھی کمرے سے باہر نکل آئی۔ جبکہ ماں جی بھی عالیہ بیگم کی بات سن کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھیں اور غفران استفسار سے بولا۔

"جو بھی بات کرنی ہے کھل کر کرو۔ میرے پاس ٹائم کم اور کام زیادہ ہوتے ہیں۔"

"میری اس بیٹی کو جانتے ہو؟"

"یہ کیسا سوال ہے؟" غفران ٹپٹا گیا۔ "بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"کتنی اچھی طرح؟" عالیہ بیگم کی اس بات کا غفران مطلب نہ سمجھ پایا تھا۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا؟"

"میری یہ بیٹی ابھی شادی شدہ نہیں ہے۔"

"کہنے کی بات نہیں ہے۔ مجھے علم ہے۔" غفران چڑ کر بولا۔

"کیا یہ بھی علم ہے کہ یہ کنواری ماں بننے والی ہے؟" عالیہ بیگم کی بات کو سن کر ماں جی کانوں کو ہاتھ لگانے لگیں۔ عصمہ دوبارہ اندر چلی گئی۔ غفران اپنی جگہ پر جم کر رہ گیا تھا۔ پھر بھی وہ ہمت کر کے بولا۔

"جو بھی کہنا ہے عالیہ بیگم جلدی کہو پہیلیاں مت بجھواؤ۔"

"تو پھر سنو! اس کے پیٹ میں پلنے والے گناہ کے ذمہ دار تم ہو غفران۔"

عالیہ بیگم کی آواز نے گھر کے تینوں مکینوں کو اپنی اپنی جگہ ساکت و جامد کر دیا تھا۔ عصمہ وہیں بیٹھ گئی۔ جبکہ ماں جی دیوار کا سہارا لے کر زمین پر ہی بیٹھ گئیں۔ غفران کی کھوپڑی گھوم کر رہ گئی تھی۔

ان تمام کی حالت کے برعکس عالیہ بیگم اور ملیحہ کے چہروں پر ندامت کی جھلک تک نہ تھی۔ ملیحہ تو ایسے تھی کہ جیسے وہ دلی طور پر خوش ہو۔ وہ اس وقت غفران اور ماں جی کی حالت سے لطف اندوز ہو رہی تھی، لیکن اس کا رنگ یک دم زرد ہو گیا۔ جب اس نے غفران کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا۔

اسے ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے چل کر اس کے قدموں پر گر جانا چاہئے تھا۔ مگر اس کی چال میں پہلے جیسا وقار، غرور اور دبدبہ تھا۔ وہ چلتا ہوا عالیہ بیگم کی طرف مڑا اور اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"عالیہ بیگم! تم نے شکار پھانسنے کے لیے ایک غلط آدمی کو چن لیا ہے۔ اس آدمی کو چن لیا ہے جو خود انہی دھندوں سے نکل کر نیکی کی طرف بڑھ رہا ہے۔" عالیہ کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ غفران وہیں کھڑے کھڑے الٹے پاؤں پر گھوما۔ اس نے ماں جی کی طرف دیکھا۔ جو ہوش وحواس سے بیگانہ ہو کر دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھلی آنکھوں سے تمام منظر دیکھ رہی تھیں۔

"مجھے فخر ہے کہ میں نے اس عظیم عورت کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ میں نے وہی لقمہ حرام کا اپنے منہ میں ڈالا ہے جو تمہارے گھر سے کھایا ہے۔ اس گھر میں کبھی بھی حرام نے پاؤں رکھنا تو دور کبھی جھانکنے کی بھی بات نہ سوچی ہو گی......"

"میں تمہاری تقریر سننے......" عالیہ بیگم نے غفران کی اور غفران نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی عالیہ بیگم! اس لیے اپنی گندی زبان بند رکھو۔" وہ سخت غصے میں تھا۔ عصمہ اس کا یہ انوکھا روپ دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اگر غفران نے واقعی ملیحہ کے ساتھ حرام کاری کی ہے تو وہ کبھی بھی غفران کو معاف نہیں کرے گی۔ بس محبت پر سے اس کا اعتماد ختم ہو جائے گا۔ اس کے آنسو بہہ کر اس کی گالوں پر آ گئے تھے۔ بے اختیار اس کے ہاتھ بارگاہِ باری تعالیٰ میں اٹھ گئے تھے۔

"میرے پاک پروردگار۔ میری محبت اور پاکیزہ سوچ کی لاج رکھنا!" وہ ابھی یہ دعا مانگ ہی رہی تھی کہ غفران کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"عالیہ بیگم! میں پانچ چھ سال کا تھا جب شیخ صاحب کے ساتھ ان کے کاروبار میں بطور ملازم ان کے ساتھ گیا تھا۔ زمانے کی اونچ نیچ اس شخص نے ہی مجھ کو سمجھائی تھی۔ تمہاری شادی اور پھر اولاد ہونے کے بعد تک تمام واقعات میری نظروں کے سامنے ہیں۔ تمہارے دونوں بچے میرے ساتھ کھیل کر تو نہیں، مگر میری نظروں کے سامنے جوان ضرور ہوئے ہیں۔ یہ بچی جس کی کوکھ میں پلنے والا گناہ تم میرے سر لاد رہی ہو۔ اسے میں نے کبھی بھی بُری نظر سے نہ دیکھا ہے۔ ہمیشہ مالک کی بیٹی سمجھا اور مالک کا نمک حلال رہنے کی کوشش کی ہے۔ اس بچی نے مجھے تو کچھ سمجھا نہ ہو۔ مگر میں نے ہمیشہ اسے اپنی چھوٹی بہن یا پھر بیٹی کی نظر سے دیکھا ہے۔" غفران یہ کہہ کر رونے لگ گیا۔ اب عالیہ بیگم اور ملیحہ کی باری تھی کہ وہ شدید جھٹکے سہتیں۔ عصمہ کی آنکھیں بھی خوشی سے مسکرانے لگیں۔ جبکہ ماں جی کے بظاہر مردہ وجود میں بھی حرکت ہوئی۔ وہ بھی ہنستی اور روتی آنکھوں سے بیٹے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

وہی بیٹا جوان کا غرور اور تکبر تھا اور آج اس کی بات نے ان کا مان برقرار رکھا تھا۔ وہ دوبارہ زندہ ہو گئی تھیں۔

''عالیہ بی بی! میں بہت گناہگار اور خطا کار ہوں۔ تم جانتی ہو کہ میں ایک غنڈہ، بدمعاش اور لوفر ہوں۔ مگر جو کچھ بھی ہو کوئی اتنا بد بخت اور ذلیل نہیں ہوتا کہ اپنی بیٹی اور بہن سے منہ کالا کرئے اور اس کے پیٹ میں گناہ کو پلنے کے لیے چھوڑ دے۔ اس سے پوچھو کہ یہ کس کا گناہ لے کر میرے دروازے پر آئی ہے۔ میں غریب ضرور ہوں، لیکن اس قدر مجبور اور بے بس نہیں ہوں کہ تمہاری گندی زبان سے نکلنے والی گندگی اپنے پاکیزہ وجود پر مل لوں۔'' وہ خاموش ہو کر ملیحہ کی طرف بڑھا۔ آسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا عالیہ بیگم کے سامنے لے آیا۔ وہ درد کی شدت سے کراہ کر رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ سانس لے کر ایک بار پھر غرایا۔

''اپنی اس حرامزادی بیٹی سے پوچھو بیگم صاحبہ کہ اگر یہ تمہیں اپنی ماں سمجھتی ہے تو کھائے تمہارے سر کی قسم کہ اس کے پیٹ میں پلنے والے گناہ کا ذمہ دار میں ہوں، لیکن نہیں ٹھہرو......'' وہ یہ کہہ کر اندر کی طرف گیا۔ سبھی حیران تھے کہ وہ اب کیا کرنے والا ہے، لیکن ماں جی عصمہ اور وہ دونوں ماں بیٹی حیران رہ گئیں۔ جب غفران اندر سے قرآنِ کریم کو چومتا ہوا صحن میں برآمد ہوا۔

ملیحہ سرتا پاؤں لرز گئی تھی۔ وہ کتنی بھی آزاد خیال تھی مگر قرآن کریم کی اہمیت اور اس کے فیصلوں کو سمجھتی تھی۔ جانتی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ غفران اس کے ہاتھوں سے نکل گیا ہے۔ وہ ماں کے سر کی قسم کھا سکتی تھی، لیکن قرآن کی قسم نہیں کھا سکتی تھی۔ کچھ بھی ہو جائے وہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر کبھی بھی جھوٹی قسم نہیں کھائے گی۔

''عالیہ بیگم! مجھے تمہاری ذاتی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، لیکن کسی کو میری زندگی اور میری پاکیزگی سے دلچسپی اور ذاتی لگاؤ ضرور ہے۔'' وہ کچھ توقف کر کے بولا۔ اسی لمحہ عصمہ نے محسوس کر لیا تھا کہ اس نے یہ الفاظ خالصتاً اس کے لیے کہے ہیں۔

''میں نے ابھی زندگی کا بہت طویل سفر ایک محبت کرنے والے ہمسفر کی صحبت میں طے کرنا ہے، لیکن اگر ابھی سے غلط فہمیاں اور نفرتیں پھیلا کر تم چلی جاؤ گی تو میری زندگی کٹھن ہو جائے گی اور میں ایک بار پھر غفران بدمعاش نہیں بننا چاہتا۔ میں باقی ماندہ زندگی محبتیں اور خلوص بانٹتے ہوئے گزارنا چاہتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہاری بیٹی تمہارے سر کی بھی قسم کھا لے گی اور اگر تم اس مقدس اور عظیم کتاب کی اہمیت اور سمجھ سے واقف ہو تو بولو اپنی

اس بیٹی سے کہ اس مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائے کہ میں اس گناہ کا گناہگار رہوں۔ خدا رسولؐ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر تمہاری بیٹی کہہ دے میں مان جاؤں گا۔ کیونکہ مسلمان ہونے کے ناطے میں اس مقدس اور بابرکت کتاب کی زیر و زبر شد و مد پر یقین رکھتا ہوں۔''

غفران نے بہت بڑا فیصلہ کر لیا تھا، ملیحہ اور اس کی شاطر ماں کچھ بھی کر سکتی تھی۔ عصمہ اور ماں جی کی سانس بھی اٹکی ہوئی تھی۔ انہیں پہلے بھی یقین تھا کہ غفران بے گناہ ہے اور اب تو قرآنِ کریم کی موجودگی نے اس کی بے گناہی واضح کر دی تھی۔ کیونکہ اگر وہ گناہگار ہوتا تو اندر سے قرآن کریم خود نہ اٹھا کر لاتا۔ ماں جی کا سینہ فخر سے پھول گیا تھا۔ جبکہ عصمہ کے ہونٹوں پر بھی شکرانے کا تبسم بکھر گیا تھا۔ اس کی آنکھوں نے غفران کو سو سو بار چوما تھا۔

''آؤ ملیحہ بی بی! اس قرآنِ مقدس پر ہاتھ رکھو۔ صرف ایک بار کہو کہ میں اس ناجائز بچے کا باپ ہوں۔'' غفران قرآنِ کریم لے کر آگے بڑھا تو عالیہ بیگم نے بیٹی کی بدلتی ہوئی رنگت دیکھ کر جھوٹ سچ کا اندازہ لگا لیا۔ وہ ایک زمانہ شناس عورت تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کی بیٹی غلط اور غفران صحیح ہے۔

ملیحہ غفران کو آگے بڑھتا دیکھ کر رونے لگی۔ وہ اپنے ہاتھ ایسے ہلانے لگی جیسے غفران کو کہہ رہی ہو کہ اس عظیم و بابرکت کتاب کو میرے پاس لے کر مت آؤ۔ غفران اس کی حالت دیکھ کر سمجھ گیا۔ وہ اپنی جگہ پر رک گیا تھا۔ ماں جی اور عصمہ بھی اس کے پیچھے آ کھڑی ہوئی تھیں۔ ملیحہ روتی ہوئی بولی۔

''میں بہت گناہگار ہوں۔ اس مقدس کتاب کو چھونے کی ہمت نہیں کر سکتی اور اس کتاب کی جھوٹی قسم بھی نہیں کھا سکتی۔ ہاں البتہ سچی قسم کھا سکتی ہوں کہ غفران بے گناہ ہے۔ اس مقدس کتاب کی طرح بالکل اسی طرح جس طرح میں نے اس کتاب کو چھوا نہیں ہے، لیکن اس کی بے گناہی کی قسم کھا کر کہہ رہی ہوں۔ اسی طرح آج تک غفران نے مجھے کبھی چھوا نہیں ہے۔ بلکہ آنکھ اٹھا کر دیکھا بھی نہیں ہے۔'' وہ رو رہی تھی۔ عالیہ بیگم شرم سے پانی پانی ہوتی جا رہی تھی۔

''مجھے معاف کر دینا غفران۔ میں تمہاری مجرم ہوں۔ مجھے معاف کر دینا۔'' وہ روتی ہوئی باہر کی طرف بھاگ گئی۔ عالیہ بیگم بھی اس کے پیچھے جانے کے لیے مڑی تو ماں جی کی آواز پر رک گئی۔ ماں جی کہہ رہی تھی۔

''بیگم صاحبہ! حلال اور حرام میں یہی فرق ہوتا ہے۔'' وہ گھوم کر عالیہ کے سامنے

آئیں۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ میرا بیٹا میرا غرور ہے اور آج جا کر سارے زمانے کو بتا دینا کہ غرور کا سر نیچا نہیں۔ کم از کم آج کے دن کے لیے اور صرف تمہارے خاندان کے لیے غرور کا سر اونچا ہو گیا ہے۔ اپنی چوکھٹ بدلو۔ عالیہ بیگم انسان کو نہیں بلکہ اس خدا کو مانو جس نے انسان بنایا ہے۔ آج کے بعد عمر حیات سے کہہ دینا کہ میرے بیٹے کو اس کی طرف سے کوئی بھی تکلیف نہ پہنچے۔ ورنہ خدا کی قسم، اس ماں کی بددعا سے وہ سڑکوں پر بھیک مانگتا ہوا نظر آئے گا۔'' عالیہ بیگم آنکھوں اور چہرے پر ندامت سجائے ان کی دہلیز پار کر گئی تھی۔ گاڑی سٹارٹ ہو کر جا چکی تو ماں جی نے فخر سے غفران کی پیشانی پر بوسہ دیا عصمہ نے بھی متورم آنکھوں سے دو آنسو بہا کر اس کی عظمت و پاکیزگی کو نذرانہ پیش کر دیا اور غفران نے بے اختیار ہو کر ہاتھ میں پکڑے ہوئے قرآنِ کریم کو چوم کر آنکھوں سے لگایا اور پھر سینے سے چمٹا لیا تھا۔

بے شک اس کتاب کی بدولت اس کی عزت اور محبت بچ گئی تھی۔ وہ اپنی ماں کی فخریہ نظروں سے گرنے سے بچ گیا تھا۔

عصمہ کا محبت پر اعتماد تو پختہ ہونا ہی تھا۔ مگر ذاتِ الٰہی پر یقین مزید پختہ ہوتا گیا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے دوسری مرتبہ اس کی دعا فوراً قبول کر کے اس کا نتیجہ بھی دکھا دیا تھا۔

☆======☆======☆

''میں خالقِ کائنات کی وہ تخلیق ہوں جس پر نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مبارک لگے۔'' آسمان اس لمحہ نورانی پتھروں کا مہمان تھا۔ ہوا، دھوپ، اور چاندنی ان سب کی سسکیوں اور آہوں نے ابھی تک آسمان کو ہی بہتر و معتبر جانا تھا۔ اس حوالہ سے کہ وہ گنبدِ خضریٰ کے مکین کا دیدار کر چکا ہے اور پھر دن رات چلے جاتے ہیں۔ سورج اپنا جلوہ دکھا کر ایک طرف کو چل کر غروب ہو جاتا ہے۔ وہ بھی سارا دن اور ساری رات تاجدارِ مدینہ کے روضۂ اقدس کا دیدار نہیں کر سکتا۔ چاند بھی اس قدر مجبور و بے بس تھا کہ اللہ رب العزت نے اس کی منزلیں قائم کر دیں۔ بالآخر وہ گھٹتے گھٹتے کھجور کی پرانی شاخ کے مترادف ہو جاتا ہے اور پھر نئے ماہ کی پہلی تاریخ سے دوبارہ اپنے جوبن اور سج دھج کے ساتھ چمکنے لگتا ہے۔ غرض کہ تمام ماہ و سال وہ بھی متواتر روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہیں کر سکتا۔ بس آ جا کے آسمان ہی تھا جو ہر لمحہ ہر گھڑی ہر ساعت ہر پل بلکہ تب سے لے کر اب تک وہ روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے فیضیاب حاصل کرتا آیا ہے اور قیامت تک کرتا ہی رہے گا۔

اسی لیے تمام اشیاء نے آسمان کو ہی بہتر و معتبر جانا تھا کیونکہ وہ نہ سوتا تھا۔ نہ ہی کہیں جاتا تھا۔ نہ ہلتا تھا، نہ چلتا تھا، نہ گرتا تھا، نہ ٹھوکر کھاتا تھا، بس رب تعالیٰ نے اسے جہاں قائم کر دیا تھا۔ وہ آج تک وہیں تھا اور تا قیامت وہیں رہے گا۔

اب وہ نورانیوں کو اپنی وہ آپ بیتی سنانے لگا تھا۔ آج تک اس نے جو کچھ دیکھا تھا۔ جو کچھ سنا تھا اور جو کچھ سہا تھا۔ نورانی وجدانی کیفیت میں مسحور تھے۔

اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو سیّد البشر تب بنایا جب آپؐ کا اس دنیا میں ظہور فرمایا۔ جیسے حضرت جبرائیل علیہ السلام سید الملائکہ بارہ گاہ نبوت میں امام الانبیاء و سید کون و مکان صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوتے تو لباس بشری میں جلیل القدر صحابی حضرت دحیہ کلبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حسین و جمیل شکل میں حاضر ہوتے تھے۔ حالانکہ حقیقت میں حضرت جبرائیل علیہ السلام نور ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بظاہر بشر ہیں اور لباس بشر میں دنیا میں تشریف لائے مگر حقیقت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نور ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پیارے صحابیوں سے فرمایا کرتے تھے کہ میں اس وقت بھی نبی تھا۔ جب حضرت آدم علیہ السلام ابھی پانی اور مٹی یعنی روح اور جسم کے درمیان تھے۔ بے شک، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا کہ تمہاری عمر کتنی ہے۔ تو جبرائیل علیہ السلام نے عرض کی۔

''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں نہیں جانتا کہ میری عمر کتنی ہے۔ ہاں البتہ اتنا جانتا ہوں کہ حجاب عرش پر ایک نوری ستارہ ہر ستر ہزار سال بعد طلوع ہوتا تھا۔ جس کو میں نے 72 ہزار مرتبہ دیکھا ہے۔ آپ میری عمر کا اندازہ کر سکتے ہیں۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''مجھے میرے رب کی عزت و عظمت کی قسم اے جبرائیل، وہ نوری ستارہ میں ہی ہوں۔ میں ستر ہزار سال میں قیام کرتا تھا اور ستر ہزار سال میں سجدہ۔ قیام میں مجھے تم دیکھ لیتے تھے اور جب میں سجدہ میں ہوتا تم تو کیا کوئی بھی مجھے دیکھ نہ سکتا تھا۔'' سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرما کر اپنی پیشانی مبارک سے عمامہ شریف ہٹا کر جبرائیل علیہ السلام کو دکھایا تو پیشانی رسول میں وہ نوری ستارہ نظر آ گیا۔

جبرائیل امین برجستہ بولے۔ ''بیشک یہی وہ ستارہ ہے میں اس نوری ستارہ کو بہت اچھی طرح پہچانتا ہوں۔''

نورانیوں کے وجود کو پگھلا کر رکھ دیا تھا۔ آسمان کی پُرنور اور تجلیات سے بھرپور باتیں نورانیوں کو مزید گبلا کر رہی تھیں۔ ان باتوں کو آسمان افشاء کر رہا تھا۔ جو ہوا، سورج اور چاند

کو معلوم نہ تھیں۔ کیونکہ آسمان تو ہر لمحہ ایک چھت کی صورت میں عالم کائنات پر قائم ودائم تھا۔ اس نے سبھی کچھ دیکھا تھا۔ جو کچھ وہ تین عناصر نہ دیکھ سکے تھے۔ اسی لیے وہ آسمان کو بہتر معتبر جانتے تھے۔

''اللہ تعالیٰ نے مقدس کتاب قرآنِ کریم میں کئی مقامات پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بلند ذکر اور اپنی محبت کے ساتھ آقائے دو جہاں کی محبت کو مشروط فرمایا ہے۔ سورہ فتح، توبہ، حجرات، نور، مائدہ، انفال، نساء، احزاب، مجادلہ، حشر اور م[illegible]ن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر کے ساتھ رسول اللہ کا ذکر بھی کئی جلوؤں کے ساتھ کیا ہے۔ اس ہستی کا نہ صرف ذکر بلند کیا۔ بلکہ تمام تر انبیاء کرام کی امامت بخشی اور کسی بھی نبی کو وہ مقام نہ مل سکا جو اس عظیم تر ہستی کو ملا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق، محبت اور عقیدت و اتباع ضروری قرار دی۔

بلکہ قرآنِ کریم میں یہ بھی فرمادیا۔ ''میرے حبیب! فرما دیجئے کہ اے لوگو تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری عورتیں، تمہارا کنبہ، تمہاری کمائی کے مال اور وہ تجارت جس کے نقصان کا تمہیں ڈر رہتا ہے اور تمہاری پسند کے مکان۔ ان میں سے کوئی چیز بھی اگر تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہے تو انتظار کرو کہ اللہ اپنا عذاب اتارے اور اللہ فاسقوں کو راہ نہیں دیتا۔ (التوبہ 24)

جبرائیل امین کو حکم ہوا کہ جاؤ اس محسن کائنات، مونس دل شکستگان، راحت عاشقان راہبر راہِ سالکان سید المرسلین، شفیع المذنبین، خاتم النبیین، رحمۃ للعلمین، مدثر مزمل، شاہداً، نذیراً امام الانبیاء تاجدار ارم، راحت قلب وسینہ تاجدار مدینہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر آؤ۔ ایک زرق برق، براق آقائے دو جہاں کو لے کر سوئے منتہیٰ چل پڑا۔ عرش پر فرش پر دھوم مچ گئی۔ عرش پر ملائکہ حورانِ جنت مخلوق آسمان اس من موہنی اور دل لبھانے والی صورت کو خوش آمدید کہنے کے لیے قطار در قطار ہاتھوں میں جنتی باغات کے پھولوں سے بنے گلدستے ہار اور مالائیں لے کر تاجدار مدینہ کے استقبال میں جھوم جھوم کر ''گھوم گھوم'' کر لہک لہک کر، مچل مچل کر، تڑپ تڑپ کر درود وسلام کے ترانے گا رہی تھیں۔ عرش کو دلہنوں کی طرح سجایا گیا تھا۔

اللہ پاک قرآنِ کریم میں فرماتا ہے۔ ''پاک ہے وہ ذات جس نے سیر کرائی۔ راتوں رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک۔''

حدیث شریف ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معراج کی شب حضرت اُم ہانی

رضی اللہ عنہا کے گھر میں آرام فرما رہے تھے کہ جبرئیل امین تشریف لائے۔ آپ کو نیند سے بیدار کیا اور براق پر سوار کر کے مسجد اقصیٰ کی طرف لے گئے۔ مسجد اقصیٰ میں تمام انبیائے کرام کسی کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی آپ تشریف لائے۔ جملہ انبیائے کرام نے آپ کو منصب امامت پیش کر کے آپ کی امامت میں نماز ادا کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تین پیالے پیش کیے گئے۔ جن میں پانی، دودھ اور شراب الگ الگ تھیں۔ دین فطرت کے داعی نے دودھ والے پیالے کو لے لیا۔ جس پر جبرائیل علیہ السلام نے آپ کو مبارکباد پیش کی اور پھر میری خوش نصیبی اور خوش قسمتی کی انتہا نہ پوچھو دوستو۔'' آسمان یہ کہہ کر کچھ توقف کرنے لگا۔

نورانی اس کیفیت سے سرشار تھے۔ وہ اس مسحور کن اور نورانی کیفیت سے باہر نہ نکلنا چاہتے تھے اور نہ ہی یہ ان کے بس کی بات تھی۔ وہ تو منہ اٹھائے آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بس ان کی تمنا تھی کہ وہ جلد از جلد محبّ اور محبوب کی ملاقات بیان کرے۔ آسمان سرشاری کے نشہ میں جھومتا ہوا بولا۔

''بیت المقدس سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمانوں کی طرف سفر کیا۔ پہلے آسمان پر آپ کی ملاقات اپنے جدامجد حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی۔ دوسرے آسمان پر حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آپ کو خوش آمدید کہا۔ تیسرے آسمان پر حضرت یوسف علیہ السلام نے اور چوتھے آسمان پر حضرت ادریس علیہ السلام نے آپ پر درود وسلام بھیجا۔ پانچویں آسمان پر حضرت ہارون علیہ السلام آپ کے منتظر تھے۔ جبکہ چھٹے آسمان پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آپ کا استقبال کیا۔ ساتویں آسمان پر بزرگ فرشتے عبادت و ریاضت میں مشغول تھے۔ جنہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام بھیجا۔ حتیٰ کہ آپ سدرۃ المنتہیٰ پر تشریف لے گئے۔ جہاں پہنچ کر حضرت جبرئیل امین نے آپ سے اجازت طلب کی کہ اس مقام سے آگے جانے میں اس کے پر جل جائیں گے۔ کیونکہ سدرۃ المنتہیٰ سے اوپر اللہ قادر مطلق کا نور موجزن تھا۔

پھر محبّ اور محبوب کے درمیان بغیر کسی واسطے اور کسی فاصلے کے سلسلۂ راز و نیاز شروع ہوا۔ آپ واپسی پر امت کے لیے نمازوں او۔ روزوں کا بابرکت تحفہ لے کر آئے۔ آسمانوں کی تمام مخلوق نے جی بھر کر، دل کھول کر، من کی آنکھیں کھول کر اس عظیم ترین بشر کا دیدار کیا تھا جو سدرۃ المنتہیٰ سے آگے بھی جا چکے تھے۔ وہاں جہاں صرف اللہ کا نور تھا۔ جبرائیل امین بھی اس نور کی تجلی کی تاب نہ لا سکتے تھے۔ جس نور کے سامنے نورانی چہرے

والے نے راز و نیاز کے دوران امت کی بخشش کے لیے نایاب و قیمتی تحائف حاصل کیے تھے۔ رب تعالیٰ کے نور کے سامنے یقیناً ایک بشر کے جانے کی اوقات نہیں ہے۔ وہاں صرف وہی پہنچ سکتا تھا جو بلایا گیا ہو۔" آسمان کی دلیل بڑی وزن والی تھی۔ نورانیوں نے اس دلیل پر سر ہلا دیئے جو کہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ آسمان کی اس پُر زور اور بھرپور وزن والی دلیل سے متفق ہیں اور اسے کوئی بھی ذی شعور اور عقلمند جھٹلا نہیں سکتا۔

"آسمان کی تمام مخلوق نے اس رات اس کا دیدار کیا تھا جن کی مقدس اور نورانی آنکھیں بہت ہی خوبصورت تھیں۔ قدرت الٰہی سے سرگیں۔ لگتا تھا کہ سرمہ لگایا ہوا ہے۔ آنکھوں کی سفیدی میں باریک سُرخ ڈورے تھے۔ جن کو علاماتِ نبوت میں شمار کیا گیا ہے۔ پلکیں نہایت خوشنما اور دراز تھیں اور یہی وہ مبارک آنکھیں ہیں جو ساری کائنات کا مشاہدہ فرما رہی ہیں۔ انہی آنکھوں نے اپنے رب کو بے حجاب دیکھا ہے۔

آپ کے گوش مبارک کامل و تام تھے۔ آپ فرمایا کرتے کہ جو میں دیکھتا ہوں۔ وہ تم نہیں دیکھتے اور جو میں سنتا ہوں۔ وہ تم نہیں سنتے۔

آپؐ کے لب مبارک نہایت خوبصورت اور سرخی مائل تھے۔ دندان مبارک کشادہ۔ روشن و تاباں تھے۔ مونہہ مبارک فراخ، رخسار مبارک ہموار۔ سب سے زیادہ خوبرو اور خوش آواز، زبانِ مبارک جو کہ پاکیزہ اور لطف و محبت کا منبع و مظہر تھی۔ آپ کی داڑھی مبارک گھنی اور بہت ہی زیادہ خوشنما تھی۔ مونچھیں ترشوائی ہوئی تھیں۔ آپ کی گردن مبارک نہایت اعتدال کے ساتھ طویل اور چاندی کی طرح چمک والی تھی۔ سفید اور حسین ایسی تھی کہ گویا آپ کی گردن چاندی کی صراحی تھی۔ کندھے مبارک بھی عجیب شان کے تھے۔ گویا کہ میں نے کبھی بھی کسی انسان کے ایسے شاندار کندھے نہ دیکھے تھے۔ آپ کی پشت مبارک ایسی تھی کہ گویا چاندی کی ڈھلی ہوئی ہو۔ آپ کے دونوں شانوں کے درمیان مہر نبوت کبوتر کے انڈے کی مثل تھی۔ جس پر گوشت سے قدرتی طور پر محمد لکھا ہوا تھا۔ آپؐ کے کف دست اور بازوئے مبارک پُر گوشت تھے۔ آپ کا شکم اقدس اور سینۂ اطہر ہموار و برابر تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بدن سے نکلنے والی خوشبو اس سے پہلے ملائکہ اور مخلوقِ آسمان نے کبھی بھی نہ سونگھی تھی۔ ان عظیم اور معطر و مطہر نشانیوں والے کسی بشر کو پہلی بار دیکھنا تمام کے تمام کو ورطۂ حیرت میں مبتلا کر گیا۔ میرے سینے پر ان کے مبارک قدم۔ ان کی نعلین مبارک کا آنا ہی مجھے معتبر و معزز کر گیا۔

اس عظیم و نورانیت والے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے لیے کچھ نہ

مانگا۔ اپنی اولاد کے لیے کوئی طلب نہ کی۔ اپنی آل کے لیے جنت کا گوشہ تک نہ مانگا۔ مگر اپنی امت کے لیے اتنا کچھ مانگ لیا کہ امت کو جنت کے لیے تگ و دو نہیں کرنی پڑے گی۔ بس اس سیاح لامکاں، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک بار درود پڑھنے سے ان کا ادنیٰ سے ادنیٰ امتی بھی جنت کا حقدار بن جاتا ہے۔ میرے نورانی دوستو، یہ بات بڑی اچھی طرح واضح ہو گئی کہ سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتی ہم سب سے بڑا اعلیٰ درجہ رکھتا ہے۔ ہوا، پانی، بادل، چاند، سورج، شجر، پہاڑ، آگ، آسمان اور کائنات کی ہر چیز، ہر مخلوق سے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف پیدا کیا ہے اور اس مخلوق میں سے افضل ترین قوم محبوبِ خدا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے۔

روزانہ ستر ہزار فرشتے روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام پیش کرنے کے لیے حاضر ہوتے ہیں اور ایک فرشتہ جو ایک بار آ جاتا ہے۔ قیامت تک دوبارہ اس کی باری نہیں آئے گی۔ یہ خاص الخاص مرتبہ اور اعزاز اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے محبوبؐ کی امت کو بخشتا ہے۔ میں خوش نصیب ضرور ہوں۔ مگر بدنصیب بھی ہوں کہ تا قیامت ان نعلین مبارک کی گرد کو ترسوں گا۔ ان مبارک قدموں کو چومنے کے لیے ترسوں گا۔ اس مقدس و معطر وجود مبارک اور بھینی بھینی خوشبو جو اس مقدس چہرے اور مقدس وجود کے پسینے مبارک سے نکلی ہے اس کے لیے تڑپوں گا۔ والیل کی صورت والی مسحور کن زلفوں کو دیکھنے کے لیے ترسوں گا۔ بس یہ سمجھ لو کہ اس آقائے تاجدار مدینہ کے امتی کا مقام اس کائنات کی ہر مخلوق سے افضل و بہتر ہے۔ کیونکہ کئی کئی بار روضۂ اقدس کی زیارت صرف امتی ہی کر سکتا ہے۔ کیونکہ آقائے دو جہاںؐ کے در پر حاضری کی سعادت امتی کے لیے بخشش کا وسیلہ ہے۔"

آسمان نے آخری باتیں بھرائے ہوئے لہجہ میں کی تھیں۔ جس سے نورانیوں کے وجود مزید گیلے ہو گئے۔ وہ حسرت و یاس کی تصویر بن کر رہ گئے تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ آسمان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں مزید کچھ کہہ سکے۔ کیونکہ ان کی تعریف تو ہر روز ہر لحہ کائنات کا اک اک ذرہ کرتا رہتا ہے۔ دن کے چوبیس گھنٹوں میں ہر لمحہ سرکار دو عالم رحمۃ للعلمین کا ذکر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی سنتوں اور احادیث پر عمل کرنے والی امت ان کی دعائے خاص اور مہربان رب تعالیٰ کی خاص کرم نوازی سے بخشش و مغفرت و جنت کی حقدار ہے۔

"تو میرے مہربان ساتھیو! اس کا مطلب تو یہی ہوا کہ ہم سب سے بہتر بلکہ تمام مخلوق کائنات سے بہتر آقائے تاجدار مدینہ کا ایک امتی ہے جو بار بار ان کے مقدس و معطر مطہر روضہ

کی زیارت سے فیض یابی حاصل کر سکتا ہے۔ بلکہ کرتا ہے۔ بس ہمارے اس گھر میں آنے والے امتی کو دلی طور پر خوش آمدید کہو۔ تاکہ آقائے دو جہاں ہم سے راضی ہوسکیں۔''

بڑے نورانی نے اپنے دوستوں کو سمجھایا اور خود بھی نم وجود سے اس عظیم سے عظیم ترین بشری لباس والے پر درود وسلام پڑھنا شروع کر دیا۔

☆======☆=====☆

شیخ عمر حیات کے گھر کا ماحول انتہائی پراگندہ ہو گیا تھا۔ یا پھر یوں کہہ لیں کہ زوال شروع ہو گیا تھا۔ ملیحہ کا ابارشن ہو چکا تھا۔ اس نے باپ اور ماں کو بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ بابا جی کے ''کرم'' سے فیض یاب ہوئی ہے۔ بس اپنی ہی زندگی سے اسے نفرت ہونے لگی تھی۔ وہ غفران پر جھوٹے الزام کو اب کسوٹی پر پرکھ رہی تھی۔ کیونکہ وہ اسے ہر طرف سے سچا ہی نظر آرہا تھا۔ ساری غلطی سارا گناہ سارا کھوٹ تو اس کا اپنا تھا۔ وہ بابا جی کے طریقۂ واردات کو سمجھ گئی تھی۔ مگر اس کے والدین اور بھائی اس کے انتہائی گرویدہ تھے۔ بلکہ اس کو خدا کی جگہ مانتے تھے۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ غفران کا پیر بالکل صحیح ہے۔ وہ ایک سچے مرشد کامل ہیں۔ جنہوں نے غفران کو اللہ کی رحمت سے اتنے بڑے جھوٹ اور گناہ سے بچا لیا تھا۔ وہ اگر گھر میں کسی کو بھی بابا جی کا اصل روپ بتاتی تو کوئی بھی اس کی بات پر یقین نہ کرتا۔ کیونکہ فی الحال تو تمام گھرانہ ہی کفر اور جہالت کے اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ خود کو ملامت کرتی رہتی تھی کہ اس نے غفران جیسے اچھے کردار کے مالک پر کتنا گندا اور گھناونا الزام لگایا تھا۔

وہ اسی احساسِ ندامت سے اندر ہی اندر کڑھتی رہتی اور گھلتی جا رہی تھی۔ اس نے اب ''مرشد'' کی خدمت میں جانا بھی بند کر دیا تھا۔ اب بھی وہ اپنے کمرے میں بند ہو کر رہ گئی تھی۔ عزت گنوا کر اسے ہوش آئی تھی۔ ایک نایاب گوہر کو اس نے ایک ڈھونگی اور دھوکے باز کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ وہ اس سے انتقام لینے کے کئی طریقوں پر سوچتی، لیکن بالآخر اس کی تان اس بات پر آکر ٹوٹ جاتی کہ گھر والے اس کا ساتھ کبھی بھی نہ دیں گے۔ کیونکہ وہ فی الحال اندھے ہو چکے ہیں۔

وہ اپنی بربادی پر آنسو بہا رہی تھی کہ شیخ عمر حیات اور عالیہ بیگم اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ انہیں دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ کیونکہ شیخ صاحب کبھی بھی اس کے کمرے میں نہ آئے تھے۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ شیخ اس کے بیڈ کے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر جبکہ عالیہ بیگم اس کی پاس بیڈ پر بیٹھ گئی۔ وہ اس کے بالوں میں ہاتھ سے کنگھی کر رہی تھی۔

ملیحہ کا ماں کی محبت دیکھ کر دل بھر آیا۔ وہ اونچی آواز میں رونے لگی۔ عالیہ بیگم نے اس

کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تھا۔ وہ پیار سے اس کی پیٹھ تھپتھپا رہی تھی۔ شیخ سامنے بیٹھا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ کچھ بھی تھا۔ وہ باپ تھا۔ اس کی شفقت پدری نے جوش مارا تو وہ بولا۔

''جو ہونا تھا وہ ہو چکا بیٹا! تم نے بتایا نہیں کہ وہ کون تھا؟ تمہاری مرضی، لیکن اب کتنی دیر اس بدنصیبی پر بے سود آنسو بہاتی رہو گی؟''

''دیکھو میری جان!'' عالیہ بیگم نے اس کا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے اس کے آنسو اپنے ہاتھوں سے صاف کئے۔ ''دنیا اسی چیز کا نام ہے۔ نشیب و فراز تو زندگی کا حصہ ہیں۔ اگر کوئی شخص گہری کھائی میں گر جائے تو اسے اوپر آنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے چاہئیں۔ وہ اگر ایسا نہیں کرے گا تو گہری کھائی اس کی موت بن جائے گی۔ اب سب کچھ بھول جاؤ۔ چلو میرے ساتھ۔ بابا جی بلا رہے ہیں۔''

اس نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا۔ جیسے وہ خود اپنی بیٹی کو مقتل کی طرف لے جانے کے لیے آئی ہو۔ بابا جی نے اس کی ماں کی شکل میں خوبصورت پیغام بھجوایا تھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا تو شیخ کو بھی اچنبھا ہوا۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

''ایسا کہہ کر گناہگار نہیں ہوتے بیٹا۔ چلو چل کر ان سے بات کرتے ہیں۔ وہ بڑی کرنی والے ہیں۔'' شیخ کا اتنا ہی کہنا تھا کہ وہ پھٹ پڑی جیسے لاوا پھٹتا ہے۔ اس کی متورم آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ وہ اپنے آپ پر ضبط نہ رکھ سکی۔

''جہالت اور کفر و شرک کی پٹی اپنی آنکھوں سے اتاریئے ڈیڈی۔''

بیٹی کے منہ سے یہ الفاظ سن کر شیخ اور عالیہ بیگم سن ہو کر رہ گئے۔

''آپ پوچھتے ہیں نا کہ میرے پیٹ میں گناہ کیسے پلا؟ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ کون ہے وہ بے غیرت جس نے مجھے کنواری ماں بنایا ہے؟ دل کو تھام کر اور کانوں کو کھول کر سنیئے۔ وہ آپ کا بابا جی ہے جسے آپ ہر روز صبح......''

زناٹے دار تھپڑ نے اس کی بولتی بند کر دی تھی۔ یہ تھپڑ شیخ عمر حیات نے اس کے منہ پر مارا تھا۔ وہ لڑھک کر ایک بار پھر بیڈ پر گر گئی تھی۔ اس نے بالوں سے پکڑ کر ملیحہ کو اٹھایا اور اپنے سامنے کھڑا کر لیا۔

''یہ صلہ دے رہی ہو اس عظیم انسان کی خدمت کا۔'' ایک اور تھپڑ نے اس کے ہونٹوں سے خون جاری کر دیا تھا۔ وہ دور جا کر گری۔ عالیہ بیگم بھی نفرت اور حقارت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگی۔

''اب اگر تمہاری زبان سے اس عظیم شخص کی برائی کے لیے بھی لفظ نکلا، تو یاد رکھنا

ملیحہ، کاٹ کر کتوں کے آگے پھنکوادوں گا۔ عالیہ بیگم اس کمرے کی ہر کھڑکی۔ ہر دروازہ بلکہ ایک ایک روزن کو بند کر دو؟'' وہ دیوانوں کی طرح بھاگ کر خود ہی دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔

''اس کی یہ بکواس اگر اس مقدس شخص نے سن لی تو وہ ہم سے ناراض ہو جائیں گے اور یاد رکھو عالیہ بیگم اگر کسی سے اس کا خدا ناراض ہو جائے تو وہ شخص سڑکوں پر بھیک مانگتا ہوا نظر آتا ہے اور کوئی اس پر ترس کھا کر بھی بھیک نہیں دیتا۔'' وہ رازدارانہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔ مگر اس کے گلے کی رگیں پھول گئی تھیں۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے ننھے منے قطرے نمودار ہو گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا۔ ملیحہ پلٹ کر اس کی طرف آئی اور ایک حوصلے سے اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں خون اور انتقام کی چنگاریاں دیکھ کر شیخ کو اپنی آنکھیں نیچی کرنی پڑیں۔

''آپ نے درست کہا ہے ڈیڈی! کہ خدا ناراض ہو جائے تو منگر کو بھیک بھی نہیں ملتی۔ میری بات اچھی طرح یاد کر لیں کہ آپ کا خدا آپ سے ناراض ہو چکا ہے۔'' شیخ نے بیٹی کی طرف دیکھا۔ وہ غصے اور نفرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''میری بات کا یقین تب آئے گا۔ جب بہت دیر ہو چکی ہو گی۔ اس ڈھونگی اور فراڈیے نے آپ کی آنکھوں پر اپنے کالے علم کی پٹی باندھ دی ہے۔ اندھے ہو گئے ہیں آپ اندھے۔'' چٹاخ! ایک اور زناٹے دار تھپڑ نے اسے بیڈ پر گرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''عالیہ بیگم! میرے گھر میں اس جیسی بے ادب بھی رہتی ہے۔ مجھے علم نہ تھا۔'' وہ باہر نکل گیا۔ عالیہ بیگم جانے لگی تو ملیحہ کی آواز نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔

''اپنا یورین ٹیسٹ رپورٹ بھی کروا لیجیے گا اور پھر میری طرح ابارشن بھی۔'' ہا، ہا، ہا...... اس کے قہقہوں نے عالیہ بیگم کی رہی سہی طاقت بھی ختم کر دی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکی۔

وہ جو کھیل بابا جی کی خدمت کر کے کھیل رہی تھی، اس کا خیال تھا کہ اس کا تیسرے کسی بھی فرد کو علم نہیں ہے۔ ملیحہ کے حمل اور ابارشن نے ثابت کر دیا تھا کہ اس کھیل کا ملیحہ کو ضرور علم ہے۔ عالیہ بیگم کا ہاتھ بے اختیار اپنے پیٹ پر چلا گیا تھا۔ وہ ملیحہ کو قہقہے لگاتا چھوڑ کر اس کے کمرے سے نکل آئی۔ اس کے دماغ کی چولیں ہل کر رہ گئی تھیں۔ وہ بابا جی کو انکار کر کے گناہ کی مرتکب نہ ہونا چاہتی تھی۔ اس نے تو اپنی طرف سے بابا جی کی محبت اور عقیدت کا والہانہ اظہار کیا تھا۔ مگر ملیحہ تو اس پر تہمت لگا رہی تھی۔

بے شک بابا جی ایک بھرپور مردانہ شخصیت کے حامل فرد تھے۔ شیخ صاحب تو ایکسیڈنٹ کے بعد ان صفات سے محروم ہو گئے تھے۔ اب وہ اپنی جوانی اور خواہشات کو کہاں لے کر جائے؟ اب اگر وہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے بابا جی کے کرم سے فیض یاب ہو رہی تھی تو ملیحہ کو کیا تکلیف ہے؟

وہ غفران اور کسی تیسرے کے ساتھ مل کر بابا جی کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

عالیہ بیگم نے اپنے آپ کو مطمئن کر لیا تھا۔ وہ ''اونہہ'' کہہ کر وہاں سے اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ شام کا ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا کہ ملازم کی چیخ اور رونے کی آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ اپنے کمرے سے نکلی ہی تھی کہ ملازم ان سے ٹکرایا۔ غرور و تکبر کی اس پڑیا نے زوردار تھپڑ سے ملازم کا استقبال کیا۔

''اندھے ہو گئے ہو کیا؟ کیا دھما چوکڑی مچا رکھی ہے؟'' اس کے چہرے سے نخوت ٹپک رہی تھی۔

''بی بی جی! وہ ملیحہ بی بی۔'' وہ گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے اپنے سرخ گال پر ایک ہاتھ رکھا ہوا تھا۔

''کیا ہوا ملیحہ بی بی کو۔ جلدی بکو؟''

''وہ جی ان کے منہ سے خون نکل رہا ہے اور بے ہوش پڑی ہوئی ہیں۔'' ملازم نے مزید شامت آنے سے پہلے ہی ماجرا کہہ دیا۔

عالیہ بیگم تیز انداز میں چلتی ہوئی اس کے کمرے میں پہنچی تو ملیحہ بیڈ پر آڑی ترچھی لیٹی ہوئی تھی۔ عالیہ بیگم نے پاس جا کر دیکھا تو اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اور اس کے ہاتھوں میں نیند کی گولیوں کی کافی مقدار بھی موجود تھی۔

عالیہ بیگم کو تشویش ہوئی۔ اس نے ملیحہ کو ہلا جلا کر دیکھا لیکن کوئی حرکت نہ پا کر اس نے ملازموں کو پکارنا شروع کر دیا تھا۔ ''کوئی ایمبولینس کو فون کرو۔ فوراً۔''

اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کرے؟ بابا جی بھی اس ہنگامے کو سن کر اپنے آستانے سے باہر آ گئے۔ اس نے بھی عالیہ بیگم سے بھگدڑ کی وجہ پوچھی۔ وہ بھی سن کر پریشان ہو گئے تھے۔

اتنی دیر میں ایمبولینس آ گئی تھی۔ شیخ عمر حیات ابھی کہیں سے آیا ہی تھا کہ اپنی کوٹھی کے باہر ایمبولینس دیکھ کر پریشانی کے عالم میں تیزی سے گاڑی سے اترا۔ وہ گیٹ میں داخل ہو رہا تھا کہ دو افراد جو کہ ایمبولینس کے عملہ میں شامل تھے۔ ملیحہ کو سٹریچر پر لاد کر لا رہے تھے۔

انہوں نے ملیحہ کو ایمبولینس میں ڈالا اور چلے گئے۔

شیخ تمام ماجرا ہونقوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔ عالیہ بیگم کی آواز پر چونکا۔

''جلدی کیجئے شیخ صاحب! معلوم کریں کہ ملیحہ کو کیا ہو گیا ہے؟''

شیخ کو جیسے ہوش آ گیا تھا۔ وہ الٹے قدموں گاڑی کی طرف بھاگا گاڑی ہسپتال کی طرف اڑی جا رہی تھی اور شیخ سوچوں میں گھرا ہوا ڈرائیو کر رہا تھا۔ کیا ملیحہ نے خودکشی کر لی ہے؟ مگر کیوں؟ کس چیز کی کمی تھی اسے میرے گھر میں؟ وہ ہسپتال کے کوریڈور میں داخل ہوا ہی تھا کہ ڈاکٹر نے اسے افسوسناک خبر سنا دی۔

''آئی ایم ساری شیخ صاحب۔ ہم ملیحہ کو نہیں بچا سکے۔ دراصل ٹیبلیٹس کی تعداد بہت زیادہ تھی اور کھائے ہوئے زیادہ دیر بھی ہو گئی تھی۔ آپ ان کی ڈیڈ باڈی لے جا سکتے ہیں۔''

ڈاکٹر اور کیا کہہ رہا تھا، مزید اسے کچھ بھی نہ سنائی دیا۔ وہ وہیں بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر اس کا پرانا شناسا تھا۔ اس نے شیخ کو دلاسہ دیا اور ملیحہ کی لاش ایمبولینس میں رکھوا کر شیخ کو گھر پہنچنے کا کہا۔

ملیحہ کی موت نے شیخ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ احمد باؤ بھی پُرسوگ چہرہ لیے گھر میں اداس اور پریشان بیٹھا رہتا تھا۔ عالیہ بیگم کا راز ملیحہ کی موت کے ساتھ ہی دفن ہو گیا تھا۔ بابا جی بھی بہ ظاہر مغموم رہتے تھے۔ ان کا ایک کنواں خشک ہو گیا تھا۔ جس ڈربے میں وہ دانہ دنکا چگتے تھے۔ وہ ڈربہ ہی خالی ہو گیا تھا، لیکن ابھی تک اس کا مشن پورا نہ ہوا تھا۔ اس کا مشن تو ابھی کسی کو بھی معلوم نہ تھا۔ وہ اپنا کام بخوبی انجام دے رہا تھا۔ احمد باؤ کی دن بدن گرتی ہوئی صحت نے عالیہ بیگم کو پریشان کر دیا تھا۔ اس کی بھوک مر گئی تھی۔ شیخ نے اور عالیہ بیگم نے کئی بار اس کی شادی کا تذکرہ چھیڑا۔ مگر وہ عصمہ کے سوا کسی حور سے بھی شادی پر رضامند نہ تھا۔

عصمہ سے اس کی شادی کسی صورت نہ ہو سکتی تھی۔ یہ عالیہ بیگم بخوبی جانتی تھی۔

بابا جی نے اپنی چھری تیز کر لی تھی۔ وہ اب آخری ضرب لگا کر شیخ کو بالکل کنگال کر دینا چاہتا تھا۔ یہ اس کا انتقام نہیں بلکہ مشن تھا۔ کیونکہ وہ اسی طرح ارب پتی بن سکتا تھا۔ اس نے اداس اور مغموم شیخ کو اپنے سامنے بٹھایا اور بولا۔

''شیخ صاحب! الیکشن نزدیک آ رہے ہیں اور میں نے سنا ہے کہ حاجی عبداللہ کی پوزیشن کافی مضبوط ہے۔ اس کی پوزیشن بہتر ہونے کی وجہ اس کا حج ہے۔ اس کے نام کے ساتھ جو لفظ حاجی لگا ہوا ہے۔ وہی اسے فتح دلواتا رہا ہے۔'' یہ کہہ کر بابا جی خاموش ہو گئے۔ شیخ نے استفسار طلب نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ تو وہ لبوں پر مسکراہٹ سجائے ہوئے

اداکاری سے بولا۔

''میں کہہ رہا تھا کہ تم بھی اس ہفتے عمرہ کی سعادت کے لیے سعودی عرب چلے جاؤ۔ وہاں سے کھجوریں اور آبِ زم زم لے کر آؤ۔ اپنے حلقہ کے تمام گھروں میں اپنی تصویر اور اپنا منشور ان چیزوں کے ساتھ بھیجو۔ عوام تمہاری مذہب سے دلچسپی دیکھ کر تمہیں حاجی کی نسبت زیادہ ووٹ دیں گے۔'' بابا جی نے کہا تو شیخ کی آنکھوں میں جیت اور فتح کی چمک پیدا ہو گئی۔ وہ اپنے آپ کو اس ملک کی ایک بڑی کرسی پر جلوہ افروز دیکھنے لگا۔ بابا جی کی آواز پھر آئی۔

''اس طرح ملیحہ کا غم بھی بھول سکو گے۔ سچ پوچھو شیخ صاحب تو مجھے ذاتی طور پر بہت دکھ ہوا ہے ملیحہ کی موت کا۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔'' یہ کہتے ہوئے بابا جی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ یقیناً بہت بڑا اداکار تھا۔

شیخ اس کے اس جذبہ ہمدردی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور عقیدت سے اس کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا۔

''ابھی جائیے شیخ صاحب اور ویزہ کا بندوبست کیجئے۔ ہم نے حاجی عبداللہ کو واضح مارجن سے شکست دینی ہے۔ آپ گھبرائیے نہیں۔ جیت اور فتح ہماری ہو گی۔'' وہ شیخ کو کہہ رہا تھا۔ بظاہر اپنے دل کو تسلی دے رہا تھا کہ فتح اسی کی ہو گی۔

شیخ اٹھ کر چلا گیا اور عالیہ بیگم آستانے میں داخل ہو گئی۔ وہ بابا جی کی ''خدمت'' کر کے ملیحہ کا غم غلط کرنا چاہتی تھی۔ بابا جی کا اس پر کرم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ جبکہ عالیہ بیگم مستی و سرور کی کیفیت میں بیٹی کی موت کا غم بھول رہی تھی۔

شیخ کے تعلقات کی بنا پر اس کے ویزہ کا بندوبست جو کہ دس دنوں میں ہونا تھا، دو دنوں بعد ہی ہو گیا۔ تمام مریدین بابا جی کو اطلاع کر دی گئی تھی کہ شیخ صاحب عمرہ کی سعادت کے لیے جا رہے ہیں۔ گھر ایک بار پھر مہمانوں سے بھر گیا تھا۔ شیخ کو پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا گیا تھا۔ وہ مستقبل کا وزیراعظم بننے کے لیے سعودی عرب کا چکر لگانا چاہتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نیتوں اور ارادوں کو جانتا ہے۔ شیخ کو رخصت کرنے کے بعد مہمان اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ جانی اور احمد باؤ شیخ کو ائیر پورٹ پر سی آف کرنے کے لیے گئے تھے۔

''جانی صاحب! میرے بیٹے کا خیال رکھیے گا۔ مجھے اس کی طرف سے فکر لاحق ہو رہی ہے۔'' شیخ نے الوداعی ملاقات میں جانی سے گلے ملتے ہوئے کہا تو جانی مسکرا کر خوش دلی سے بولا۔

"آپ فکر نہ کریں شیخ صاحب۔ بھلا گھبرانے کی کیا بات ہے؟ میں ہوں نا اور پھر بابا جی سرکار بھی تو ہیں۔" جانی نے جان بوجھ کر بابا جی کا تذکرہ چھیڑ دیا تھا۔

احمد باؤ باپ سے سرسری طور پر ملا تھا۔ جیسے اسے معلوم ہو کہ اس کا باپ عمرہ کرنے نہیں بلکہ اپنے اوپر صرف حاجی کی مہر لگوانے جا رہا ہو۔ وہ بے دلی سے واپس مڑا تھا۔

جانی نے اسے اس کے گھر پر اتارا تھا اور اپنی گاڑی جو کہ اس نے کرایہ پر لی تھی۔ آگے بڑھا لے گیا تھا۔ اس نے فوراً اپنے ٹھکانے پر پہنچنا تھا۔ اب جو بھی کرنا تھا۔ جلدی کرنا تھا کیونکہ بابا جی نے شیخ کے گھر اور گھر والوں پر پورا قبضہ کر لیا تھا۔ ملیحہ کی موت کی خبر اس نے غفران کو پہنچا دی تھی۔ وہ اس کا جنازہ پڑھنے بھی نہ آیا تھا۔

اب وہ فوراً سے پہلے ڈاکٹر شارق کو چیک کرنے والے تھے۔ اس نے جانی کو بتا دیا تھا کہ اسے شاہ جی نے تمام معاملہ تمہارے ساتھ ختم کرنے کے لیے کہا ہے۔ مگر یہ بھی کہا ہے کہ میں تمہاری مدد کرنا چاہوں تو کر سکتا ہوں، لیکن جانی نے اسے اپنی زندگی بہتر بنانے پر توجہ دینے کو کہا تھا۔ وہ بہت خوش ہوا تھا کہ غفران شاہ جی کا مرید ہو گیا تھا۔ وہ اللہ کی طرف لو لگا کر نمازوں اور ارکانِ اسلام کی پابندی کر رہا تھا۔

اس نے اپنا تمام معاملہ اللہ کے حکم پر اللہ کی رضا سے اس کی پاک ذات پر چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ خواب میں بھی اسے حکم ملا تھا کہ تمام معاملات اللہ پر چھوڑ دے اور پھر شاہ جی نے بھی کہا تھا کہ وہ تمام معاملات کو اللہ پر چھوڑ دے۔ کیونکہ اللہ بہتر عدل کرنے والا ہے۔ اس نے نماز کی باقاعدہ پابندی کرنا شروع کر دی تھی۔

عصمہ اسے قرآن کریم کا ترجمہ بھی سناتی اور معنی بھی سمجھاتی تھی۔ وہ ہر بات کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ وقت پر گھر آتا اور صبح نماز کے بعد گھر سے نکل جاتا تھا۔

اب جانی نے انہیں بتایا تھا کہ شیخ عمرہ کے لیے جا رہا ہے۔ تم اپنے ٹھکانے پر پہنچ جانا۔ وہ اپنی جگہ پر پہنچ گیا تھا۔ تہہ خانہ میں اس کے سامنے ایک کرسی پر ڈاکٹر شارق بندھا ہوا تھا۔ دوسری کرسی پر اس کے ساتھ جانی بیٹھا ہوا تھا۔ جانی کے ہاتھ میں وہی تار تھی جس سے ایمان کو قتل کیا گیا تھا۔ اس کے پاس میز پر کافی کاغذات اور سامان بھی پڑا ہوا تھا۔

"تم اسے کہاں سے پکڑ کر لائے ہو؟" غفران نے جانی سے سوال کیا۔

"آپ کو یہ سن کر حیرانی ہو گی کہ اس کو کل سے یہیں مہمان بنایا ہوا ہے اور مزیدار بات یہ ہے کہ میں نے اس سے کوئی بھی سوال نہیں کیا ہے۔" جانی نے وضاحت کی تو غفران واقعی حیران ہو گیا۔

"اسے کچھ کھلایا پلایا بھی ہے یا بس یونہی...... نام کا ہی مہمان ہے۔"

"میں تو اس کے لیے بہت اہتمام کر چکا تھا، لیکن میرا وجدان کہتا ہے کہ کھانے پینے کے بغیر ہی یہ بتائے گا۔ ہم اس پر ظلم نہیں کریں گے۔" جانی نے کہا تو غفران نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ جانی کی بات یا اشارہ سمجھ کر بولا۔

"اس پر ظلم صرف یہ ہو گا کہ ہم اسے بھوکا پیاسا رکھیں گے جتنے دن اس کی مرضی ہو۔ جب بھی اس کا دل چاہے۔ ہمیں بتا دے کہ یہ ہمارے سوالوں کے جواب دینے کے لیے تیار ہے۔" ڈاکٹر جانی کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ اس نے پہلی بار زبان کھولی۔

"دیکھو جانی! میں اور تم پیر بھائی ہیں۔ تمہیں میرے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔" وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ کل سے جانی نے اسے کھانا تو در کنار پینے کے لیے پانی کی ایک بوند بھی نہ دی تھی۔ آخر وہ بھی انسان تھا۔ کب تک برداشت کر سکتا تھا اور پھر ابھی تک جانی نے یہ بھی واضح نہ کیا تھا کہ وہ کیا پوچھنا چاہتا ہے۔ وہ اس وقت کو کوس رہا تھا۔ جب وہ جانی کے کہنے پر اس کے ساتھ چلا آیا۔ اس جگہ پر لا کر جانی نے اسے کوئی چیز سونگھنے کو دی۔ وہ ڈاکٹر تھا۔ تجسس سے سونگھ کر بولا کہ یہ تو بے ہوشی کی دوائی ہے۔ مگر مجھے کیوں......

بس اس کے بعد اس کی آنکھ کھلی تو وہ کرسی پر مضبوط رسیوں سے بندھا ہوا تھا اور تہہ خانے کا دروازہ بند تھا۔ وہ کمرے میں اکیلا تھا۔ اس نے جانی کو کئی آوازیں دیں۔ مگر جواب ندارد۔ وہ ساری رات کرسی پر بندھا بیٹھا رہا تھا۔ اس کی کمر پھوڑے کی طرح درد کر رہی تھی۔ عذاب تو یہ تھا کہ وہ کچھ بھی نہ پوچھ رہا تھا اور پھر غفران کو جانی کے ساتھ دیکھ کر اس کی سٹی گم ہو گئی تھی۔

وہ کچھ تو سمجھ گیا تھا۔ مگر بہت کچھ نہ سمجھا تھا۔ یہ جانی کو مجھ سے کیا تکلیف ہو گئی کہ اس نے مجھے اس طرح مجرموں کی طرح باندھ رکھا ہے۔

"پہلی بات تو یہ ذہن سے نکال دو کہ میں تمہارا پیر بھائی ہوں۔ کیونکہ بابا جی کے باقاعدہ تم مرید ہو۔ میں نہیں۔ دوسری بات یہ کہ جب میں سوالات کا سلسلہ شروع کروں گا تو وہ نان سٹاپ ہو گا اور میں بھی چاہوں گا کہ تمہاری زبان نان سٹاپ ہی چلتی رہے بھلا کیسے؟ ایسے کہ جیسے رات کو ہمارے ملک کی سڑکوں پر منظھار بسیں چلتی ہیں۔ کچھ سمجھ میں آیا یا پھر اگلی سمجھ بھی گئی؟"

جانی نے اس کی آنکھیں مزید کھول دی تھیں۔ اس دوران غفران خاموش بیٹھا منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا کیونکہ اس کے متحرک ہونٹ اس کی گواہی دے رہے تھے۔

"کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" ڈاکٹر کی آنتوں نے بلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ زیادہ دیر بھوک برداشت کرنے کا عادی نہ تھا۔ جانی نے اس کی کمزوری کا خوب فائدہ اٹھایا تھا۔ وہ بابا جی کا مرید بن کر ان سب کی کمزوریاں جان گیا تھا۔ جو بابا جی کے حلقۂ عقیدت میں مقید تھے۔ ڈاکٹر کی کمزوری اچھا کھانا اور بھوک برداشت نہ کرنا تھا۔

"سب سے پہلے سوال و جواب کی شرائط طے ہوں گی۔" غفران نے بھی زبان کھولی تو جانی بھی حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر تو پہلے ہی حیران تھا۔ وہ غفران کا بدلا ہوا روپ دیکھ رہا تھا۔

"کیسی شرائط؟" ڈاکٹر نے پوچھا تو جانی نے بھی استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

"انتہائی آسان، جو کہ تم آسانی سے سمجھ سکو گے۔" غفران نے اپنے ہاتھوں پر پھونک مار کر انہیں اپنے چہرے پر مل لیا۔ وہ اٹھ کر ڈاکٹر کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔

"سوالوں کی تعداد گنی جائے گی۔ جتنے نمبر سوال پر تمہارا جواب اٹکے گا۔ اتنے ہی دن تمہیں بھوک اور پیاس برداشت کرنا پڑے گی۔ سوالات کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے اچھی طرح سوچ لو۔" غفران نے کہا تو جانی نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اگر چاہو تو تمہیں چوبیس گھنٹے مزید بھوکے رکھ کر میں یہ آفر تمہیں پیش کر سکتا ہوں۔" غفران نے کہا۔ "تو میں شروع کروں یا پھر انتظار کرو گے۔" جانی اس کی باتیں سن کر سوچ رہا تھا کہ ابھی غفران کے اندر سے پہلے والا غفران نہ نکلا تھا، لیکن اس کے ذہن کی داد دینی پڑ گئی تھی۔ وہ بھی یہی چاہتا تھا کہ تمام جوابات ایک ہی بار مل جائیں۔ تاکہ ایک ہی بار کارروائی کی جا سکے۔

"تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" ڈاکٹر کے لہجے میں شکست نمایاں تھی۔ یقیناً جانی نے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا۔

"سوال ہم کریں گے۔ تم صرف جواب دو گے، تفصیلی جواب۔" جانی نے کہا تو ڈاکٹر شارق نے سر ہلا دیا۔ اس نے غفران کو کہا کہ وہ سوال کرے۔ غفران نے جانی سے کہا کہ وہ کاغذ اور پنسل لے کر سوال نمبر اور اس کے جوابات لکھتا جائے۔ جس نمبر پر اس کی سوئی اٹکے ہم بغیر کچھ کہے باہر چلے جائیں گے اور اس سوال کا نمبر بتا دیں گے تاکہ ڈاکٹر اتنے ہی دنوں تک کھانے پینے سے دور رہ سکے۔ "تو شروع کریں ڈاکٹر صاحب؟"

غفران نے اس کے اثبات میں سر ہلانے پر پہلا سوال کیا۔ جبکہ جانی نے نمبر نوٹ کر لیا۔

"اپنا مکمل حدود اربع بیان کرو۔"

"میرا نام ڈاکٹر شارق ہے۔ میری بیوی اور میں یہاں ایک مکان میں رہتے ہیں۔ میرے والدین کراچی میں ہیں۔ میرا تعلق بھی کراچی سے ہے۔" ڈاکٹر نے بلا تامل کئے بتانا شروع کر دیا تھا۔ "میں وہاں بھی پرائیویٹ کلینک چلاتا تھا۔"

"کراچی کے کس علاقے میں تمہارا کلینک تھا۔" دوسرا سوال ہوا۔ تو اس سوال پر ڈاکٹر تذبذب میں پڑ گیا۔ غفران نے اس کی کیفیت دیکھ کر جانی سے کہا۔

"تمہارے پاس تمام معلومات ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ اس کے گھر سے ملنے والے کاغذات۔ اگر یہ کوئی غلط جواب دے تو فوراً اٹھ جانا۔"

"نہیں، نہیں، میں غلط جواب نہیں دوں گا۔" ڈاکٹر، غفران کے نفسیاتی داؤ میں آ گیا تھا۔ ویسے بھی وہ ڈاکٹر تھا۔ جرائم پیشہ افراد سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا اور وہ ان باریکیوں کو بھی نہ سمجھتا تھا۔ اس لیے فوراً بول پڑا۔

"میں سچ ہی بولوں گا۔ میرا کلینک ریڈ لائٹ ایریا میں تھا۔"

"پنجابی یا اردو بول۔ انگریزی مجھے سمجھ نہیں آتی۔" غفران بولا۔

"ہیرا منڈی۔"

غفران نے مختصر جواب سن کر سر ہلا دیا۔

"ایمان سے تمہارا کیا تعلق تھا؟ اسے کس نے اور کیوں قتل کیا؟" غفران بظاہر اس تمام کیس سے لاتعلق لگتا تھا۔ مگر جانی نے محسوس کیا کہ اس کے ذہن میں ایک ایک بات محفوظ ہے۔

"اس سوال کا جواب دینے کے بعد میں پہلے کھانا کھاؤں گا۔ ورنہ میں مر جاؤں گا۔" ڈاکٹر نے شرط پیش کر دی۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ وہ غفران اور جانی کے رحم و کرم پر ہے۔ ایک زوردار تھپڑ نے اس کا ہونٹ پھاڑ ڈالا تھا۔

"کتے کے بچے۔ غفران سے سودے بازی کرتا ہے۔ میں تجھے ضرور ماروں گا، لیکن بھوک سے نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی ڈب سے ریوالور نکال کر جانی کے روکتے روکتے ہی ڈاکٹر کے پاؤں کے درمیان ایک فائر داغ دیا۔ ڈاکٹر اس ناگہانی آفت سے حواس باختہ ہو گیا تھا۔

اس کا بس چلتا تو وہ کرسی سر پر اٹھا کر بھاگ جاتا، لیکن وہ دو بھیڑیوں کے نرغے میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ جبکہ اس کی دشمن تیز بھوک نے بھی اس پر حملہ کر دیا تھا۔ وہ بری

طرح کانپ رہا تھا۔ جانی نے اس کی طرف دیکھا اور پھر غفران کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ وہ کرسی پر بیٹھ کر خود کو پُرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

''پہلا اور آخری موقع دے رہا ہوں۔ طوطے کی طرح سب کچھ فرفر بک دو۔'' جانی نے ڈاکٹر سے کہا۔ وہ کانپتے ہوئے اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔

''چلو شروع ہو جاؤ۔'' غفران کی بڑھک نے اس کی رہی سہی کسر نکال دی تھی۔

''ایمان میری سوتیلی بہن تھی۔ ڈیڈی کی کافی پراپرٹی تھی۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا اور ایمان دوسری بیوی سے اکلوتی بیٹی تھی۔ ڈیڈی کی موت کے بعد اس نے اپنی ماں سے مل کر مجھے اور مما کو بلیک میل کرنا شروع کر دیا تھا۔'' ڈاکٹر کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔

''اس کی ماں ریڈ لائٹ ایریا کی نکلی۔ اس نے اپنی بچی کو بھی وہی تعلیم دی۔ میرا کلینک ان کے گھر کے پاس تھا۔ مگر اس کی نانی اور باقی اجداد تمام کے تمام ریڈ لائٹ ایریا سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈیڈی کی موت کے بعد میں لاہور آ گیا، لیکن ایمان نے میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ بھی لاہور پہنچ گئی۔ میری شادی میری پسند سے ہوئی تھی۔ ایمان نے میری بیوی کو مجھ سے متنفر کرنے کی بہت کوشش کی، لیکن میری لو میرج تھی اور پھر ثانیہ جو کہ میری بیوی کا نام ہے وہ سمجھدار اور پڑھی لکھی ہے۔ اس نے ایمان کی باتوں پر کان نہ دھرے۔ وہ ناکام ہو گئی۔

''اس نے انتقام لینے کی خاطر مجھے قتل کروانا چاہا، لیکن میرے بچ جانے پر وہ مزید حربے استعمال کرنے لگی۔ ایک دن اس کی موت کی خبر اخبارات میں پڑھ کر میں بڑا حیران ہوا، لیکن قاتل کا آج تک پتہ نہیں چل سکا۔'' وہ خاموش ہوا تو جانی نے آگے بڑھ کر اس کا گریبان پکڑ کر اسے جھٹکا دیا تو وہ کرسی سمیت پیچھے گر گیا اور چیخنے چلانے لگا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میرا یقین کرو۔ میں نے زندگی میں کبھی بھی جھوٹ نہیں بولا۔ مجھے کھانا دے دو۔ میں مر جاؤں گا۔'' وہ منتیں کر رہا تھا۔ مگر غفران نے اگلا سوال کر دیا۔

''بابا جی تجمل کون ہے؟'' جانی نے ڈاکٹر کی کرسی زور لگا کر سیدھی کی تو وہ اس سوال پر گڑبڑا گیا۔ ''اپنی گندی ذات اور ایمان کے قتل کی روداد ایک فرضی اور جھوٹی کہانی بنا کر تو مجھے سنا دی ہے تم نے۔'' غفران کے تیور ایک بار پھر خراب ہو گئے تھے۔ ''مجھے مطمئن کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ کچی گولیاں کھیل کر میں کھلاڑی نہیں بنا ہوں۔ میرا نام غفران ہے۔ اب کوئی سوال نہیں پوچھوں گا۔ تمام ماجرا من و عن بیان کر دو۔ جس میں میرے مہربان

''باس'' کا بھی کردار ہو۔'' پھر وہ جانی کی طرف مڑا۔ ''جانی بادشاہ! اب تمہاری کوئی بھی سفارش اس کی زندگی کی گارنٹی نہ دے سکے گی کیونکہ میری نماز کا بھی وقت ہونے والا ہے۔ اب گولی اس کی کھوپڑی میں روشن دان بنا کر دوسری طرف ہی نکلے گی۔'' یہ کہہ کر اس نے ایک بار پھر ریوالور نکال لیا۔ ریوالور دیکھ کر ڈاکٹر کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے تھے۔ وہ ایک بار پھر چیخنے لگا۔

''اس بار میرا یقین کرو۔ میں سچ سچ بتاؤں گا۔ مجھے میری بیوی کی قسم۔ میرا اعتبار کرو میرے ہاتھ کھول دو۔ میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑ کر اپیل کرتا ہوں۔ مجھے کھول دو۔ میں بتاتا ہوں۔ سچ سچ بتاتا ہوں۔ پلیز، میرا اعتبار کرو۔''

غفران نے جانی کی طرف دیکھا۔ تو جانی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے آگے بڑھ کر ڈاکٹر کے ہاتھوں کی رسیاں کاٹ دیں۔ کیونکہ اب وہ رسیاں کھل نہ سکتی تھیں۔ اندیشہ تھا کہ اگر مزید ایک دو گھنٹے بندھی رہیں تو کہیں کا ڈاکٹر کے خون کا دورانیہ نہ رک جائے اور رسیاں اس کی کلائیوں کے گوشت میں پیوست ہو رہی تھیں۔

ڈاکٹر نے اپنی کلائیوں کو ہاتھوں سے مسلنا شروع کر دیا۔ اس کی درد بڑھ گئی تھی۔ مگر وہ خود ڈاکٹر تھا۔ جانتا تھا کہ آہستہ آہستہ خون کی رفتار نارمل ہو جائے گی۔ وہ غفران کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔

''غفران بھائی! میں آپ کو تمام حالات و واقعات بتلا دیتا ہوں۔ مگر یہ تجمل بڑا ہی خطرناک آدمی ہے۔ میری بیوی کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ پلیز اس کی ذمہ داری لو۔''

غفران کے سامنے محبت کا ایک اور باب کھل گیا تھا۔ خود تو ڈاکٹر مجبور و بے بس اور لاچار تھا۔ مگر اپنی بیوی سے اتنی محبت کرتا تھا کہ اس کی زندگی کی گارنٹی مانگ رہا تھا۔

''تمہاری بیوی بالکل محفوظ جگہ پر ہے۔ میری زبان کا اعتبار کرو۔'' جانی نے کہا تو غفران نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''میں صرف نام کا ہی جانی نہیں ہوں۔ کام بھی جان لگا کر ہی کرتا ہوں۔ اس کی بیوی کو آج ہی ماں جی اور عصمہ بہن کے پاس چھوڑ کر آ رہا ہوں۔'' جانی نے آنکھ دبا کر کہا تو غفران بھی مسکرا دیا۔ وہ اب ڈاکٹر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جس کے چہرے پر سکون نظر آ رہا تھا۔ وہ ان پر اعتبار کرنے کے سوا کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ اسے نہ جانے کیوں یقین تھا کہ جانی سچ کہہ رہا ہے۔ اس نے پُراطمینان سانس خارج کی اور بولنا شروع ہوا۔

''میرا کلینک ریڈ لائٹ ایریا میں تھا۔ ایمان کی ماں ایک طوائف تھی۔ تجمل ایک ٹیکسی

ڈرائیور تھا۔ وہ اپنی ٹیکسی اکثر میرے کلینک کے سامنے کھڑی کرتا تھا۔ سواری کے انتظار میں وہ کافی کافی دیر میرے کلینک میں آ کر بیٹھا رہتا۔ اس سے دوستی ہوگئی۔ وہ ڈرائیونگ کے ساتھ ساتھ دلالی بھی کرتا تھا۔ ایمان کی ماں جس کا نام جانم تھا۔ وہ تجمل کے ذریعے کافی بڑے بڑے گاہک بھگتا چکی تھی۔ تجمل کی نظر اس کی بیٹی ایمان پر تھی جو کہ ابھی کالج سٹوڈنٹس تھی۔ جانم نے اپنی بیٹی کو ہارڈ کیش کے طور پر چھپایا ہوا تھا۔ وہ ہاسٹل میں ہی رہتی تھی۔ بس کبھی کبھار وہ اپنی طوائف ماں سے ملنے آ جایا کرتی تھی۔ وہ تجمل کا اچھا نہ سمجھتی تھی۔ جبھی تو وہ اسے منہ نہ لگاتی تھی۔ اس بات کی تجمل کو بہت خار تھی۔ وہ کئی بار اس بات کا شکوہ مجھ سے کر چکا تھا۔ وہ اس موقع کی تلاش میں تھا کہ جیسے ہی اس کبوتری کو اپنے جال میں پھانسنے میں کامیاب ہوگا۔ وہ اس کے پر کاٹ دے گا، لیکن جانم اس کی پلاننگ سمجھ گئی تھی۔ وہ ایمان کو اس سے بچانے کے لیے دوسرے ہاسٹل میں داخل کرا آئی اور پھر ایمان کو بھی منع کر دیا کہ وہ اس سے ملنے کبھی نہ آئے۔ بلکہ جانم خود ہی اس سے ملنے کے لیے اس کے ہاسٹل آیا کرے گی۔

وقت گزرتا گیا۔ تجمل ایک کامیاب دلال بن گیا تھا۔ اس نے بہت سے گاہکوں کے ذریعے جانم کی چاندی کروائی تھی۔ تمام بازار میں تجمل بہت مشہور اور امیر دلال تھا۔ اس کا مستقل اڈہ میرا کلینک بن گیا تھا۔ وہ مجھے بھی میرا حصہ دیتا تھا۔ میں تجمل کے ذریعے آنے والی خوبصورت لڑکیوں کا ابارشن کرتا رہتا۔ ہم انہیں بلیک میل کرنے کے لیے ان کی تصاویر بنا لیتے تھے۔ ہمارا کاروبار خوب چل نکلا تھا۔ اس بازار میں کافی عرصہ سے گھومنے والے ایک فقیر کی طرف کسی کی بھی توجہ نہ تھی۔ وہ گلیوں اور بازاروں میں بھیک مانگتا اور رات کو کبھی جانم کے کوٹھے کی سیڑھیوں پر اور کبھی میرے کلینک کے تھڑے پر سو رہتا۔ اس کا طویل عرصہ سے یہی معمول تھا، لیکن کسی کو بھی علم نہ تھا کہ وہ کون ہے۔ ایک دن ایمان اپنی ماں سے ملنے آئی تو تجمل کو بھی خبر ہوگئی۔ وہ اسے زبردستی اس کے کوٹھے سے اٹھا لایا۔ اپنی ٹیکسی میں ڈال کر تیز رفتاری سے مڑنا چاہتا تھا کہ اس فقیر کی ٹانگوں پر گاڑی چڑھ گئی۔ وہ تڑپ تڑپ کر وہیں مر گیا۔ تجمل کو اپنی پڑ گئی۔ وہ وہاں سے فرار ہوگیا۔ چونکہ کوئی مدعی نہ تھا۔ اس لیے زیادہ تگ و دو نہ کرنا پڑی۔ معاملہ کچھ دے دلا کر رفع دفع ہوگیا۔

تجمل نے اچھے گھرانوں کی لڑکیاں بھی اس دھندہ پر لگا دی تھیں، لیکن اب وہ کام کوٹھوں پر کم اور کوٹھیوں میں زیادہ کرنے لگا تھا۔ میری بھی خوب چاندی ہو رہی تھی۔ تجمل نے ایمان کا پیچھا نہ چھوڑا تھا۔ مگر سلسلہ کم ضرور ہو گیا تھا۔

پولیس والوں کو بھی ہفتہ دینا پڑتا تھا۔ مگر ان کو ہفتہ دینے کا مطلب تھا کہ ہمیں ہفتہ بھر کی آزادی مل جاتی تھی۔ کھل کر کام کرنے کے لیے ہفتہ ضروری تھا۔

ایک دن ہمارے ٹاؤٹ نے آ کر خبر سنائی کہ نیا ایس پی آیا ہے جو بہت ایماندار اور نیک ہے۔ رشوت لینا تو درکنار رشوت کا نام بھی اپنے علاقہ میں لینے والوں کو پکڑ کر اندر کر دیتا ہے، لیکن تجمل نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی اور اپنا دھندہ عروج پر رکھا۔ ایک دن ایس پی نے کامیاب چھاپہ مار کر تجمل اور کئی لڑکیوں کو گرفتار کر لیا۔

تجمل کی ملاقات جیل میں ایک خبیث سے ہوئی جو کالے علم کا ماہر تھا۔ تجمل کی خباثت اور اس کے ماضی کو دیکھتے ہوئے اس نے تجمل کو جادو کے چند الفاظ سکھا دیئے۔ جو کہ انسان کو زیر کرنے کے لیے کافی تھے۔ پورا عملہ اس کالے علم والے کا مطیع تھا، لیکن ایس پی صاحب اللہ کے نیک بندے تھے۔ ان پر اس کے جادو کا کوئی اثر نہ ہوا۔

تجمل چھ ماہ کی قید بھگت کر آیا تو اس نے مجھے تمام داستان سنا دی۔ ہم محتاط ہو کر کام کرنے لگے۔ بلکہ اب تو باقاعدہ تجمل اپنے جادو کے جوہر بھی دکھانے لگ گیا تھا۔ وہ امیر لوگوں کو اپنے جادو کے زور پر بے وقوف بناتا اور ان کی جوان بیٹیوں کی عزت سے کھیلتا تھا۔ اس نے اپنے پرانے عشق کو جگایا اور ایمان کو اپنے قابو میں کر لیا، لیکن ایمان اس کی ساتھی ضرور بن گئی تھی۔ مگر وہ شہر کراچی کی اعلیٰ یونیورسٹی کی سٹوڈنٹ تھی۔ ایک طوائف زادی ہونے کے ناطے روپیہ پیسہ اس کی کمزوری تھی۔ تجمل نے اسے بہت سے روپے ہر ہفتے دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔ ایمان اپنی کلاس فیلوز کو تجمل کے سامنے پیش کرتی تھی۔ جن کے اکثر مسائل عام سے ہوتے تھے کہ اس کی شادی فلاں سے ہو جائے۔ یا پھر اس کا چکر فلاں لڑکے کے ساتھ چل جائے وغیرہ وغیرہ۔ تجمل ان امیر زادیوں سے بہت زیادہ نوٹ کما رہا تھا اور کبھی کبھار تو ان کی عزت پر بھی ہاتھ صاف کر جاتا تھا۔ ایک دن ایک امیر زادی کا ابارشن کرتے وقت مجھ سے بڑی غلطی ہوگئی۔ میرا دھیان اس کے بعد آنے والے کیس پر تھا۔ جس سے مجھے کافی روپیہ ملنے والا تھا۔ بس اس لڑکی کے اندر زہریلا مادہ رہ جانے سے دو دن بعد اس کی موت ہوگئی۔ وہ لڑکی ایمان کے حوالے سے آئی تھی۔ تجمل اس کا گناہگار تھا۔ میں اسے موت کی وادی میں پہنچانے والا موت کا فرشتہ بن گیا تھا۔

اس کا باپ بڑی پہنچ والا آدمی تھا۔ اس نے پے در پے ہم پر چھاپوں کا سلسلہ شروع کروا دیا۔ محکمہ پولیس میں سے تجمل کے حواری اسے بتا دیتے تھے کہ آج چھاپہ پڑنا ہے۔ بنانچہ ہم اِدھر اُدھر ہو جاتے، لیکن ہمارا کام متاثر ہونے لگا۔ ایک دن ہم خفیہ طور پر جانم کے

کوٹھے پر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ اب جانم کو بھی تجمل اچھا لگنے لگتا تھا۔ ایک تو وہ بڑا بزنس مین بن گیا تھا اور دوسرا اس کے ذریعے اس کے کوٹھے پر دولت کی ریل پیل تھی اور تیسرا وہ اس کی بیٹی کا پارٹنر بھی تھا۔

جانم کا مشورہ تھا کہ وقتی طور پر کراچی شہر کو چھوڑ دیا جائے، لیکن تجمل اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔ وہ اپنا بزنس سمیٹنے کے چکر میں نہ تھا۔ کیونکہ اس کی اچھی خاصی روزی روٹی لگی ہوئی تھی، لیکن جانم کی پُر زور دلیل نے اس دلال کو قائل کر لیا کہ اگر جان بچے گی تو ساری عمر یہیں ''کھے'' کھانی ہے۔ تم تینوں کراچی چھوڑ جاؤ۔ میں اس ایس پی کا بھی کچھ کر لوں گی۔

ہم اپنے کاروبار سمیٹ کر لاہور آ گئے۔ اپنے طریقہ کار کے مطابق ایمان نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور امیر لوگوں کی لڑکیوں کو پھانسنا شروع کر دیا۔ ہمارے پاس دولت کی کمی نہ تھی۔ اچھے خاصے مکان مل گئے تھے۔ تجمل نے علیحدہ مکان لے لیا تھا۔ میں نے علیحدہ مکان خرید لیا تھا۔ اپنے کاروبار کو ایک بار پھر نقطۂ عروج پر پہنچانے کے لیے میں نے اپنا کلینک شہر کے معروف بازار میں بنایا۔ ایمان کی بدولت ہمارا کام پھر چل پڑا تھا۔ ایمان جو بھی پارٹی پھنسا کر لاتی۔ ہم اس کے تین حصہ دار ہوتے تھے۔

تجمل جب لڑکیوں کو کالے علم کے چند سیکھے ہوئے الفاظ کی بدولت مطمئن کرتا تو لڑکیاں اسے بابا جی کے نام سے پکارنے لگتیں۔ اس دھندے میں بہت آمدنی تھی۔ تجمل نے اپنا روپ بدل لیا۔ چہرے پر ہلکی سی داڑھی سجالی۔ وہ چند امیر گھرانوں کو قابو کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ایمان نے اپنی کلاس فیلوز سے میرا تعارف ایک اچھا ڈاکٹر اور تجمل کا تعارف بابا جی کے نام سے کروانا شروع کر دیا تھا۔

ملیحہ بھی ایمان کی کلاس فیلوز میں سے تھی۔ ڈاکٹر شارق کا نام اور پھر ایمان نے بتایا تھا کہ میں اس کا بھائی ہوں۔ ملیحہ اور عالیہ بیگم میرے کلینک پر کبھی کبھار آنے لگیں۔ اسی دوران شیخ عمر حیات جو کہ دولت اور امارت کے تکبر میں بندے کو بندہ نہ سمجھتا تھا۔ میرے کہنے پر عالیہ بیگم نے شیخ عمر حیات کو قائل کیا کہ وہ ایک بار بابا جی سے مل لیں تاکہ کاروبار میں مزید ترقی ہو سکے۔ ایمان بھی ملیحہ کو قائل کر چکی تھی۔ شیخ عمر حیات نے ایک ہی ملاقات تجمل سے کی تھی کہ اس نے شیخ پر اپنا سحر پھونک دیا تھا۔ شیخ تو اس کا جی جان سے تابع ہو گیا تھا۔ پھر اس نے اپنی بیوی اور بیٹی بیٹے کو بھی بابا جی کا تابع بنوا دیا۔

تجمل کے کنجروں اور بدمعاشوں نے رابطوں کی بنا پر شیخ عمر حیات کا کاروبار مزید ترقی کر گیا جبکہ شیخ یہی سمجھتا رہا کہ بابا جی کو اس کا علم نہیں ہے۔ تجمل کے رابطہ کرنے پر سنگاپور

کی ایک پارٹی نے میرے ذریعے سودا کیا۔ تجمل ایک طرف ہو کر رہ گیا تھا۔ ہم اپنے پروگرام کے مطابق یک دم تینوں ہی ننگے نہ ہونا چاہتے تھے۔ شیخ ہم پر اندھا اعتماد کرنے لگا تھا، لیکن وہ عقل کا بھی اندھا ہو گیا تھا۔ اس نے تجمل کو سجدے کرنے شروع کر دیئے۔

اس دوران غفران اور شیخ کی علیحدگی ہو گئی۔ اگر نہ بھی ہوتی تو تجمل غفران کو شیخ کی مرضی کے بغیر ہی اپنے غنڈوں اور بدمعاشوں سے کہہ کر مروا دیتا۔

لیکن اس بات کی نوبت نہ آئی تھی۔ غفران نے شیخ کو اور شیخ نے غفران کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا تھا۔ بابا جی اب شیخ کو سمجھا رہے تھے کہ وہ غفران سے راضی نامہ کر لے۔ کیونکہ وہ شیخ کا گھر کا بھیدی ہے۔ شیخ نے بابا جی کا حکم مانا اور خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔

احمد باؤ جو کہ اپنے کاروبار کو عروج پر پہنچا چکا تھا۔ وہ سرمایہ کہاں سے آ رہا تھا۔ وہ سب کچھ شیخ ہیروئن اور نشے کی لعنت سے کما رہا تھا۔ ایمان منظر سے ایک ماہ تک غائب رہنے کے بعد نظر آئی تو وہ کچھ اکھڑی اکھڑی سی لگی۔

اس نے دس لاکھ کا مطالبہ کر دیا تھا جو کہ ہمارے لیے معمولی رقم تھی، لیکن کس بات کا دس لاکھ ادا کرتے۔ ایمان ہمیں مطمئن نہ کر سکی۔ میں نے اور تجمل نے اسے ٹھکانے لگانے کا پروگرام بنا لیا۔ وہ ہمیں بلیک میل کرنے لگی تھی۔

میں نے اس کے گھر میں کافی پینے کا پروگرام بنایا اور معاملہ طے کرنے کا بھی پلان بنایا وہ مطمئن ہو گئی۔ میں نے تجمل کو تمام لائحہ عمل سمجھا دیا تھا۔ وہ اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق دس لاکھ روپے لے کر ایمان کے گھر پہنچ گیا تھا۔ میں تھوڑی دیر بعد پہنچا تھا۔ پلان کے مطابق میں نے کافی کے تین مگ بنائے۔ ایک میں زہریلی دوائی ملا دی۔ ایمان بہت ہوشیار اور چالاک تھی، لیکن وہ کافی کی بہت شوقین تھی۔ میرے پلان کے مطابق اس نے تینوں میں سے وہ کپ اٹھا لیا جو کافی سے بھرا ہوا تھا۔ بس یہی وہ لمحہ تھا۔ جب وہ اپنی چالاکی کے باوجود بھی مار گئی تھی۔ دس لاکھ روپے اس نے اپنی سکرٹ کی تنگ جھولی میں رکھے ہوئے تھے۔ تجمل اور میں اس کے سامنے بیٹھے کافی پی رہے تھے اور معاملہ طے ہو گیا تھا کہ آئندہ جو بھی پارٹی ایمان کے ریفرنس سے ہمارے جال میں پھنسے گی۔ ایمان کو دوگنا حصہ دیا جائے گا۔

لیکن یہ محض ڈرامہ تھا اور وقت گزاری کا ایک بہانہ بھی تھا۔ ایمان نے کپ ختم کیا تو اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ سمجھ گئی کہ ہم نے اس کے ساتھ کوئی سکیم کی ہے۔ وہ چیخنے چلانے لگی کہ حرامزدو۔ تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ میں سب کو بتلا دوں گی کہ تم کون

ہو؟ کیا ہو؟ میں ملیحہ کو بھی بتا دوں گی۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہ فون کی طرف لپکی مگر دوائی نے اپنا اثر دکھایا وہ لڑکھڑا کر گر گئی۔ تجمل نے اسے اٹھا کر بستر پر پٹخا۔ میں نے اس کی ٹانگیں کس کر پکڑ لیں اور تجمل نے لوہے کی تار اس کے گلے میں ڈال کر اس کا کام تمام کر ڈالا۔'' ڈاکٹر نے نے آخری الفاظ گھبرائی ہوئی آواز میں ادا کیے تھے۔ جبکہ غفران اور جانی اس کی دلچسپ سٹوری سن کر اپنے آپ کو چغد محسوس کر رہے تھے۔

''اب تو تھوڑا سا پانی پلا دو۔ غفران بھائی۔ آپ کو اپنے مرشد کا واسطہ۔'' ڈاکٹر نے رحم طلب نظروں سے غفران کی طرف دیکھا تو اس نے جانی کو اشارہ کیا کہ وہ اسے پانی پلا دے۔ ڈاکٹر نے پانی کا جگ پکڑ کر منہ سے لگا لیا اور غٹا غٹ پانی پینے لگا۔

جب وہ جی بھر کر پانی پی چکا تو غفران کے اشارے پر پھر شروع ہو گیا۔ اب اس کی طلب اچھا کھانا تھی۔ وہ جان گیا تھا کہ تمام داستان سنائے بغیر نہ کھانے کو ملے گا اور نہ ہی رہائی، اس لیے وہ دوبارہ کہنے لگا۔

''ایمان کی لاش وصول کرنے والے پولیس والوں کا بیان تھا کہ نامعلوم قاتلوں کے خلاف مقدمہ درج کر لیا گیا ہے اور لاوارث جان کر اس کی لاش امانتاً دفنا دی تھی۔ دس لاکھ تو بچ گئے تھے، لیکن مجھے اپنی جان کی فکر پڑ گئی تھی۔ اس دوران میں نے اپنی پسند سے شادی بھی کر ڈالی تھی۔ میری بیوی مجھ سے بہت محبت کرتی ہے اور میں بھی۔

تجمل عالیہ بیگم کے دل کی مرادیں پوری کرنے لگا تھا اور ایک طرف ملیحہ کو بھی ''خوش'' کر رہا تھا۔ ماں بیٹی ایک دوسرے سے چوری تجمل کی ''خدمت'' کرنے میں مگن تھیں۔ جبکہ شیخ پر جہالت اور شرک کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ تجمل نے اس کی تمام جائیداد ہتھیانے کے لیے دو چار سودے ایسے بھی کروائے تھے جن میں شیخ کو بہت فائدہ ہوا تھا۔

اور پھر اس پر الیکشن جیت کر اسمبلی میں پہنچنے کا بھوت بھی سوار ہو گیا تھا۔ وہ حاجی عبداللہ سے اپنی شکست کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ ہم اس کی بھی کوئی ترکیب نکالنے لگے۔ میں تجمل سے بُری طرح خائف ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ ایمان کو ٹھکانے لگا سکتا ہے تو میری کیا اوقات ہے لہٰذا میں اس کا ساتھ دینے کے ساتھ ساتھ اس سے جان چھڑانے کی تراکیب بھی سوچتا رہا۔ میں ہمیشہ کی طرح ہر لڑکی کے ساتھ اس کی تصاویر بناتا تھا تاکہ اس کو بلیک میل کر کے مزید روپیہ کمایا جا سکے۔ بالکل اسی طرح میں نے اس کی اور ملیحہ کی بھی تصاویر بنا لیں اور پھر اپنے ایک دوست کی مدد سے شیخ اور احمد کے ساتھ ساتھ کیمرا ٹریک کے ذریعے ان کی تصاویر بنوا کر اپنے پاس رکھ لیں تاکہ ان میں سے کوئی بھی اگر مجھے بدنام

یا بلیک میل کرنے کی کوشش کرے تو میں انہیں ان تصاویر کے ذریعے خاموش کروا سکوں۔

اسی دوران ملیحہ ماں بننے والی ہو گئی۔ میرے کلینک میں اس کا اباررشن نہ کروایا گیا۔ کیونکہ میں ان کی نظروں میں ان کا پیر بھائی تھا اور وہ اس بات کو مجھ سے تو کیا سبھی سے چھپانا چاہتے تھے۔ اس نے غفران پر الزام لگانے کی کوشش کی۔ مگر اس کے پیچھے اس کے سر پر ایک ڈاھڈے مرشد کا ہاتھ آ چکا تھا۔ وہ اپنی غلط پالیسی میں ناکام ہوئی تو اس نے گھر میں عالیہ بیگم اور شیخ کو بتا دیا کہ اس بچے کا باپ باباجی تجمل ہے۔

مگر عالیہ بیگم اور شیخ کیسے مان سکتے تھے۔ کیونکہ عالیہ بیگم کو معلوم تھا کہ تجمل سارے کا سارا اسی کا ہے۔ وہ اس کی بیٹی کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا اور پھر وہ ان کا پیر بھی تھا۔ عالیہ بیگم نے اپنا راز کھل جانے کے ڈر سے ملیحہ کو خاموش رہنے کا کہا۔ مگر اس کی یہ خاموشی اس خاندان کو مہنگی پڑی۔ اس نے خودکشی کر کے شیخ کے منہ پر خاموشی کی مہر لگا دی۔ وہ اپنے ملنے جلنے والوں کو کوئی بھی تسلی بخش جواب نہ دے سکا اور ملیحہ کی تدفین خاموشی اور جلدی میں کر دی گئی۔ شیخ عمر، تجمل پر شک نہ کر سکتا تھا۔ مگر پھر بھی تجمل کو ایسا شک محسوس ہونے لگا تھا۔ کیونکہ وہ اکیلا ہوتا تو خاموش بیٹھا رہتا تھا۔ تجمل نے سوچا کہ اگر وہ خود کہیں غائب ہوا تو شیخ کا شک اور ملیحہ کا کہا ہوا سچ ہو جائے گا۔ اس نے شیخ کو حاجی عبداللہ سے فتح دلوانے کے لیے اسمبلی کی سب سے بڑی کرسی کے خواب دکھائے اور کہا کہ وہ بھی اپنے نام کے ساتھ حاجی کا اضافہ کرے۔ تاکہ مذہب سے اس کی وابستگی دیکھ کر لوگ اسے زیادہ سے زیادہ ووٹ دیں۔ شیخ نے اپنے مرشد کا حکم مانا اور اب حج یعنی عمرہ کرنے چلا گیا ہے۔ تاکہ حاجی شیخ عمر حیات بن کر آئے اور لوگوں کو بے وقوف بنا کر ووٹ حاصل کر سکے۔

جبکہ تجمل اور عالیہ بیگم کو کھل کر ایک دوسرے کی پیری مریدی کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ شیخ چونکہ ایکسیڈنٹ ہونے کے بعد باپ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے۔ لہٰذا عالیہ بیگم اپنے دل کی تسکین اور جسم کی پیاس بجھانے کے لیے باباجی کی خدمت کر کے اس کے بچے کی ماں بننے والی ہو گئی ہے۔''

''اب مجھے کھانا کھلا دو۔ ورنہ میں مرجاؤں گا۔'' ڈاکٹر نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ تو غفران نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر زوردار طمانچوں کی بارش کر دی۔ اس بار جانی نے اسے نہ روکا تھا۔

''اسے باندھ دو جانی بادشاہ!'' غفران نے اپنا سانس درست کرتے ہوئے کہا۔

''آپ فکر نہ کریں غفران بھائی۔ یہ اب پولیس کی حراست میں رہے گا۔'' جانی نے

کہا تو غفران نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''اچھا ہے اسے تھانے مع ثبوت کے اندر کرا دو۔''

''آپ فکر نہ کریں غفران بھائی!'' جانی نے آگے بڑھ کر مزاحمت کرتے ہوئے ڈاکٹر کو ایک بار پھر باندھ دیا۔ ''یہ ایمان کا قاتل ہے اور فراڈیئے پیر کا مددگار بھی ہے۔ اس پر تو بہت سے کیس بنتے ہیں۔ بہت سی معصوم جانوں کا بھی یہ قاتل ہے۔'' جانی باہر آنے لگا تو اس کو رک جانا پڑا کیونکہ ڈاکٹر کی چیخیں بلند ہونے لگی تھیں۔

''جانی بادشاہ! اسے اس کے سرغنہ کے ساتھ ہی دفن کرنا ہے۔ اس لیے تب تک اسے کھانا کھلا دو۔'' غفران نے کہا اور سیڑھیاں چڑھ کر باہر نکل آیا۔

جانی بھی اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا۔ اس نے تہہ خانہ کے دروازے کو تالا لگا دیا تھا۔ جانی نے دیکھا کہ غفران کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ آگے بڑھ کر بولا۔

''کیا بات ہے غفران بھائی؟ آج پھر آنکھوں میں آنسو کیوں؟''

''جانی بادشاہ!'' وہ آسمان کی طرف دیکھتا ہوا بولنے لگا۔ ''شاہ جی کہتے ہیں۔ اللہ بڑا بے نیاز ہے۔ عصمہ کہتی ہے کہ اللہ بڑا بے پرواہ ہے۔ ماں جی کہتی ہے کہ وہ بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے اور تم کیا کہتے ہو جانی بادشاہ؟''

''اس رحمٰن و رحیم کی ذاتِ واحد کے بارے میں مَیں کیا کہہ سکتا ہوں؟'' جانی بھی سرور کی کیفیت میں ڈوب گیا تھا۔ وہ غفران کے بیعت ہونے کے بعد کی دلی کیفیت کا اندازہ کر سکتا تھا۔ مگر اس وقت یہ سوال اس نے کیوں کیا تھا؟

''آپ کیا کہتے ہیں۔ اس رحمٰن و رحیم کی ذاتِ بابرکت کے بارے میں؟'' جانی نے بھی اس سے سوال کر دیا تھا۔ غفران ایک بار پھر خلاؤں میں گھورنے لگا تھا۔

''او۔ بھائیا! میں تو پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ اک گورکھ دھندہ ہے۔ اب تم خود ہی سوچو کہ شیخ کتنا گناہگار ہے۔ مشرک اور مرتد ہے۔ مگر اس کی دولت اس کو اللہ کے گھر لے گئی ہے۔ نیک اور اچھے اعمال والے ویسے بیٹھے رہتے ہیں اور دولت کا حج ہو جاتا ہے۔'' اس کے لہجے میں یاسیت تھی۔

''غفران بھائی! اس کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔ اگر اس نے شیخ کو اپنے گھر میں بلایا ہے تو یہ اس کی دولت کا کمال نہیں ہے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی شامل ہے اور ضرور کچھ نہ کچھ ایسا ہونے والا ہے کہ شیخ وہاں بھی کوئی غلطی کرے گا۔'' جانی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''وہاں اگر ایک نیکی لاکھوں کروڑوں نیکیوں میں نامہ اعمال میں لکھی جاتی ہے تو وہاں پر کیا گیا گناہ اور غلطی بھی اسی تعداد سے بڑھتے ہیں۔ آپ فکر کرنے

کی بجائے شاہ جی کے پاس چلے جائیں۔ اگر ان کے پاس نہیں جانا چاہتے تو پھر گھر میں عصمہ...... میرا مطلب ہے کہ ماں جی کے پاس چلے جائیں۔ اپنے ذہن کو کھلا چھوڑ دیں۔ باقی تمام معاملات اللہ پر چھوڑ دیں۔ وہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔'' جانی نے کہا تو غفران عصمہ کے نام پر مسکرائے بنا نہ رہ سکا تھا۔

غفران مسکرا کر گھر کی طرف چل دیا جبکہ جانی اس بے وقوف ڈاکٹر کے لیے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرنے لگا۔ شیخ نے عمرہ ادا کر لیا تھا۔ وہ تو بس اپنی ذات پر حاجی کا لیبل لگوانے کے لیے آیا تھا۔ وہ اب غارِ حرا میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے وہاں کوئی نفل نہ ادا کیے۔ بلکہ اوپر سے بیٹھا نظارہ کرتا رہا۔

اس منافق کو نورانیوں نے دیکھا اور حیرت زدہ رہ گئے۔ وہ حیران تھے کہ یہ کیسا امتی ہے۔ جس نے محبوب خدا کی سنت کی پیروی نہ کی۔ کوئی بھی نوافل ادا نہ کیے تھے۔ نورانیوں نے شیخ کے چہرے پر کوئی بھی پُرنور تاثر نہ دیکھا تھا۔ وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور دعا کر رہے تھے کہ جتنی بھی جلد ہو سکے یہ اُمتی یہاں سے چلا جائے جبکہ ان کی خواہش تھی کہ محبوب خدا کے امتی ان کے مہمان بنیں، لیکن شیخ کو دیکھ کر وہ بدظن ہو گئے تھے۔

شیخ نے سوچا کہ وہ اس مقدس سرزمین پر آیا تو ہے۔ کیوں نہ اس سرزمین سے کوئی بابرکت چیز لے جائے۔ جو اس کے لیے برکت کا باعث بن سکے۔ بس اس نے یہ سوچ کر ایک چھوٹے نورانی کو اٹھا کر اپنی سائیڈ والی جیب میں ڈال لیا۔ جبکہ وہ روتا اور چلاتا رہ گیا۔ بڑے چھوٹے نورانی چیخنے چلانے لگے۔ ان کے خاندان کا ایک فرد ان سے جدا ہونے والا تھا۔ ان کی چیخ و پکار سننے والا کوئی نہ تھا۔ کوئی نہ تھا۔ جو ان کی فریاد، نالے اور آہیں سن سکتا اور سمجھ سکتا۔ آسمان بھی خاموش تماشائی بنا ہوا تھا۔ ہوا اپنی مستی میں جھوم اور گا رہی تھی، سورج اپنی تپش دکھا رہا تھا۔ چاند کے طلوع کا ابھی وقت نہ ہوا تھا۔ بس پتھروں کی بے بسی اور حسرت سے تکتی ہوئی نگاہیں قابلِ دید تھیں۔ نورانی آگے بڑھ کر اس کا دامن نہ پکڑ سکتے تھے۔ اس کے آگے ہاتھ نہ جوڑ سکتے تھے۔ اس کے پاؤں نہ پڑ سکتے تھے۔ اس کی منت سماجت کرنے کے قابل نہ تھے۔ اس کو واسطے نہ دے سکتے تھے۔ اس کی خوشامد نہ کر سکتے تھے۔ کوئی بھی لالچ یا پھر کوئی بھی انعام نہ دے سکتے تھے۔ اپنی بے بسی اور بے زبانی پر بہت رونا آ رہا تھا۔ وہ بلک رہے تھے۔ رو رہے تھے۔ تڑپ رہے تھے۔ پچھاڑیں کھا رہے تھے۔ رد کو پکار رہے تھے۔ مگر ان کی آواز ان کے ساتھیوں تک ہی جا سکتی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو حسرت و یاس کی تصویر بنے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

ننھا نورانی شیخ کی جیب میں بلک بلک کر فریاد کر رہا تھا۔ منت سماجت کر رہا تھا۔ کوئی اسے بچالے کوئی اس کی مدد کرے۔ کوئی اس کی فریاد سنے۔ مگر کوئی نہ تھا۔ وہ رو رو کر ہلکان ہو گیا۔ وہ اس جگہ سے نہ جانا چاہتا تھا۔ مگر شیخ انسان تھا۔ وہ ان پتھروں کی باتیں، فریادیں سسکیاں، تڑپنا، اور مچلنا کیسے دیکھ، سن اور سمجھ سکتا تھا۔ اس نے تو اس بابرکت پتھر کے ذریعے مزید سکھ اور مزید آرام طلب زندگی کی خواہش میں اسے قید کر لیا تھا۔ شیخ نورانیوں کو تڑپتا او روتا ہوا چھوڑ کر ایک نورانی کو لے کر جبل نور سے نیچے اترنے لگا تھا۔ جیب میں پڑے ہوئے نورانی نے رو رو کر اپنا آپ ہلکان کر لیا تھا، لیکن شیخ اس کی چیخ و پکار سے بے نیاز پہاڑ سے نیچے زمین پر پہنچ کر اپنے ملک جانے کے لیے حرم شریف کی طرف چل پڑا تھا۔ جہاں ایک ہوٹل میں اس کا سامان پڑا ہوا تھا۔ جس میں کھجوریں اور آبِ زم زم بھی تھا۔

☆======☆======☆

عصمہ، ماں جی، اسمٰعیل اور غفران خاموشی سے شاہ جی کی گفتگو سن رہے تھے۔ جو آج ان کے گھر میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ شاہ جی حسب معمول چٹائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جبکہ اسمٰعیل ان کے کندھے دبانے کے لیے آگے بڑھا تو شاہ جی نے عجیب سے انداز میں اسے منع کر دیا تھا۔ وہ خاموشی سے آ کر شاہ جی کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔ کیونکہ شاہ جی نے کبھی بھی اسے دبانے سے منع نہ کیا تھا۔ ماں جی بھی حیران تھیں۔

''نذیراں!'' وہ ماں جی سے مخاطب ہوئے۔ ماں جی ہمہ تن گوش ہو گئیں۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے بیٹے کو سیدھی راہ پر چلا دیا ہے۔ بہت سے کٹھن مراحل اس نے طے کر لیے ہیں۔'' وہ کہہ رہے تھے جبکہ غفران کا سر حیا سے جھکتا جا رہا تھا۔

''اب اس کی شادی بھی کر ڈالو'' غفران نے چونک کر سر اٹھایا۔ شاہ جی مسکرا رہے تھے۔ جبکہ عصمہ لال گلابی ہو رہی تھی۔ شرم و حیا کی سرخی نے اسے مزید خوبصورت کر دیا تھا۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔ غفران نے بھی سر جھکا لیا تھا۔ ماں جی تو پہلے ہی شاہ جی کا حکم سر آنکھوں پر لیتی تھیں۔

''مدینے والے کا بلاوا آ گیا ہے۔'' وہ پھر گویا ہوئے، لیکن اس وقت ان کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''غفران میاں! تیاری کرو۔ مدینے والے نے ایک اہم ذمہ داری کے لیے تمہیں چن لیا ہے۔''

شاہ جی نے کہا تھا کہ غفران کی آنکھوں نے ساون کی جھڑی لگا دی۔ وہ پہلے تو سسکیاں بھرتا رہا مگر جب برداشت نہ ہوا تو ہچکیاں لے کر رونے لگا۔ ماں جی اس کے پیچھے بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ اس کی پیٹھ تھپتھپانے لگیں۔ شاہ جی پھر گویا ہوئے۔

''اوپر والا تو تجھ پر بڑا مہربان ہے۔ وہ سچ کہتا ہے۔ اگر کوئی اس کی طرف ایک قدم بڑھائے تو وہ دس بار رحمت سے اس بندے کی طرف بڑھتا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ نماز پڑھو، زکوٰۃ دو، نیکی کرو۔ اللہ کو اچھا قرض دو۔ تم نے نماز پڑھنی تو شروع کر دی ہے۔ نیکی بھی تم کر رہے ہو۔ اللہ تعالیٰ کو تمہارا قرض پسند آ گیا ہے۔ اب وہ تمہارا قرض اتارنے کے لیے تمہیں اپنے مقدس در اور اپنے محبوب کے مقدس روضۂ اقدس کی حاضری کے لیے پکار رہا ہے۔ بس کچھ انتظار کرو۔'' شاہ جی خاموش ہوئے تو اسمٰعیل کی سسکیاں ابھرنے لگیں۔ سب اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

''کیوں رو رہے ہو؟'' شاہ جی نے پوچھا۔

''مجھ سے کوئی غلطی یا خطا ہو گئی ہے۔ مجھے معاف کر دیں شاہ جی۔'' وہ رونے لگا۔

''کوئی خطا نہیں ہوئی ہے۔ بس آج سے تم آزاد ہو اسمٰعیل۔'' شاہ جی نے کہا تو وہ اونچی آواز میں رونے لگا۔

''میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ شاہ جی۔ میں اسی در پر مرنا چاہتا ہوں۔ مجھے خود سے جدا مت کریں۔ یہ میری درخواست ہے۔'' یہ کہہ کر وہ شاہ جی کے پاؤں پڑ گیا۔

''مجھے گناہگار مت کرو اسمٰعیل!'' انہوں نے اپنے پاؤں سمیٹ لیے تھے۔

''تمہارا اور میرا اتنا ہی ساتھ تھا۔ جس کا جتنا ساتھ ہو، وہ اتنا ہی سفر کرتا ہے۔ اپنے ساتھی کو کبھی راستے میں تنگ نہ کرنے والے کو اس کا ساتھی ہمیشہ یاد رکھتا ہے۔ اپنے ذہن میں اپنے دل میں اور اپنی دعاؤں میں۔ بس تم نے میرا ساتھ دیا۔ جتنا تقدیر نے لکھا تھا۔ مجھے تم سے کوئی شکایت کوئی گلہ نہیں ہے۔ میرا خدا گواہ ہے کہ میں سچ کہہ رہا ہوں'' شاہ جی کی آواز بھی بھرا گئی تھی۔ شاید وہ بھی اسمٰعیل کے عادی ہو گئے تھے۔ مگر ان کی جدائی کی وجہ باقی لوگوں کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔

عصمہ، ماں جی اور غفران حیرانگی سے ان دونوں کی گفتگو سن رہے تھے۔ ان میں سے کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کوئی سوال کر کے گناہ کا مرتکب ہوتا۔

''آج سے تیس بتیس سال پہلے جب تم میرے پاس آئے تھے۔'' شاہ جی نے اسمٰعیل کو ٹھا کر اپنے سامنے بٹھایا۔ وہ روتی ہوئی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا تھا'' تم کیا تھے۔ یہ میں

جانتا ہوں۔ یا پھر نذیراں اور امیر علی جانتے ہیں۔ امیر علی تو اللہ کو پیارا ہو چکا ہے۔ مگر نذیراں تمہاری حقیقت سے واقف ہے۔ ان بچوں کو بتلاؤ اسمٰعیل تم کیا تھے۔ اب کیا ہو اور پھر آگے میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم پھر کیا بنو گے؟'' شاہ جی نے اس سے کہا تو وہ چونکے بغیر نہ رہ سکا تھا۔ جبکہ غفران اور عصمہ کے لیے شاہ جی کی باتیں نہ سمجھ میں آنے والی باتیں تھیں۔

وہ حیرانگی سے کبھی شاہ جی اور کبھی اسمٰعیل کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ''میں ایک جن زادہ ہوں۔'' اسمٰعیل کے منہ سے یہ الفاظ نکلے تھے کہ غفران اور عصمہ ٹھٹک کر رہ گئے تھے۔ بلکہ عصمہ کو تو خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ غفران کی بھی ایسی ہی حالت تھی، لیکن وہ اپنی جگہ پر جم کو بیٹھے رہے۔ کیونکہ شاہ جی کا ساتھ تھا اور پھر اسمٰعیل بھی ان کا مرید تھا۔ کسی بھی طرف سے کوئی نقصان کا اندیشہ نہ تھا۔ وہ اسمٰعیل کی طرف متوجہ ہوئے جو کہہ رہا تھا۔

''میں ایک جن زادہ ہوں۔ الحمدللہ اب مسلمان ہوں پہلے میں غیر مسلم تھا۔ میں اپنے خاندان کے ساتھ پرواز کرتا ہوا جا رہا تھا کہ میری نگاہ ایک ایسے گھرانے پر پڑی۔ جس کے صحن میں بہت سے لوگ جمع تھے۔ میں کچھ دیر وہاں ٹھہر گیا۔ میرا قبیلہ مجھ سے بہت آگے چلا گیا تھا۔ فاصلے ہمارے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ ہم پلک جھپکنے میں کہیں بھی پہنچ جاتے ہیں۔ میں اس حویلی کی کچی دیوار پر بیٹھ کر اندر کا نظارہ کرنے لگا۔ مجھے وہ سماں وہ لمحہ بہت پیارا لگا تھا۔ میرے اندر سے کسی نے میرا اپنا آپ چھین لیا تھا۔ لوگ قرآنی آیات کا ورد کر رہے تھے۔ ہاتھوں میں قرآن کریم پکڑے ہوئے لوگ اس مقدس کتاب کی تلاوت کر رہے تھے۔ میرا دل پسیج گیا۔ میں بھی ان میں شامل ہونے کے لیے بے چین ہو گیا۔ میں نے اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انسان کا روپ دھارا اور گلی کے راستے حویلی کے بڑے دروازے سے اندر داخل ہو کر ان لوگوں میں بیٹھ گیا۔ اچانک حویلی کے اندرونی دروازے سے ایک وجیہہ شکل قابل رشک صحت کا مالک شخص برآمد ہوا۔ لوگ ہاتھوں میں قرآن کریم کو پکڑ کر اس شخص کی تعظیم کو کھڑے ہو گئے۔ لوگ فرداً فرداً اس سے ہاتھ ملانے لگے۔ میں بھی باری آنے پر ہاتھ ملانے کے لیے آگے بڑھا تو اس عظیم شخص نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنا منہ میرے کان کے قریب کرتے ہوئے کہا۔ ''اب تو آ گئے ہو اگر دوبارہ نظر آئے تو پکڑ کر بوتل میں بند کر دوں گا۔ خاموشی سے چلے جاؤ۔'' اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں حیران و پریشان حویلی سے باہر آ گیا۔ اپنے روپ میں واپس آ کر میں پھر حویلی کی دیوار پر جا بیٹھا اور وہاں سے اس مرد قلندر کی شان کا نظارہ کرنے لگا۔

میں حیران تھا کہ اتنے بڑے ہجوم میں سے میری شناخت کرنے والا یہ کوئی معمولی بندہ نہ ہو گا۔ ان لوگوں نے وہاں سے ایک طرف چلنا شروع کر دیا۔ لوگ اس مرد قلندر کے پیچھے

پیچھے ہاتھ باندھے چل رہے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ مل جل کر چلنے لگا۔ ایک دربار پر پہنچنے کے بعد لوگ قطار در قطار بیٹھ گئے۔ وہ عظیم مرد بھی ان کے درمیان زمین پر بیٹھ گیا۔ میں پہلی بار دیکھ رہا تھا کہ لوگ جس شخص کی تعظیم کر رہے تھے۔ وہ خود کو ان سے منفرد اور اعلیٰ رکھنے کے لیے تکبر یا غرور نام کی چیز کو اپنے پاس بھی نہ بھٹکنے دے رہا تھا۔

مجھے وہاں کا پرسکون ماحول بہت پسند آیا۔ میں اس مرد قلندر کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ ختم شریف کے بعد دعا مانگی گئی۔ میں نے بھی ان کی دیکھا دیکھی ہاتھ اٹھا لیے۔ بس اللہ تعالیٰ نے اسی لمحہ میرے دل میں اسلام کی ایک ننھی سی کرن روشن کر دی۔ میں اس مذہب سے بہت متاثر ہوا۔ ختم شریف ختم ہونے کے بعد عام لوگ واپس اسی حویلی کی طرف چلے گئے۔ جبکہ میں واپس اپنے قبیلے میں جا ملا۔ اس دن سے میرا دل اچاٹ رہنے لگا۔ میں اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ان الفاظ کو دھرانے کی کوشش کرنے لگا جو لوگ قرآن کریم میں سے پڑھ رہے تھے، لیکن میں اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔

میرا جب بھی دل چاہتا میں اس حویلی کی منڈیر پر بیٹھ جاتا۔ کبھی کسی روپ میں اور کبھی کسی روپ میں۔ مگر آفرین صد آفرین کہ ہر بار وہ عظیم شخص مجھے میرے اصلی نام سے پکار کر کہتا کہ چلے جاؤ۔ دوبارہ مت آنا۔ میں وقتی طور پر وہاں سے ہٹ جاتا۔

مگر جو کچھ میں نے اس شخص میں دیکھا، وہ مجھے متاثر کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کی آنکھوں کا آپریشن ہوا تو وضو کرنے سے ڈاکٹرز نے منع کر دیا۔ مگر اس عظیم شخص کی عظمت کے صدقے اس نے اپنے رب کی حمد و ثناء نہ ترک کی، بلکہ مٹی سے تیمم کر کے نماز باقاعدگی سے ادا کی۔

پھر ایک دن میں نے ایک شخص کو ان کے ہاتھوں پر بیعت ہوتے ہوئے دیکھا۔ میں حیران تھا کہ یہ ہاتھوں میں ہاتھ لیے کیا کر رہے ہیں۔ کیا پڑھ رہے ہیں۔ میرا بھی دل چاہا کہ میرے ہاتھ بھی اس مرد قلندر کے ہاتھوں میں جائیں۔ میں بھی بیعت ہو جاؤں بس میں نے ارادہ کر لیا، لیکن میرے فیصلے اور ارادوں کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔ میرا مذہب میری بیعت کی راہ میں رکاوٹ تھا۔

میرے قبیلے کو پتہ چلا کہ میں مسلمان ہونے والا ہوں تو انہوں نے اس مرد عظیم کے گھر پر ہلہ بول دیا۔ میرے روکنے اور منع کرنے کے باوجود بھی وہ باز نہ آئے۔ تو مرد قلندر نے انہیں پہلے پہل تو پیار سے سمجھایا۔ مگر ان کی سمجھ میں نہ آنے پر اس عظیم مرد نے ان کے گرد نوری علم کا حصار تان دیا۔ وہ مقابلہ نہ کر سکے۔ بس چیختے ہوئے بھاگ گئے۔

تمام قبیلہ نے میرا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ میں دربار شریف پر اس مرد قلندر کا انتظار کرنے

لگا۔ اس احاطہ میں جو قبر شریف تھی۔ وہ مرد قلندر کے والد صاحب کی تھی۔ میں اس قبر کے پاؤں کی طرف کھڑا ہوا کر روتا رہتا۔

ایک دن گاڑی آ کر رکی۔ اس میں سے ایک مرد جس نے اچھا لباس پہنا ہوا تھا۔ وہ اترا اور پچھلی سیٹ پر سے ایک عورت جس کا لباس بتاتا تھا کہ وہ نوکرانی ہے۔ دونوں چلتے ہوئے دربار کے احاطہ میں داخل ہوئے۔

عورت کی آنکھوں سے حیاء اور شرم کے چشمے پھوٹ رہے تھے۔ جبکہ مرد بھی سادہ لوح تھا۔ انہوں نے مجھے روتا دیکھ کر مجھ سے میرا معاملہ پوچھا تو میں جو کہ انسانی روپ میں تھا۔ ان سے شاہ جی جو کہ مرد قلندر تھے کے ہاتھوں پر بیعت ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ مجھ سے وعدہ کر کے چلے گئے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ عورت کا نام نذیراں اور مرد کا نام امیر علی ہے۔ امیر علی کے گھر نذیراں کام کرتی تھی۔ جبکہ دونوں ہی شاہ جی کے مریدین تھے۔ شاہ جی سے بات کرنے پر انہوں نے بتایا کہ میں انسان نہیں ہوں۔ جن زادہ ہوں۔ وہ بہت حیران ہوئے لیکن میرا رونا دیکھ کر انہیں بہت ترس آ رہا تھا۔ وہ بار بار شاہ جی سے مجھے بیعت کرنے کا کہنے لگے۔ میں بھی امیر علی اور نذیراں کے گھروں میں جا جا کر اپنا رونا روتا۔ میں نے انہیں بتایا کہ قبیلے والوں نے مجھے نکال دیا ہے۔ اب میں اسی در کی چوکھٹ پر مرنا چاہتا ہوں۔

پھر ایک دن میرا رونا کام آ گیا۔ صاحب قبر جو کہ شاہ جی کے والد صاحب تھے۔ انہوں نے شاہ جی کو خواب میں زیارت کروائی اور مجھے بیعت کرنے کا کہا۔

شاہ جی، امیر علی اور نذیراں کی موجودگی میں میں نے شاہ جی کے ہاتھوں پر اسلام قبول کیا۔ ان کی بیعت حاصل کی اور مسلمان ہو گیا۔ میرا پرانا نام ''رمشات'' تھا، لیکن شاہ جی نے میرا نام مسلمان ہونے کی حیثیت سے محمد اسمٰعیل رکھا۔

میں دن رات شاہ جی کی خدمت میں مصروف ہو گیا۔ ان کی محبت اور خدا کے بلاوے سے میں نے حج بھی کر لیا۔ مگر مجھے آج تک وہ منظر نہیں بھول سکا جو مدینے شریف کے گنبد خضریٰ کا تجلی سے بھرپور منظر ہے۔ میں آج بھی وہ لمحہ یاد کرتا ہوں تو میری آنکھیں بھر آتی ہیں اور میں الفاظ میں وہ منظر بیان نہیں کر سکتا۔ تب سے لے کر اب تک میں اسی روپ میں ہوں۔

مگر آج شاہ جی کی باتیں میرا دل رُلا رہی ہیں۔ میں کہاں جاؤں گا۔ میرا کون ہے؟'' یہ کہہ اسمٰعیل رونے لگا۔ غفران اور ماں جی عصمہ بھی بہت متاثر تھیں۔ عصمہ کو یاد آ گیا کہ بازار میں جب لڑکوں نے اس سے چھیڑ خانی کی تھی تو اسمٰعیل نے اس کی عزت بچائی تھی اور ایک فولادی وجود والے کا بازو بھی کندھے سے اکھیڑ دیا تھا۔ جو یقیناً کسی انسان کا کارنامہ نہ تھا۔

''ان سے اچھی طرح مل لو اسمٰعیل، اب تمہارے جانے کا وقت آ گیا ہے۔'' شاہ جی نے کہا تو وہ حسرت و یاس سے ماں جی کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے وہ ایک بار پھر اس کی سفارش کریں گی۔ مگر انہوں نے نظریں جھکا لی تھیں۔

''تمہیں اس سے بھی بہتر اور اچھی جگہ پر بھیج رہا ہوں۔ یوں سمجھ لو کہ رب تعالیٰ نے تمہیں چنا ہے اس نیک کام کے لیے۔'' شاہ جی کی آواز نے اسمٰعیل کے ضبط کے تمام بندھن توڑ دیئے تھے۔ وہ بچوں کی طرح بلکنے لگا۔

''کیا میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ رب کریم مجھے کسی کام کے لیے چن لے؟''

''غفران میاں! شادی کی تیاری کرو۔ عنقریب تمہاری شادی، عصمہ بیٹی سے ہو گی۔'' شاہ جی نے کہا تو دونوں کے دلوں کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ عصمہ اور غفران کے دل کی آواز اللہ تعالیٰ نے سن لی تھی۔

شاہ جی اٹھ کھڑے ہوئے تو باقی افراد بھی کھڑے ہو گئے۔ ان کے اشارے پر اسمٰعیل نے ماں جی اور عصمہ کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور روتے ہوئے اس نے غفران کو گلے لگایا۔ غفران کو یہ احساس بھی نہ ہوا کہ وہ ایک انسان سے نہیں بلکہ ایک جن سے گلے مل رہا ہے۔ وہ اسمٰعیل کی داستان سن کر بہت مغموم ہو گیا تھا۔

شاہ جی کے پیچھے پیچھے وہ بھی ہاتھ باندھے باہر نکل گیا۔ ان تینوں کو اداس اور مغموم چھوڑ کر۔ اب زندگی میں اُس سے ملاقات ممکن نہ تھی۔ کیونکہ شاہ جی اسے نامعلوم منزل کی طرف بھیج رہے تھے۔

عصمہ نے غفران کو دیکھتے ہی نگاہیں جھکا لی تھیں۔ جبکہ غفران اسے ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا۔ ماں جی نے دونوں کی طرف دیکھا اور کھنکار کر غفران کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ''اس معصوم کو نظروں ہی نظروں میں کھانے کا ارادہ ہے کیا؟''

عصمہ ماں جی کی بات سن کر اندر چلی گئی۔ جبکہ غفران شرمندہ سا ہو کر باہر نکل گیا اور ماں جی کی نگاہیں اظہارِ تشکر سے بھر آئیں۔ وہ آسمان کی طرف دیکھنے لگیں۔ جیسے پروردگار کا شکر ادا کر رہی ہوں۔

☆======☆======☆

شاہ جی نے اسمٰعیل کو سمجھا دیا تھا کہ اب وہ یہاں سے کہاں جائے گا۔ وہ سر جھکا کر ان کی باتیں سنتا رہا۔ وقتِ رخصت اس کی آنکھیں چھلک رہی تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر عقیدت سے اپنا سر شاہ جی کی گود میں رکھے روتا رہا تھا اور آج اس نے تیس بتیس سالوں کی دھوپ چھاؤں کا حساب لگایا تو اس حویلی کی ایک ایک اینٹ سے اس کو عقیدت ہوگئی تھی۔ وہ دیوار جس سے شاہ جی ٹیک لگا کر بیٹھا کرتے تھے۔ اسمٰعیل کو اپنی طرف بلا رہی تھی۔

حویلی کے صحن میں لگا ہوا سکھ چین کا بوٹا بھی اسمٰعیل کو الوداع کہہ رہا تھا۔ اس نے حسرت بھری نظروں سے ہر اک چیز کو دیکھا اور شاہ جی کے ہاتھوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے گرم گرم آنسوؤں کی حدت نے شاہ جی کو بھی رلا دیا تھا۔

''اسمٰعیل جلد از جلد رخصت ہو جاؤ۔ وقت بہت کم ہے۔ جذباتی مت بنو۔'' یہ کہہ کر انہوں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اسمٰعیل نے متورم آنکھوں سے مرشد سرکار کی طرف دیکھا جن کا وجود ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ وہ یقیناً رو رہے تھے۔

اسمٰعیل نے حویلی کے بیرونی دروازے کی چوکھٹ کو عقیدت و احترام سے بوسہ دیا اور ایک الوداعی نظر اپنے مرشد خانہ پر ڈال کر مرشد سرکار کو سلام کر کے اوجھل ہو گیا۔ شاہ جی نے مڑ کر دیکھا۔ ان کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔

انہوں نے محسوس کیا کہ انہیں بخار ہو رہا ہے۔ وہ اندر کی طرف چلے گئے اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔ انہیں اسمٰعیل کے ساتھ گزارا ہوا ایک ایک دن اور ہر لمحہ یاد آنے لگا تھا۔ بخار نے بخاری بابا پر قربان ہونا شروع کر دیا تھا۔ شاہ جی کی آنکھیں تیز بخار سے بند ہونے لگیں۔ پھر ان کا رابطہ اس جگہ پر ہو گیا جہاں اسمٰعیل نے جانا تھا۔ اسمٰعیل بخیریت اپنی منزل پر پہنچ گیا تھا۔

انہوں نے کہا۔ ''کیا یہ جگہ میری پکی حویلی سے بہتر نہیں ہے؟''

شاہ جی نے اسمٰعیل کو چونکتے ہوئے دیکھا۔ اس نے مرشد کی آواز ہزاروں میل دور بھی سن لی تھی۔ بلکہ پہچان بھی لی تھی۔ وہ حیرت زدہ تھا۔ مگر شاہ جی نے دیکھا کہ اس کی

آنکھوں میں آنسو تھے جو تھم نہ رہے تھے۔ شاہ جی نے اپنی آنکھیں بمشکل کھولیں اور رب تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اس کے حکم کی تکمیل بروقت کر سکے تھے۔

☆======☆======☆

شیخ نے بڑی خوشی خوشی اپنے ملک کی سرزمین پر قدم رکھا تھا، لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ ائیر پورٹ پر کوئی بھی اسے لینے نہ آیا تھا۔ وہ انتظار کر کر کے خود ہی ٹیکسی سے گھر چلا گیا۔ گھر پہنچنے پر چوکیدار نے گیٹ کھول کر اسے سلام کیا۔ اس کے ساتھ آنے والا سامان ملازم نے ٹیکسی سے اتارا۔

شیخ کو عجیب سا سکوت طاری ملا۔ وہ حیران تھا کہ نہ عالیہ بیگم نے آگے بڑھ کر اس کا کوئی استقبال کیا ہے اور نہ ہی احمد باؤ اسے ائیر پورٹ پر لینے آیا ہے۔ گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ مگر گھر پر سکوت اور ہولناک اداسی چھائی ہوئی تھی۔

وہ ایک ایک کمرا دیکھ رہا تھا۔ اسے کوئی بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ وہ اوپر والی منزل پر ملیحہ کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ جس دن سے ملیحہ کی موت ہوئی تھی وہ اس کمرے میں کبھی بھی نہ آیا تھا، لیکن آج اس کا تجسس اسے کھینچ لایا تھا۔

اس نے دروازہ کھولنا چاہا تو وہ خلافِ توقع اسے کچھ کھلا ہوا ملا۔ اس نے اندر جھانکنے کی تو جرأت کر لی۔ مگر آنکھیں اور دماغ وہیں رہ گیا تھا اور وہ خود پیچھے ہٹ گیا تھا۔ عمرہ کی ادائیگی سے واپس آتے ہی اسے جو خوبصورت تحفہ ملا تھا۔ وہ یقیناً اس کی غیرت کے منہ پر زوردار طمانچہ تھا۔

عالیہ بیگم پوری جان سے اپنے مرشد کی ''خدمت'' میں مصروف تھی۔ یہ منظر شیخ کی غیرت جگانے کے لیے کافی تھا، لیکن اس کے دل کی تیز ہوتی ہوئی دھڑکن نے خود پر قابو نہ پایا۔ وہ اپنے ماؤف ہوتے ہوئے ذہن کو قابو نہ رکھ سکا۔ اس کے کانوں میں گونجنے والی عالیہ بیگم کی سسکاریاں اور بابا جی کے نشاط انگیز الفاظ گونجنے لگے تھے۔ وہ مردہ دلی سے سیڑھیاں اترا۔ ملازم اس کے لیے پانی کا گلاس لیے کھڑا تھا۔ مگر شیخ خود پر قابو نہ پا سکا اور دھڑام سے صوفے پر گر گیا۔ اس کا رنگ نیلا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ملازم کی چیخ و پکار سن کر عالیہ بیگم اپنی ابتر حالت کے ساتھ ہی بھاگی ہوئی آئی تو ملازم نے شرم سے نگاہیں جھکا لی تھیں۔ بابا جی بھی اپنے لباس کی سلوٹیں درست کرتے ہوئے سیڑھیاں اترتے ہوئے آ رہے تھے۔ اس کے چہرے پر خباثت کی جھلک نمایاں تھی۔

ملازم نے جلدی جلدی ایمبولینس کے لیے فون کیا۔ تب تک عالیہ بیگم نے اپنی

حالت پر قابو پالیا تھا۔

شیخ کو قریبی ہسپتال لے جایا گیا تھا۔ ایمرجنسی میں اس کی نگہداشت شروع ہو گئی تھی۔ ڈاکٹروں کی ٹیم بڑی تندہی سے فرض شناسی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ بالآخر تین گھنٹوں کی مسلسل جدوجہد کے بعد انہوں نے شیخ کو وارڈ میں شفٹ کر دیا تھا۔ وارڈ بھی پرائیویٹ تھا۔ جس میں شیخ جیسے امیر لوگ ہی مریض تھے۔ ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ شیخ صاحب کو کوئی زبردست صدمہ پہنچا ہے۔ جوان کے لیے اٹیک کا باعث بن گیا ہے۔ تاحال بے ہوش شیخ کو آکسیجن لگائی گئی تھی، لیکن بقول ڈاکٹر اس کی حالت اب خطرے سے باہر تھی۔ عالیہ بیگم کو طرح طرح کے وسوسوں نے گھیر رکھا تھا۔ کیا شیخ نے اسے مرشد کی ''خدمت'' کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ یا پھر وہ سفر کی صعوبتیں برداشت نہ کر سکا تھا۔ عالیہ بیگم کو بابا جی نے اتنا مدہوش کر دیا تھا کہ اسے واپسی کی تاریخ ہی یاد نہ تھی اسے تو بس یہ پتہ تھا کہ اس کا شوہر گھر پر نہیں ہے۔ بس عیش کر لو!

تجمل بھی کئی دنوں سے پریشان تھا۔ وہ ڈاکٹر شارق کے گھر کے کئی چکر لگا چکا تھا۔ مگر ڈاکٹر سے کوئی رابطہ نہ ہوا۔ نہ ہی اس کی بیوی کا کوئی پتہ تھا۔ گھر میں پڑا ہوا تالا اس کا منہ چڑاتا تھا۔ وہ کبھی کبھار دوسرے مریدوں کے گھر بھی چلا جاتا تھا۔ احمد باؤ نے ہیروئن پینا شروع کر دی تھی۔ اسے اس نشے کی لت میں کس نے ڈالا تھا، کسی کو علم نہ تھا۔ وہ اپنے ہوش وحواس سے بیگانہ ہو کر دفتر میں پڑا رہتا تھا۔ اسے عصمہ کا غم ہی لے بیٹھا تھا۔

تجمل کو یہ سٹرونگ پارٹی ہاتھوں سے نکلتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ڈاکٹر پر پیچ وتاب کھا رہا تھا۔ کیونکہ ایمان کو ٹھکانے لگانے کے بعد ڈاکٹر ہی اس کا پارٹنر اور رازدار تھا۔ اس نے انجانے خدشے کے تحت خود کو روپوش کرنے کی سوچی۔ مگر پھر اس کا ذہن اپنے ایک خاص مرید جانی کی طرف گھوم گیا۔

اس نے جانی کو کئی بار اپنے گھر بلانے کا کہا تھا۔ مگر ہر بار جانی اسے ٹال جاتا تھا، لیکن تجمل کو کیا خبر تھی کہ اس کی موت ہی اسے گھیر کر جانی کے پاس لے جا رہی ہے۔ اس نے فی الحال جانی سے رابطہ کرنے کا سوچا، لیکن اسے یاد آیا کہ اس کا تو کوئی بھی فون نمبر یا کوئی رابطہ نمبر اس کے پاس نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ جانی کے متعلق کسی شک میں مبتلا ہوتا۔ ہسپتال کے ویٹنگ لاؤنج میں چار پانچ سپاہی اور پھر ان کے ساتھ ایک اے ایس آئی بھی داخل ہوئے۔ تجمل نے انہیں دیکھ کر کوئی اہمیت نہ دی تھی، لیکن اے ایس آئی نے آ کر ایک کانسٹیبل کو کہا کہ تجمل کو ہتھکڑی لگا لے۔

حیران پریشان تجمل نے بھاگنے کی کوئی بھی کوشش نہ کی۔ کیونکہ اس کی نظر میں وہ بے گناہ تھا اور پھر اس کے اپنے چاہنے والے بھی بہت سے تھے۔ جو محکمہ پولیس میں اعلیٰ پوسٹوں پر تھے۔ اس سے پہلے کہ سپاہی تجمل کو ہتھکڑی لگاتا وارڈ سے عالیہ بیگم نکلی۔

وہ پولیس والوں کو بابا جی کے گرد دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ وہ جلدی جلدی آگے بڑھی۔ تو اے ایس آئی جو عالیہ بیگم کو شیخ عمر حیات کو بیگم کی حیثیت سے جانتا تھا۔ وہ بولا۔

''بیگم صاحبہ آپ! یہاں کیا کر رہی ہیں؟''

''اور تم جو کر رہے ہو۔ یہ کیا کر رہے ہو؟'' عالیہ بیگم نے اس کے سوال کا جواب نہ دیا تھا۔ بلکہ الٹا سوال کر دیا تھا۔

''ہمیں اوپر سے حکم ملا ہے کہ اس فراڈیے اور ڈھونگی شخص کو گرفتار کیا جائے۔'' اے ایس آئی نے تجمل کی طرف اشارہ کر کے کہا تو عالیہ بیگم پر جادو سر چڑھ کر بولنے والا محاورہ درست ہو گیا۔ وہ غصے سے لال بھبھوکا ہو گئی۔

''تمہیں معلوم ہے کہ کس کے بارے میں کیا الفاظ بک رہے ہو؟ یہ میرے مرشد ہیں۔ تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو گی۔'' وہ خاموش ہو گئی تو اے ایس آئی تذبذب کا شکار نظر آیا۔ وہ دوبارہ بولیں۔

''اوپر سے کس کی اتنی جرأت ہوئی ہے کہ میرے گھرانے کے خلاف حکم جاری کر سکے۔ ابھی بات کرتی ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر استقبالیہ کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی۔ جبکہ پولیس والوں کو اپنی وردیوں کی فکریں پڑ گئیں۔ اے ایس آئی جانتا تھا کہ شیخ عمر حیات کے تعلقات کس نوعیت کے ہیں اور پھر ان کی بیگم نے تو اپنے ذاتی تعلقات بھی بنا رکھے تھے۔ اتنی دیر میں عالیہ بیگم نے فون کر دیا تھا اور اب اے ایس آئی کو اشارے سے اپنے پاس بلایا تھا۔ وہ دل سے کانپتا ہوا فون کے پاس پہنچا دوسری طرف سے اسے جو کچھ کہا گیا۔ وہ کافی تھا کہ وہ عالیہ بیگم سے معذرت کرتا۔ اس نے ڈھیلے انداز میں ریسیور کریڈل پر رکھا اور عالیہ بیگم سے معافی مانگنے لگا۔

''مجھ سے نہیں۔ میرے بابا جی سے معذرت کرو۔'' نیا حکم سن کر اے ایس آئی کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ ''مرتا کیا نہ کرتا'' کے مصداق وہ بابا جی کے پاس پہنچا اور اپنی ڈیوٹی اور اوپر کے حکم کو غلط فہمی قرار دے کر معافی مانگی اور بددل سا ہو کر سپاہیوں سمیت ہسپتال سے نکل گیا۔

ہسپتال کا عملہ یہ تماشا دیکھ کر بھونچکا رہ گیا تھا۔ عالیہ بیگم کی قدر ان کی نظروں میں مزید

بڑھ گئی تھی۔

''آپ گھر جا کر آرام کریں۔ میں آتی ہوں۔'' وہ بابا جی سے مخاطب تھی۔ لہجہ باادب ہی تھا۔ تجمل نے جان بچ جانے پر شکر ادا کیا اور سر ہلاتا ہوا ڈرائیور کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی طرف چل پڑا۔ وہ عجیب سے مخمصے کا شکار لگ رہا تھا۔ شیخ کا ہارٹ اٹیک اور پھر پولیس کا اسے گرفتار کرنے آنا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔

وہ ڈاکٹر شارق کو صلواتیں سنانے لگا تھا۔ وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ اس لمحہ تجمل کو اس کی سخت ضرورت تھی۔ مگر ڈاکٹر گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب تھا۔ کہیں وہ دھوکا تو نہیں کر گیا، لیکن تمام دولت اور روپیہ پیسہ تو اس وقت ان کے پلان کے مطابق شیخ عمر حیات کے گھر میں بنے ہوئے آستانے میں ایک الماری میں موجود تھا جس کی چابیاں تجمل کے پاس تھیں۔

اس نے اپنی جیب تھپتھپا کر چابیوں کے گچھے کی موجودگی کا احساس کیا۔ اس کے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ ایک پلان پر عمل کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنے لگا۔

اس نے ڈاکٹر کے غائب ہو جانے کو بھی اپنے لیے غیبی مدد جانا تھا۔ وہ تمام دولت اکٹھی کر کے عالیہ بیگم کے آنے سے پہلے ہی نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ ایک بار پھر کراچی کی رنگینیوں میں خود کو گم کرنا چاہتا تھا۔ وہ کہیں بھی بیٹھ کر تمام دولت سے کوئی اچھا سا بزنس کر لے گا۔ چلو اچھا ہی ہوا کہ ایمان کے بعد ڈاکٹر بھی خود بخود ہی نکل گیا۔ اب وہ تمام روپوں کا تنہا مالک تھا۔

گاڑی رکنے پر وہ چونکا۔ گاڑی شیخ کی کوٹھی میں داخل ہو چکی تھی۔ وہ گاڑی سے باہر نکلا اور اپنے آستانے کی طرف چل دیا۔

گھر میں اس وقت چوکیدار اور ڈرائیور کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ تیسرا تجمل خود تھا۔ اس نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر اپنے آستانے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر اندر سے کنڈی لگا لی۔ اس نے لائٹ آن کر کے ہوس بھری نظروں سے الماری طرف دیکھا۔ جلدی جلدی اس نے الماری کا تالا کھولا۔ سامنے نوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔

یہ نوٹ اس نے شیخ عمر حیات اور اس کے جاہل ساتھیوں سے مختلف ہتھکنڈوں سے ہتھیائے تھے۔ اتنی دولت لے جانے کے لیے اسے بہت بڑے بیگ کی ضرورت تھی۔ اس نے آستانے میں نگاہ دوڑائی۔ مگر کوئی بھی چیز اسے نظر نہ آ سکی۔ وہ تذبذب کے عالم میں سوچنے لگا اس کا دھیان تکیہ کی طرف گیا، لیکن اچانک اس کے ذہن میں بجلی سی کوندی۔ وہ

جلدی سے کنڈی کھول کر باہر نکلا اور شیخ کے کمرے کی طرف چل دیا۔ اسے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ تھا اور ہوتا بھی کیسے۔ گھر میں کوئی بھی نہ تھا۔ اس نے شیخ کے کمرے میں داخل ہو کر وہ بریف کیس جو اٹیچی کیس کی طرز پر بنا ہوا تھا۔ اٹھایا۔ جو شیخ ابھی ابھی عمرہ کی ادائیگی سے لایا تھا۔ ملازم نے وہ تمام سامان شیخ کے کمرے میں رکھ دیا تھا۔

تجمل نے بریف کیس اٹھایا اور اپنے آستانے کی طرف تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا پہنچا اس بار اس نے دروازے کو کنڈی نہ لگائی تھی۔ اس نے بریف کیس کھول کر تمام سامان کارپٹ پر الٹ دیا۔ اس میں ایک قابل ذکر گھڑی بھی تھی۔ جو یقیناً شیخ بابا جی کے لیے ہی لایا ہو گا۔ تجمل نے وہ گھڑی اپنی کلائی پر باندھ لی اور باقی سامان کو دیکھنے لگا۔ مگر اس کی حیرت دو چند ہو گئی کہ اتنے قیمتی سامان میں ایک بے وقعت پتھر کی کیا اہمیت تھی۔ اس نے پتھر اٹھا کر کمرے کے کونے میں پھینک دیا۔ جبکہ باقی کپڑے وغیرہ بھی اسی کونے میں پھینک دیئے۔ اب پتھر ان کپڑوں کے نیچے تھا۔ کوئی بھی ایک نظر میں دیکھ نہیں سکتا تھا۔

تجمل نے تمام نوٹ بیگ میں بھرے اور مطمئن ہو کر کمرے کی طرف دیکھا۔ وہ بڑا ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا۔ اس کا پلان کامیاب ہو گیا تھا۔

وہ بریف کیس اٹھا کر اپنے عشرت کدے سے باہر نکلا تو زمین پیروں تلے سے واضح طور پر کھسک گئی۔ بریف کیس ہاتھوں سے نکل کر زمین پر گر پڑا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔ اس کے سامنے احمد پاؤ ریوالور تانے کھڑا تھا۔ اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر سخت قہر و غضب نظر آ رہا تھا۔ تجمل نے اپنا آپ سنبھالا اور احمد پر داؤ آزمانا چاہا۔ مگر وہ پہلے ہی بول پڑا۔

''حرامزادے! میری بہن کے قاتل ہو تم۔'' وہ بمشکل الفاظ ادا کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ بھی نشے میں دھت لگتا تھا۔ وہ پھر الفاظ کو ناپ تول کر بولا۔

''تم نے پیری فقیری جیسے مقدس رشتے اور مقدس کام کی توہین کی ہے۔'' وہ بول رہا تھا جبکہ تجمل اس موذی سے جان چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ مگر کوئی بھی ترکیب کارگر ہوتی ہوئی نظر نہ آ رہی تھی۔

''تم نے میرے گھر میں حرام کاری کا اڈہ کھولا اور میرے گھر میں منہ مارا۔ تمہاری سزا یہی ہے کہ تمہیں گولی ماری جائے بس۔'' اس سے پہلے کہ احمد پاؤ ٹریگر دباتا۔ تجمل نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ بس پھر ریوالور احمد کے ہاتھوں سے نکل کر دور جا گرا۔ وہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔ تجمل احمد پر بھاری پڑ رہا تھا۔ احمد بھی بار بار اپنے سر کو جھٹک کر اس

پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن تجمل نے احمد کو زبردست ڈاج دے کر زمین پر گرا لیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور آ گیا تھا۔ اب احمد تجمل کے نشانے پر تھا۔ اس نے احمد کو کھڑا ہونے کا اشارہ کیا۔ احمد ڈولتا لڑکھڑاتا کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔

''تجمل نے کبھی بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔'' تجمل کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔ وہ بول رہا تھا۔ ''میں نے تمہاری بہن کو قتل نہیں کیا ہے۔ بس اسے ماں بنایا تھا۔ وہ بہت روئی چیخی اس نے میرا نام بھی لیا مگر تمہارے جاہل والدین نے اس کی ایک نہ سنی۔'' وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ احمد بدستور اس کے نشانے پر تھا۔

''تمہاری ماں جو کہ تمہارے باپ سے مطمئن نہ تھی۔ اسے اس عمر میں بھی ماں بننے کی خواہش تھی۔ پھر میں غریب کیا کرتا۔ اس کی مسرتوں کو بھی پورا کرنا تھا۔ سو کرتا رہا۔ نتیجتاً وہ ماں بن گئی۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے احمد باؤ کہ تمہارا کوئی بہن بھائی آنے والا ہے۔'' وہ پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''جب تک تم اور تمہارے باپ جیسے جاہل لوگ اس دنیا میں موجود ہیں مجھ جیسے ہوشیار اور چالاک لوگ ان کی جاہلیت کا فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔ تم لوگوں نے تو شرک کی انتہا کر دی تھی۔ میں لڑکیوں کا سپلائر تھا۔ مگر تم نے اور تمہارے جاہل باپ نے مجھے خدا بنا لیا تھا۔ میں اس چیز کا فائدہ کیوں نہ اٹھاتا۔ مجھ جیسے لوگوں کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ بس چند الفاظ ہوتے ہیں۔ جن سے تم جیسے بے وقوف لوگ متاثر ہو جاتے ہیں۔'' وہ اب کافی خطرناک نظر آ رہا تھا۔ احمد نے بہت بڑا رسک لیا تھا۔ اس نے اس پر چھلانگ لگا دی تھی۔ مگر اس کے ریوالور سے نکلنے والی گولی نے احمد کے دل میں سوراخ کر دیا تھا۔

احمد کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ زمین پر گر کر تڑپ بھی نہ سکا۔ گولی کی آواز سن کر چوکیدار اور ڈرائیور کیوں نہیں آئے؟ تجمل نے سوچا۔ مگر یہ وقت سوچنے اور سمجھنے کا نہیں تھا۔ یہاں سے نکلنے کا تھا، لیکن جب اس نے اپنے حواس درست کیے تو کوٹھی کا پورا لان ہی پولیس والوں سے بھرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس کے چاروں طرف ہی پولیس تھی۔ ان کی کمانڈ ایک جانا پہچانا چہرہ کر رہا تھا جو کہ بابا جی کا اپنا خاص مرید ''جانی'' تھا۔

پولیس والوں کی اپنی طرف تنی ہوئی بندوقیں دیکھ کر اس کی رہی سہی طاقت بھی جاتی رہی تھی۔ ریوالور اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے آخری حربہ آزمانے کے لیے ریوالور جانی پر تان لیا تھا۔ جو اس وقت اس کے سامنے ایس پی کی یونیفارم میں کھڑا تھا۔ تجمل کو حیران و پریشان دیکھ کر جانی کے چہرے پر سکھ اور چین کی مسکراہٹ پھیل گئی وہ ریوالور

سے ذرا برابر بھی پریشان نہ تھا۔

وہ بے فکری سے چلتا ہوا تجمل کے پاس پہنچا اور ریوالور اس کے ہاتھ سے پکڑ لیا۔ جس پر تجمل کی انگلیوں کے نشان تھے۔ نشان نہ بھی ہوتے، اس کی پلاننگ کے تحت تمام کام اسی برآمدے میں ہوا تھا۔ جس میں اس نے گزشتہ کئی روز سے وڈیو کیمرا لگوایا ہوا تھا۔ اس کام میں چوکیدار نے اس کا بہت ساتھ دیا تھا۔ وہ ہر روز اس کو اس دن کی کیسٹیں دے کر آتا تھا اور نئی کیسٹیں لے کر آتا تھا۔ احمد باؤ کا قتل بمعہ قاتل اس فلم میں محفوظ ہو گیا تھا۔

''آیئے میرے محترم پیر صاحب!'' جانی کی اس کاٹ دار بات میں تجمل کو مر جانا بہتر محسوس ہوا۔ ''تم پولیس کو کیا بوندو سمجھتے ہو؟'' اس نے تجمل کی کلائیوں میں ہتھکڑی ڈال۔

''میں گزشتہ کئی برس سے پولیس جاب کے لیے ٹرائی کر رہا تھا۔ میرے طریقہ تفتیش کو دیکھتے ہوئے میری مرضی کے مطابق مجھے تمام کام سادہ لباس میں کرنے کا موقع مل گیا اور اس طرح تم جیسے ڈھونگی اور فراڈیے کو بے نقاب کرنے کا موقع بھی مل گیا۔ مگر یہ سارا کام غفران کا ہے جو تمہاری ناک کا بال بن کر تمہیں ستاتا رہا۔ اس نے اپنے آپ کو تو گناہ آلودہ زندگی سے بچا لیا مگر تمہارا پیچھا نہ چھوڑا۔'' اس نے جھٹکا دے کر تجمل کو کھینچا اور سپاہیوں کو اشارہ کیا کہ وہ اسے گاڑی میں بٹھا کر لے جائیں۔ ''اس کی ٹہل سیوا میں کروں گا۔''

☆======☆======☆

شیخ کو آج پندرہ دن بعد بتایا گیا تھا کہ احمد باؤ کو بابا جی نے قتل کر دیا ہے۔ وہ ہسپتال کی دیواروں کو تھام تھام کر رو رہا تھا۔ کوئی اس کا پُرسانِ حال نہ تھا۔ جوان بیٹی کی موت نے اس کی کمر توڑ دی تھی۔ مگر اس کا جوان اور اکلوتا بیٹا بھی اس کی توہم پرستی اور جہالت کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ دو دن سے عالیہ بیگم بھی غائب تھی۔ وہ اس کی خبر گیری کے لیے نہ آئی تھی۔ شیخ نے سوچا کہ گھر میں تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھا ہو گا۔ لوگ دھڑا دھڑ افسوس کرنے کے لیے آ رہے ہوں گے۔ مگر صورتِ حال اس کے برعکس تھی۔ کسی سیانے نے سچ ہی کہا ہے کہ ''بابا نہ ہو تو بکریاں بھی نہیں چرتیں۔'' اس کی کوٹھی میں ہُو کا عالم تھا۔ بس چوکیدار تھا جو گھر بار کی صفائی ستھرائی کر دیا کرتا تھا۔

☆======☆======☆

پولیس جیپ اپنے دروازے پر کھڑی دیکھ کر غفران حیران رہ گیا تھا۔ وہ شاہ جی کی تیمارداری کر کے واپس آ رہا تھا۔ وہ حیرانگی سے جیپ کو دیکھتا ہوا اندر داخل ہوا تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سامنے جانی کو ایس پی کی یونیفارم میں دیکھ کر وہ ڈیوڑھی میں ہی

ٹھٹک کر رک گیا تھا، لیکن جانی نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں موتی جھلملا رہے تھے۔ غفران اس کی یونیفارم پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ جبکہ ماں جی اور عصمہ ان کے پیچھے صحن میں کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھیں۔

''جانی بادشاہ!'' غفران نے اپنے مخصوص لہجہ میں کہا تو جانی کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ ہچکیاں لے کر رونے لگا تھا۔ روتے روتے بولا۔

''کہو غفران بھائی!''

''جانی بادشاہ صاحب!'' غفران نے کہا تو سبھی مسکرا دیے۔ جانی حیران و پریشان غفران کا بازو پکڑ کر صحن میں لے آیا۔ عصمہ نے ٹیبل پر چائے اور کچھ لوازمات سجائے ہوئے تھے۔

''میں آپ کی دعا اور غفران بھائی کی محبت سے اس سٹیج پر پہنچ سکا ہوں ماں جی۔'' وہ چارپائی پر بیٹھتے ہوئے ماں جی سے مخاطب ہوا۔

تیرا کردار مجھے پہلے ہی مشکوک لگتا تھا۔'' غفران نے کہا تو عصمہ پہلی بار بولی۔

''مشکوک نہیں ہوتا جناب۔ مشکوک ہوتا ہے۔'' غفران کو اس کا یہ انداز بہت پیارا لگا تھا۔ وہ جی جان سے اس پر قربان ہو گیا تھا۔ مگر جانی نے کھنکار کر اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

''باباجی سرکار کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اور اس کی بیوی کو سرکاری گواہ بنا کر عدالت میں پیش کروں گا۔ احمد باؤ قتل ہو چکا ہے۔'' جانی کی آخری بات پر گھر میں سناٹا چھا گیا تھا۔ عصمہ کی نظروں کے سامنے اس کا چہرہ گھوم گیا تھا۔ وہ پھر جانی کی بات سننے لگی۔

''مظہر حسین جو کہ اس فرم کا منیجر تھا۔ اس نے ہمارا بہت ساتھ دیا ہے اس نے نشہ ملی ہوئی چائے پلا پلا کر احمد باؤ کو نشہ کا باقاعدہ عادی بنا دیا تھا۔ خالد کی موت کا انتقام خود ہی اللہ تعالیٰ نے احمد باؤ کی موت کی صورت میں لے لیا تھا۔ شیخ عمر حیات کے گھر کو اسی گھر کے چراغ سے آگ لگ گئی تھی۔ ہمارا جو مقصد تھا پورا ہو گیا ہے۔ شیخ ہسپتال میں پڑا ہوا ہے۔ اس کی بیوی غائب ہو چکی ہے۔ اب تم سناؤ کیا پروگرام ہے؟''

جانی نے آخری فقرہ غفران سے کہا۔ تو وہ اسے غور سے دیکھنے لگا۔

''مطلب؟'' غفران یہی کہہ پایا تھا۔

''مطلب یہ کہ میری بہن میرے ساتھ میرے گھر جائے گی۔ اس کی بارات وہاں آئے گی۔ میرے گھر سے رخصت ہونے کے بعد وہ اس گھر میں بہو بن کر آئے گی۔ یہی مطلب ہے۔'' جانی خوشگوار موڈ میں تھا۔

''اللہ تمہارا بھلا کرے اور اس نیکی پر مزید ترقی دے۔'' ماں جی نے جانی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''شاہ جی نے کہا ہے کہ رخصتی ان کی حویلی سے ہو گی اور بڑی سادگی سے تمام تقریب ہو گی۔'' ماں جی کی بات سن کر عصمہ تو کمرے میں چلی گئی جبکہ جانی نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

''مرشد سرکار کا حکم سر آنکھوں پر میں آج ہی ان کی قدم بوسی کے لیے جاؤں گا۔'' پھر وہ غفران سے مخاطب ہوا۔ ''اگر تم بھی چلنا چاہو تو میرے ساتھ چل سکتے ہو اس جیپ میں بیٹھ کر۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''نہ بھائیا! بڑی مشکل سے مجھ پر سے بدمعاشی کا ٹھپہ اترا ہے۔ تمہارے ساتھ جیپ میں دیکھ کر لوگ سمجھیں گے غفران پھر سے غفران بن گیا ہے۔'' اس کی بات پر سبھی ہنسنے لگے۔ جانی نے غفران کا ہاتھ پکڑا اور باہر لے گیا۔ وہ جیپ میں سوار شاہ جی کی طرف جا رہے تھے۔ جانی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''غفران بھائی! آپ شیخ کے ٹھکانوں کے متعلق کب بتا رہے ہیں؟'' اس نے گیئر بدلا اور سامنے سڑک پر دیکھنے لگا۔ جانی نے جان بوجھ کر لمبا راستہ اختیار کیا تھا۔ جبکہ وہ پیدل بھی چند منٹ کی واک کرتے ہوئے شاہ جی کی حویلی پہنچ سکتے تھے جانی کا مقصد شیخ کے خفیہ ٹھکانوں پر چھاپہ مار کر اس کے تمام کاروبار کو ختم کرنا تھا اور غفران اس کی لنکا کا بھیدی تھا۔

''جانی بادشاہ صاحب! پورے پورے پولیس والے بن گئے ہو۔'' غفران بولا۔

''کیا آپ نہیں چاہتے کہ آپ کے ہاتھوں کا لگایا ہو بوٹا ترقی اور محنت کا پانی پی پی کر ایک دن تناور درخت بن جائے۔'' جانی مسکرا کر بولا۔ ''اور پھر شیخ کی بربادی بھی تو ہمارا مشترکہ مشن ہے۔''

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔'' غفران نے کہا۔ تو جانی محض مسکرا کر رہ گیا۔ ''جانی صاحب!'' وہ پھر بولا۔ ''اس تمام کام سے مجھے کیا نفع ہو گا؟'' اس کے ہونٹوں پر شریری مسکراہٹ تھی۔ جانی نے گاڑی سڑک کے کنارے روک لی اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''نفع تو اللہ کی ذات نے آپ کو دے دیا ہے غفران بھائی۔ آپ کو اچھے اور نیک کام کے لیے چن کر اس ذاتِ الٰہی نے اپنی محبت اور رحمتوں کا تم پر نزول کر دیا ہے۔ پھر یہ بھی نفع ہے کہ تم اس مرد قلندر کے مرید ہو جو سید خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور پھر یہ بھی نفع ہے کہ تم کو عصمہ جیسی خوبصورت اور نیک سیرت بیوی مل گئی اور پھر یہ بھی سب سے بڑا نفع ہے کہ

تمہاری بیوی حافظ قرآن ہے اور پھر یہ بھی نفع ہے کہ......''

''بس بس بھائیا!'' غفران نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔ ''تم تو پڑھے لکھوں جیسی باتیں کرنے لگتے ہو۔ میرا مطلب ہے کہ عصمہ جیسی باتیں۔ جیسی وہ کرتی ہے۔''

''آپ کو تو فخر ہونا چاہئے بھائی کہ آپ کا سالا بھی آپ کی بیوی کی طرح پڑھا لکھا ہے۔'' جانی نے کہا تو غفران لڑکیوں کی طرح شرما کر دوہرا ہو گیا۔

جانی نے گاڑی آگے بڑھائی۔ وہ لمبا موڑ کاٹ کر شاہ جی کی حویلی پہنچ گئے تھے۔ شاہ جی اب قدرے بہتر تھے۔ وہ حویلی کے صحن میں اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جانی کو جوتا اتارتے ہوئے دیکھ کر وہ مسکرانے لگے۔

جانی اور غفران نے انہیں سلام کیا اور عقیدت سے ان کے ہاتھ چوم لیے تھے۔

''مبارک ہو ارسلان احمد!'' شاہ جی نے جانی کو کہا تو غفران نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''اللہ تمہیں مزید ترقی دے گا۔ بس اس کی یاد سے کبھی بھی اپنے دل کو غافل نہ ہونے دینا اور کبھی بھی حق سچ پر شیطان کو ترجیح مت دینا۔'' شاہ جی نے اسے نصیحت کی۔ تو جانی جو کہ ایس پی ارسلان احمد تھا۔ وہ مزید سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

''غفران میاں! تیار ہو؟'' انہوں نے اس بار غفران سے کہا تو وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''جی شاہ جی!'' وہ نہایت سعادت مندی بولا۔ ''آپ کا حکم ہو گا تو چل پڑوں گا۔''

''میں اتنی مجال کہاں رکھتا ہوں کہ تمہیں حکم دوں۔'' ان کی آواز میں درد تھا۔ حکم تو اوپر سے آتے ہیں۔ ہم تو ان کی تکمیل کے خادم ہوتے ہیں۔'' شاہ جی نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

''شاہ جی!'' ارسلان احمد نے کہنا چاہا تو شاہ جی اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ''کفر و شرک پھیلانے والے تجمل حسین کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ شیخ کی بیٹی اور بیٹا مر چکے ہیں۔ اس کی بیوی لاپتہ ہے۔ جبکہ شیخ ہسپتال میں بے یارومددگار پڑا ہوا ہے۔ اس کے لیے کیا حکم ہے؟''

''اللہ کی لاٹھی بڑی بے آواز ہے۔'' وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''تم دیکھنا کہ عنقریب وہ لاٹھی اس مشرک و منکر کے سر پر زور سے برسے گی۔

شاہ جی خاموش ہوئے تو غفران بول پڑا۔

''شاہ جی! کیا میں جانی صاحب سے مزید کچھ تعاون کر سکتا ہوں؟''

''اگر چاہتے ہو کہ تمہارا رشتہ دار ترقی کرے تو تعاون کر سکتے ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے

انسان کو ایک دوسرے کا وسیلہ بنایا ہے۔'' شاہ جی نے گویا اس بات پر مہر لگا دی کہ غفران شیخ کے تمام خفیہ اڈوں کا پتہ جانی کو بتائے۔

''شاہ جی! میرے لیے خصوصی دعا کیجئے گا'' جانی نے کہا۔ تو شاہ جی نے ان کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

''تم میرے اہل وعیال ہو۔ میں دعاؤں میں تمہیں کبھی نہیں بھولتا۔ اب تم جاؤ اور باقی کام مکمل کرو اور غفران میاں، صبح پہلی فرصت میں ہی میرے پاس آنا۔ تم سے ضروری کام ہے۔ شاہ جی نے ان کو اجازت دی تو وہ الٹے قدموں واپس پلٹے اور شاہ جی کے ہونٹ جو کہ ان کے آنے سے پہلے بھی وردِ الٰہی کر رہے تھے، ایک بار پھر متحرک ہو گئے۔

☆======☆======☆

شیخ کو گھر شفٹ ہوئے آج پانچواں دن تھا۔ حیرت اور افسوس کی بات تھی کہ کوئی بھی اس کی تیمارداری اور خبر گیری کے لیے نہ آیا تھا۔ وہ بیڈ پر لیٹا اپنے کمرے کی چھت اور کبھی دیواروں کو گھورنے لگتا تھا۔ وہ عجیب سی حالت کا شکار ہو گیا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ملیحہ کی المناک موت کا منظر گھومنے لگا۔ وہ اسے کہہ رہی تھی۔ اس کے گناہ کا ذمہ دار بابا جی ہے۔ مگر شیخ نے اس کے منہ پر زوردار طمانچہ رسید کر دیا تھا۔ پھر وہ منظر جس نے اس کی یہ حالت کر دی تھی۔ جب وہ عمرہ کی ادائیگی سے واپس آیا تھا۔ بابا جی اور عالیہ بیگم جس گندے اور مکروہ فعل میں مصروف تھے۔ اس نے تو ملیحہ کی بات پر سچائی کی مہر لگا دی تھی اور پھر اس کے سامنے اس کا جوان اور خوبصورت بیٹا احمد باؤ آ کھڑا ہوا تھا۔ جو اس کے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے دبوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آپ ہی میرے قاتل ہیں۔ آپ نے ہی تو جوان نسلوں کو زہر بیچنا شروع کیا ہے۔ دیکھئے اب آپ کا بیٹا بھی اسی زہر کا شکار ہو گیا ہے۔ وہ آگے بڑھ رہا تھا اور شیخ پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔ چلا رہا تھا۔ وہ دیوانہ وار اٹھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ سامنے بند دروازے سے ٹکرا کر گر پڑا۔ وہ بدحواس ہو کر اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ وہ ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتا تھا لیکن ملیحہ اور باؤ کی چیخیں اس کا پیچھا کرتی ہوئی اس کمرے میں بھی پہنچ جاتی تھیں۔

وہ کانوں پر ہاتھ رکھے پاگلوں کی طرح ''نہیں، نہیں'' کہتا بھاگتا جاتا تھا۔ ٹیلی فون کی بجنے والی گھنٹی نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ بری طرح وحشت زدہ ہو گیا تھا۔ اس نے مسلسل بجتے ہوئے فون کی طرف دیکھا۔ اپنے خشک ہوتے ہوئے حلق کو تھوک نگل کر تر کرنے کی کوشش کی۔ آگے بڑھ کر ڈرتے دل اور لرزتے ہاتھوں کے ساتھ ریسیور

اٹھایا۔ کانپتی ہوئی آواز میں صرف ''ہیلو'' ہی کہہ پایا تھا کہ سن ہو کے رہ گیا۔ دوسری طرف سے آنے والی آواز اس کو پاگل کر دینے کے لیے کافی تھی۔

''ہیلو سر! مظہر حسین بول رہا ہوں۔ شارٹ سرکٹ کی وجہ سے یونٹ میں آگ لگ گئی ہے۔ سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا ہے سر! میں آپ کو کافی دیر سے فون کر رہا ہوں۔ آگ پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ سب کچھ راکھ ہو گیا ہے۔'' مظہر حسن تو اور بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا۔ مگر شیخ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ ریسیور پھینک کر ہنسنے لگا۔ بے ہنگم اور بلند آواز سے قہقہے لگانے لگا۔ خالی کوٹھی کو گھورنے لگا۔ رونے لگا کبھی کبھی اونچی آواز میں ہنسنے لگتا۔ کبھی اس قدر بے ہنگم روتا کہ گمان ہوتا کہ کوئی مرگ ہو گئی ہے۔ اس نے اپنے گریبان کو چاک کر لیا تھا۔ وہ کوٹھی کے لان میں ادھر اُدھر بھاگنے لگا۔ جیسے کسی انجانی اور اَن دیکھی چیز سے خوفزدہ ہو۔ وہ ایک درخت کے باریک تنے کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا تھا اور خوفزدہ نگاہوں سے اپنے اردگرد دیکھنے لگا۔ اپنے بالوں کو نوچنے لگا۔ کبھی زمین پر لیٹ کر ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتا۔

کوئی بھی اس کا پُرسانِ حال نہ تھا۔ کوئی اگر اس کروڑ پتی کی حالت دیکھتا تو دو چار روپے دے دیتا۔ لیکن اس کی حالت پر ترس کھانے والا کوئی نہ تھا۔ اس پر رحم کرنے والا کوئی نہ تھا۔ کیونکہ اس نے بھی کبھی کسی پر رحم نہ کیا تھا۔ کسی پر ترس نہ کھایا تھا۔ بلکہ فقیروں کو دھتکارا تھا۔ وہ اپنی کوٹھی میں اکیلا ہی گھوم رہا تھا۔ کبھی نوابوں کی طرح ہاتھ پیچھے باندھ کر چلنے لگتا۔ کبھی سر پر انگلی رکھ کر ایسے سوچنے لگتا ہے کہ جیسے کوئی بہت بڑا مفکر یا کوئی دانش ور سوچتا ہے۔ اس نے گیٹ کھلنے کی آواز سن کر اپنے آپ کو ایسے سمیٹ لیا کہ جیسے کسی بڑی سی آڑ کے پیچھے اپنے آپ کو چھپا لیا ہو۔ اندر داخل ہونے والے کو وہ پہچان نہ سکا تھا۔ پہچانتا بھی کیسے اس کا دل و دماغ ہی کام کرنا چھوڑ گئے تھے۔

کوٹھی میں داخل ہونے والے بزرگ کو وہ بغور دیکھ رہا تھا، لیکن ایسے کہ جیسے انہوں نے اسے نہ دیکھا ہو۔ اس نے دیکھا کہ ان کے پیچھے ایک اور جوان شخص بھی داخل ہوا۔ جس نے کالی شرٹ اور خاکی پینٹ پہنی ہوئی تھی۔ وہ اس کی طرف ہی بڑھتا ہوا آ رہا تھا۔ جبکہ بزرگ اس کے کمروں کی طرف بڑھ گئے تھے۔

نوجوان کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر وہ گھبرایا نہیں بلکہ اس کی طرف خود بڑھنے لگا۔ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ اس نے دیکھا کہ نوجوان کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ وہ غالباً اس کی حالت پر حیران تھا۔ وہ شیخ کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ شیخ اسے دیکھنے لگا اور وہ شیخ کو

دیکھ کر اس کی حالت کا اندازہ لگانے لگا۔

''بابا جی کو روکو!'' وہ نوجوان کو اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اندر احمد یاؤ اور ملیحہ رو رہے ہیں۔ روک لو بابا جی کو، روک لو'' یہ کہہ کہ وہ ایک بار پھر لان میں ایسے بھاگنے لگا جیسے بچے منہ سے گاڑی کی آواز نکال کر ہاتھوں سے خیالی گاڑی کو ریس دیتے ہیں۔ وہ بھی اس وقت ویسے ہی بھاگ رہا تھا۔ آنے والا نوجوان اندر کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بھی بابا جی کے پیچھے ہی اندر کی طرف چل پڑا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہ فراڈیئے بابا جی کے آستانے کی طرف گئے تھے۔

وہ دروازے میں کھڑا ہو کر عجیب و غریب منظر دیکھنے لگا۔ بابا جی جو کہ شاہ صاحب تھے۔ سید رشید حسین بخاری جنہیں کبھی کسی نے روتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ وہ کمرے کے ایک کونے میں دوزانو بیٹھے ہوئے تھے اور ہچکیاں لے کر رو رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جسے وہ وقفے وقفے سے چوم بھی رہے تھے۔ نوجوان جو کہ ارسلان احمد عرف جانی تھا۔ وہ ہمت کر کے آگے بڑھ گیا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار جرأت کی۔ شاہ جی کے کندھے پر اپنا ہاتھ نرمی سے رکھ کر دبایا۔ تو شاہ جی نے چونک کر رونا بند کر دیا تھا۔ گویا وہ اب تک ارسلان احمد کی موجودگی کو نظر انداز کر چکے تھے۔ انہوں نے سرخ آنکھوں سے مڑ کر اسے دیکھا۔ مگر وہ ان نورانی اور جلالی آنکھوں کی تاب نہ لا سکا۔ گھبرا کر آنکھیں جھکا کر بولا۔ ''آپ کیوں رو رہے ہیں شاہ جی؟'' جبکہ مرشد کو ہچکیاں لے کر روتا دیکھ کر اس کا بھی دل بھر آیا تھا۔ آنکھوں کے گوشے نم ہو گئے تھے۔

انہوں نے کچھ کہنے کی بجائے۔ کونے میں پڑے ہوئے کپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔ تو ارسلان احمد نے کپڑے اٹھا کر دیکھے۔ جو گیلے ہو چکے تھے۔ مگر ان میں سے اٹھنے والی بھینی بھینی خوشبو نے کونے کو مہکا رکھا تھا۔ کپڑوں میں گیلا پن تھا۔ جانی نے کپڑوں کو سونگھا تو محسوس ہوا کہ اندر کی پوری دنیا ہی مہلک اٹھی ہو۔ پوری زندگی میں ایسا عطر نہ سونگھا تھا۔

''یہ سب کیا ماجرا ہے شاہ جی سرکار؟'' وہ مضطربانہ لہجہ اختیار کیے ہوئے تھا۔

اس بار بھی شاہ جی کچھ نہ بولے۔ بلکہ اپنی مٹھی جو کہ بند تھی، ارسلان احمد کے آگے کر کے کھول دی۔ ہتھیلی پر ایک ننھا سا صاف ستھرا پتھر پڑا ہوا تھا جو کہ نم ہو گیا تھا۔ ارسلان نے سوچا کہ شاہ جی کے ہاتھوں کی گرمی کی وجہ سے نم ہو گیا ہو گا، لیکن شاہ جی گویا ہوئے۔

''ارسلان احمد!'' وہ جی جان سے مرشد کی بات سننے کے لیے متوجہ ہو گیا۔ ''یہ کپڑے جو تم دیکھ رہے ہو اور یہ پتھر بھی جو کہ نم ہے اور کپڑے بھی نم ہیں۔ یہ کسی عام پانی

سے نم نہیں ہوئے بلکہ اس نورانی پتھر کے آنسو ہیں۔'' یہ کہہ کر شاہ جی تو خاموش ہو گئے۔ مگر ارسلان احمد حیرت و استعجاب میں مبتلا ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ آج تک سنا تھا کہ جو انسان سخت مزاج ہو، کسی پر رحم نہ کھاتا ہو، اسے کسی پر ترس نہ آتا ہو، لوگ اسے پتھر دل کہتے ہیں۔ مگر آج وہ دیکھ رہا تھا کہ پتھر بھی روتے ہیں۔ پتھر کا گیلا پن اور اس سے نکلنے والی معطر کر دینے والی خوشبو بھی وہ محسوس کر رہا تھا۔ ان کپڑوں کو بھی دیکھ رہا تھا جو پتھر کے رونے سے گیلے ہو گئے تھے۔

شاہ جی کے ہاتھوں میں آتے ہی پتھر کا رونا بند ہو گیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ خشک ہونا شروع ہو گیا تھا۔ شاہ جی پتھر لے کر باہر نکلے تو ارسلان احمد بھی ان کے پیچھے ہی باہر نکل آیا۔ انہوں نے دیکھا کہ شیخ عمر حیات اپنا جوتا اتار کر اپنے ہی سر پر مار رہا تھا۔ شاہ جی کو دیکھ کر وہ جوتا پھینک کر ان کی طرف آنے لگا۔ پاس آ کر اس نے فوجی جوانوں کی طرح شاہ جی کو سیلوٹ کیا اور ایڑیاں بجا کر الرٹ کھڑا ہو گیا۔ مگر اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ وہ بولا تو لہجہ فوجی انداز اختیار کیے ہوئے تھا۔

''سر! تمام دشمن پکڑ لیے گئے ہیں۔ ان کو قید کر دیا گیا ہے۔ احمد باؤ اور ملیحہ کو تلاش کرنے کے لیے فوجیں بھیج دی گئی ہیں۔ سر۔'' وہ سیلوٹ مار کر اباؤٹ ٹرن ہوا اور لیفٹ رائٹ کی منہ سے آوازیں نکالتا ہوا واپس لان میں چلا گیا۔ اب وہ جہاز چلانے لگا تھا۔ کبھی وہ تانگہ چلانے لگتا۔ شاہ جی اور ارسلان احمد غور سے اس کی حرکات دیکھ رہے تھے۔

''اس شخص کو گرفتار کرنے کی ضرورت نہیں ہے ارسلان احمد۔'' شاہ جی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ عذاب الٰہی میں گرفتار ہو گیا ہے۔ اس نے کفر و شرک کی انتہا کر دی تھی۔ اب یہ سزا اس کی موت پر ختم ہو گی۔''

''مگر شاہ جی، رب کریم تو بڑا غفور و رحیم ہے۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے کہہ دیا۔

''بے شک وہ بڑا مہربان اور رحم والا ہے، لیکن وہ شرک کو کبھی معاف نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ واحد ہے۔ جس کی عبادت کی جاتی ہے وہ شرک سے پاک ہے۔ وہ وحدہٗ لاشریک ہے اور پھر اس نے عمرہ کی ادائیگی کے بعد اس پتھر کو جبل نور سے اس کے خاندان سے علیحدہ کر دیا۔ یہ اپنے خاندان کے ساتھ مل کر رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام پڑھتا تھا۔ اس شخص نے اسے اس جگہ سے جدا کر دیا جس جگہ پر محبوب خدا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت عطا ہوئی تھی۔ قرآن کریم کی ابتدائی آیات نازل ہوئی تھیں۔ بے شک اس نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے۔ یہ پتھر وہاں کی جدائی میں رو رہا ہے۔ یہ واپس وہیں جانا چاہتا ہے۔ اپنے

گھر میں اپنے خاندان میں اپنے دوستوں کے پاس۔ یہ اس معطر و مقدس جگہ کی جدائی برداشت نہیں کر پایا اور اللہ تعالیٰ کو اس پتھر کا رونا انسان کی نسبت زیادہ عزیز ہوا۔ اس واحد پروردگار نے اس منکر و مشرک کی دنیا اتھل پتھل کر دی ہے۔ دیکھو ارسلان احمد! اس کا سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ ہر ایک چیز، یہاں تک کہ اس کا اپنا آپ بھی۔ اب یہ اپنے آپ کو بھی نہیں پہچانتا۔ اس کے عزیز، دوست احباب رشتہ دار سب ایک ایک کر کے اسے چھوڑ گئے ہیں۔ اب یہ سڑکوں پر بھیک مانگتا پھرے گا۔ وہ بڑا غفور و رحیم ہے۔ مگر شرک اور مشرک کی بخشش نہیں کرے گا۔ اس کو اسی طرح دنیا میں ذلیل کرے گا۔'' شاہ جی کا لہجہ آخری فقرہ ادا کرتے وقت پُر جوش ہو گیا تھا۔ ارسلان احمد مرشد کا پُر جلال چہرہ دیکھ کر خاموش ہو گیا تھا۔ بلکہ سرتاپا لرز کر رہ گیا تھا۔ اس نے یہ پوچھنے کی جرأت نہ کی کہ شاہ جی کو کیسے علم ہوا کہ یہ نورانی پتھر شیخ کے گھر کے اس کمرے میں موجود ہے۔ وہ پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ باشعور بھی تھا خود ہی اندازہ کر کے خاموش ہو گیا کہ یہ اسرار الٰہی ہیں ہر کسی پر نہیں کھلتے۔ جس نے عبادت و ریاضت سے اس سوہنے رب کو راضی کیا ہو۔ تو وہ سوہنا بھی اس پر راضی ہو کر اپنے اسرار منکشف کر دیتا ہے بلکہ اپنے آپ کو آشکار کر دیتا ہے۔ وہ اب شیخ عمر حیات کو دیکھ رہے تھے۔ جس کی گاڑی سے غالباً پٹرول ختم ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ بے سُدھ ہو کر لان میں گر گیا تھا اور بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

شاہ جی باہر کی طرف چل پڑے۔ ارسلان احمد کو بھی ان کی تقلید کرنی پڑی۔

☆======☆======☆

غفران نے تیز دھوپ میں اوپر کی طرف منہ کر کے سورج کو دیکھنا چاہا مگر آنکھیں اس کی کرنوں کی تاب نہ لا سکیں۔ وہ اس وقت ایک ریگستان میں ننگے پاؤں چل رہا تھا۔ ابھی تک منزل کا دور دور تک نام و نشان نظر نہ آ رہا تھا۔ اس کے حلق میں پیاس کے باعث کانٹے پڑے ہوئے تھے۔ کوئی سایہ بھی نہ تھا۔ وہ گرنے ہی والا تھا کہ دور تک نگاہ دوڑانے پر اسے ایسا لگا کہ جیسے کچھ لوگ کھانا کھا رہے ہوں۔ غفران کی بھوک پیاس جاگ اٹھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ مگر کافی چلنے کے بعد اس نے محسوس کیا کہ وہ ان لوگوں کو دیکھ تو رہا ہے، لیکن وہ پاس آنے کی بجائے دور ہی دور کیوں ہوتے جا رہے ہیں۔ غفران انہیں زور زور سے آوازیں دینے لگا۔ وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ مگر پیاس اور بھوک نے اس کا بُرا حال کر رکھا تھا۔ سورج کی تیز گرمی بھی قہر برسا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ سورج آج ہی اپنا تمام غصہ اس ویران و بیابان ریگستان پر نکال کر دم لے گا۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ اب وہ

زیادہ دیر نہیں چل سکے گا۔ کیونکہ گرم ریت نے پاؤں میں چھالے ڈال دیئے تھے۔ وہ رونے لگا۔ اونچی اونچی آواز میں رونے لگا۔ گری اور پسینے سے اس کا بُرا حال تھا۔ پاؤں کے چھالے اب پھٹنا شروع ہو گئے تھے۔ گرم گرم ریت ان پر لگنے سے غفران کی سسکیاں نکل رہی تھیں۔ وہ بار بار گر پڑتا تھا، لیکن اس کی بار بار کی کوشش نے آخر کار اس کو کامیاب کر دیا تھا۔ اب وہ بیٹھے ہوئے لوگ قریب آ رہے تھے۔ وہ ان کے پاس پہنچ کر ہانپتا ہوا گر پڑا۔ وہ ہوش وحواس سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ اس کے منہ سے بس پانی کا لفظ ہی نکل سکا۔ ان میں سے ایک بزرگ نے پانی کی چھاگل اس کے منہ سے لگائی۔ غفران نے خوب سیر ہو کر پانی پیا اور آج سے پہلے کبھی بھی اس نے ایسا لذیذ اور شیریں پانی نہ پیا تھا۔ وہ حیرت انگیز طور پر چاک وچوبند ہو گیا تھا۔ اب وہ باری باری تمام بزرگوں کے چہروں کا دیدار کر رہا تھا۔ وہ تمام کے تمام اسے ایک جیسے ہی لگ رہے تھے۔ تمام کے چہروں پر نور ہی نور ٹپک رہا تھا۔ تمام کے لباس سفید تھے اور سفید عمامے شریف ان کی نورانیت کو مزید واضح کر رہے تھے۔ غفران حیرت کی تصویر بنا انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ غفران کو دیکھ رہے تھے۔

انہوں نے اسے ایک سوکھی روٹی کا ٹکڑا دیا۔ وہ چبانے لگا۔ وہ بظاہر سخت تھا۔ مگر اس کے منہ میں جا کر وہ مکھن سے بھی نرم ہو گیا۔ وہ ٹکڑا ذائقے اور شیرینی میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔ ان میں سے ایک بزرگ بولے اب کہاں کے ارادے ہیں؟ غفران نے جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کر دیا۔

''آپ کون ہیں؟ اور اس طرح ویرانوں میں ڈیرہ لگا کر کیوں بیٹھے ہوئے ہیں؟''

''یہ تمہارے لیے ویرانہ ہے، لیکن ہماری منزل تو ہمارے سامنے ہے۔ وہ دیکھو۔''

ایک بزرگ نے ایک طرف کو اشارہ کیا۔ تو غفرانؔ کی آنکھیں اس طرف اٹھیں اور فوراً ہی جھک گئیں۔ وہ گنبد خضریٰ کو دیکھ کر اس میں سے نکلنے والی نورانی روشنی کو برداشت نہ کر سکا تھا۔ دوسری بار بھی وہی ہوا۔ وہ نگاہیں جھکا کر رونے لگا۔ ایک بزرگ نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا۔ ''جس عظیم سے عظیم تر مقدس ومعطر پیارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی تم نے زمین سے اٹھا کر آگ میں جلنے سے بچا کر اونچی جگہ پر رکھا تھا، اس عظیم ترین ہستیؐ نے تمہیں یہ مقام بخش دیا ہے کہ تم اس کے مقدس در کی زیارت کے لیے آؤ۔ اب تمہاری ہمت ہے کہ تم راستے سے واپس جاتے ہو یا پھر آگے اسی طرح کی گری اور پُر حدت ریت کا ریگستان پار کر کے اس مدنی کے در پر پہنچتے ہو۔ اپنے آگے پیچھے اچھی طرح دیکھ لو۔''

غفران نے پیچھے دیکھا تو حیرت سے اس کی زبان گنگ ہو گئی۔ پیچھے تو وہ منظر ہی نہ تھا۔ وہ جگہ وہ مقام وہ صحرا وہ ریگستان وہ حدت وہ تپش وہ دھوپ وہ گرم گرم ریت کچھ بھی نہ تھا۔ بلکہ ایک سرسبز وشاداب باغ تھا۔ جس میں درخت لہلہا رہے تھے اور ایک حسین ترین راہداری بنی ہوئی تھی جو پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور دور تک نگاہ دوڑانے پر اس نے غور سے دیکھا تو اس کا گھر نظر آ رہا تھا۔ اچانک اس کے پاؤں کے چھالوں نے اسے احساس دلایا کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔ اس نے اس پُر فریب منظر سے نگاہیں ہٹائیں تو حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ تمام نورانی بزرگ غائب ہو گئے تھے۔ وہ حیرانگی اور پریشانی کے عالم میں انہیں آوازیں دینے لگا۔ مگر جواب ندارد!

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہی نظارہ اب اور بھی بھلا لگ رہا تھا۔ اس نے دوسری طرف دیکھا تو دور گنبد خضریٰ نظر آ رہا تھا، لیکن اس تک پہنچنے کے لیے ریگستان تھا۔ یعنی گرم گرم ریت کا سمندر، جو نا معلوم کتنا طویل تھا۔ سورج کی حدت میں نا قابل برداشت اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے گنبد خضریٰ کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر ابھی ایک قدم ہی اٹھایا تھا کہ پاؤں کے چھالے چیخ چیخ کر اسے آگے چلنے سے منع کرنے لگے۔ بلکہ اسے وہیں بیٹھنے پر مجبور کرنے لگے، لیکن گنبد خضریٰ کا دلکش وحسین نظارہ اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔

غفران نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا اور اللہ کو یاد کر کے ریگستان میں سفر شروع کر دیا۔ اس کے پاؤں کے چھالوں نے اسے بہت اذیت دی۔ مگر وہ اللہ کے آسرے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس کی حاضری کے لیے تپتے بیابانوں صحراؤں کو عبور کرنے لگا۔ وہ گنبدِ خضریٰ سے چند قدم کے فاصلے پر تھا کہ اس پر رقت طاری ہو گئی۔ وہ رونے لگا۔ وہ کبھی اپنے آپ کو دیکھتا اور کبھی گنبد خضریٰ کو جو اس کے سامنے اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود تھا۔

وہ ہچکیاں لے کر رونے لگا۔ اچانک اس کو ایسے محسوس ہوا کہ کوئی اسے جھنجھوڑ رہا ہے۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں تو وہ اپنی چار پائی پر اپنے گھر میں پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ وہ رو رہا تھا۔ ماں جی نے اسے جھنجھوڑ کر جگا دیا تھا۔ انہوں نے بیٹے کو سوتے میں روتا ہوا دیکھا تو پریشان ہو گئیں۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کا بیٹا کس مقام سے واپس آیا ہے۔ عصمہ بھی ماں جی کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔

اس نے حیرت سے اپنے گھر کے در و دیوار دیکھنے شروع کر دیے۔ وہ ماں جی سے بولا۔ ''گنبد خضریٰ کہاں گیا؟'' اس کے اس سوال نے دونوں کو ہی سمجھا دیا تھا کہ غفران کوئی

خوفناک خواب دیکھ کر نہیں رو رہا تھا۔ بلکہ گنبد خضریٰ پر حاضری دیتے ہوئے عقیدت و احترام سے رو رہا تھا۔

''بیٹا خواب تو خواب ہوتے ہیں۔'' ماں جی اس کی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ ''لیکن ایسے حسین خواب سچے بھی ہوتے ہیں۔ تم کیا دیکھ رہے تھے؟'' ماں جی نے اس کے بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کی۔ تو اس کی آنکھیں ایک بار پھر بھر آئیں۔

وہ ماں جی اور عصمہ کی طرف دیکھتا ہوا اپنا تمام خواب من وعن بیان کرنے لگا۔

عصمہ نے اس کے قدموں کی طرف آ کر دیکھا تو حیرت سے اس کی چیخ نکل گئی۔ اس کی آنکھوں میں ننھے منے موتی جھلملانے لگے۔ ماں جی اور غفران نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو عصمہ نے آگے بڑھ کر غفران کے پاؤں چوم لیے جن سے خون رس رہا تھا۔ چھالے پھٹ چکے تھے۔ غفران نے عصمہ کو حیرت سے دیکھا جو اس کے پاؤں کو چوم رہی تھی اور رو بھی رہی تھی۔ غفران کو یک دم ہوش آ گیا۔ وہ اپنے پاؤں اکٹھے کر کے اٹھ کر بیٹھ گیا اور عصمہ کو غصہ سے بولا۔ ''کیوں مجھے گناہگار کرتی ہیں آپ۔ میرا مطلب ہے کہ آپ تو چلتا پھرتا قرآن ہیں۔ مجھے گناہگار مت کریں۔ میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتا۔'' وہ یہ کہہ کر رونے لگا۔

ماں جی نے جھولی پھیلا کر رب کریم کا شکر ادا کرنا شروع کر دیا۔

''میرے پاک پروردگار بے شک ہم تیری کون کون سی نعمت کو جھٹلائیں گے۔ ہم میں اتنی تاب اتنی طاقت نہیں کہ تیری ذاتِ اقدس کو سمجھ سکیں۔ میرے معبود، میرے بیٹے کو اپنے گھر میں اعلیٰ مقام عطا کرنا۔ میری اس جھولی میں میرے بیٹے کے لیے جنت کا اعلیٰ تحفہ ڈال دے میرے مالک۔''

وہ رونے لگیں تو غفران اور عصمہ بھی آبدیدہ ہو گئے تھے۔

مؤذن نے اذانِ فجر کے لیے ''اللہ اکبر'' پکارا تو غفران اللہ کے حضور سجدہ ریز ہونے کے لیے چارپائی سے اترا تو چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ چھالوں کی تکلیف نے پاؤں اکڑا کر رکھ دیئے تھے۔ اس نے بمشکل تمام حاجاتِ ضروریہ سے فارغ ہو کر وضو کیا اور صحن میں ہی جاء نماز بچھا کر اللہ کی حمد وثنا میں مصروف ہو گیا۔ سجدوں کی جگہ اس کے آنسو چھلک چھلک کر گر رہے تھے۔ آنکھوں سے گنبد خضریٰ کا حسین و دلکش نظارہ اوجھل نہ ہو رہا تھا۔ تڑپ اور بے قراری بڑھتی جا رہی تھی۔ آنکھیں جواب دے گئی تھیں۔ ان سے مزید نہ رویا جا رہا تھا۔ مگر دل کے آنسوؤں کی کوئی زبان نہ تھی۔ کوئی اظہار نہ تھا۔ کوئی قرینہ نہ تھا۔ کوئی سلیقہ نہ تھا۔

بس سجدہ شکر ہی تھا۔ جو بے چین اور تڑپتے ہوئے دل کو قرار بخش سکتا تھا۔ وہ بہت دیر سجدہ میں پڑا رہا۔ اس کا وجود ہولے ہولے کانپتا رہا۔ آنکھوں نے ضبط کے سارے بندھن توڑ دیئے تھے۔ وہ دھلے ہوئے چہرے کے ساتھ جاء نماز سے اٹھا اور اندر جا کر ماں جی کے پاس بیٹھ گیا۔ جو کہ جاء نماز پر قرآن کریم رکھ کر اس کی تلاوت کر رہی تھیں۔

''ماں جی!'' وہ ماں جی سے مخاطب ہوا۔ ''مجھے قرآن کریم سنایئے۔'' اس کی آنکھیں پھر متورم ہو گئی تھیں۔

''مجھ سے بہتر تو عصمہ پڑھتی ہے۔ تم اس سے کیوں نہیں کہتے؟'' ماں جی نے ذرا خوشگوار موڈ میں کہا۔ وہ بیٹے کے چہرے پر غمگینی کے سائے نہ دیکھ سکتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ غفران خوش رہے۔

''مجھے ان سے شرم آتی ہے۔'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''وہ خود بھی تو سنا سکتی ہے۔'' عصمہ اپنے ہونے والے شوہر پر قربان ہو گئی تھی۔ اس نے قرآن کریم کی تلاوت شروع کر دی۔

''اور ان سب کو ہمارے سامنے حاضر کر دیا جائے گا اور ان کے لیے ایک نشانی یہ مردہ زمین ہے۔'' عصمہ پہلے عربی میں پڑھتی اور پھر اس کا ترجمہ سناتی تھی۔ غفران خاموشی سے سن رہا تھا۔ عصمہ سورت یٰسین کی آیات تلاوت کر رہی تھی۔

''ہم نے اسے زندہ کر دیا اور ہم نے نکالا اس سے غلہ، پس وہ اس سے کھاتے ہیں اور ہم نے اگائے اس میں باغات۔ کھجور اور انگوروں کے جاری کر دیئے اس میں چشمے تاکہ کھائیں وہ اس کے پھلوں سے اور نہیں بنایا ہے اس کو ان کے ہاتھوں نے۔ کیا وہ ان نعمتوں پر شکر نہیں کرتے۔'' وہ خاموش ہو گئی اور کچھ توقف کے بعد پھر تلاوت کے بعد اس کا ترجمہ سنانے لگی۔

''ہر عیب سے پاک ہے وہ ذات جس نے ہر چیز کو جوڑا جوڑا پیدا فرمایا ہے، جنہیں وہ ابھی نہیں جانتے۔'' وہ ایک فرمانبردار شاگرد کی طرح سن رہا تھا اور قرآنی الفاظ کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

☆======☆======☆

وہ شاہ صاحب کی حویلی پہنچا تو حاجی عبداللہ بھی وہاں موجود تھے۔ اس نے جا کر سلام کیا اور شاہ جی کے ہاتھوں کو بوسہ دیا۔ وہ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ارسلان احمد بھی آ پہنچا۔ وہ سبھی اکٹھے ہو گئے تھے۔ ارسلان احمد کے ہاتھوں میں مٹھائی کی ٹوکری تھی۔ اس نے آتے ہی شاہ

جی کو سلام کیا اور فرداً فرداً ان سے بھی ہاتھ ملایا۔ مٹھائی کی ٹوکری ایک طرف رکھ دی گئی تھی۔

وہ بھی شاہ جی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جو خاموش تھے اور ان میں سے کسی کی بھی اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ گفتگو میں پہل کرے۔ بالآخر شاہ جی نے سکوت کو توڑنے کے لیے خود ہی لب کشائی کی۔

''غفران میاں! پاؤں میں تکلیف تو نہیں ہو رہی۔'' یہ الفاظ سن کر غفران کے چونکنے کو حاجی عبداللہ اور ارسلان احمد نے واضح محسوس کر لیا تھا۔ غفران کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ کچھ کہنے کے لیے الفاظ تلاش کر رہا تھا، لیکن اتنا ہی کہہ سکا۔

''مجھے کھانا کھلانے والے بزرگ کون تھے شاہ جی۔''

''اللہ کے دوست۔'' مختصر جواب نے غفران کی ہچکی باندھ دی تھی۔ ارسلان احمد اس کی پیٹھ تھپتھپا رہا تھا۔ حاجی عبداللہ بھی دلاسہ دے رہے تھے۔

''حاجی صاحب!'' وہ حاجی عبداللہ سے مخاطب ہوئے۔

''جی شاہ جی۔'' حاجی عبداللہ دل سے بولا۔

''کیا آپ کی طرف سے تمام انتظامات مکمل ہیں؟''

''جی سرکار! میری طرف سے کوئی دیر نہیں ہے۔ اب تو ارسلان احمد کی باری ہے۔ وہ کتنی دیر میں کام نپٹاتے ہیں۔'' حاجی عبداللہ نے کہا تو شاہ جی نے ارسلان احمد کی طرف دیکھا۔

''آج ہی ان شاء اللہ سب کام ہو جائے گا۔'' ارسلان احمد شاہ جی کے بولنے سے پہلے ہی بول پڑا۔ شاہ جی کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا تھا۔ وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید کسی کا انتظار تھا اور پھر انتظار بھی ختم ہو گیا۔ غفران کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ آنے والی عورتوں کو نہ دیکھ سکا تھا۔

دونوں عورتوں نے اپنے آپ کو سیاہ چادروں میں اچھی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ وہ ماں جی اور عصمہ تھیں۔ عصمہ نے تو باقاعدہ نقاب کیا ہوا تھا۔ وہ دونوں ہی شاہ جی کو سلام کر کے حاجی عبداللہ کے پیچھے ہی بیٹھ گئیں۔

''غفران میاں!'' شاہ جی نے غفران کو مخاطب کیا۔ وہ سر اٹھا کر آنکھوں کو جھکا کر بولا۔

''جی شاہ جی!''

''تیار ہو۔'' شاہ جی نے ہونٹوں پر تبسم سجاتے ہوئے کہا۔

''آپ کا حکم ہو تو غفران ہر جگہ جانے کے لیے تیار ہے۔''

''کہیں جانا نہیں ہے۔ بلکہ سنت نبوی ﷺ پوری کرنی ہے۔'' شاہ جی اب بھی مسکرا رہے تھے۔

حاجی عبداللہ، ارسلان احمد، ماں جی اور پھر خود دلہن عصمہ بھی غفران کی حالت سے محظوظ ہو رہے تھے۔ تمام پلان ارسلان احمد کا تھا۔ غفران کو ہی نہ بتایا گیا تھا۔ باقی تمام افراد کو معلوم تھا کہ آج غفران اور عصمہ کا نکاح ہو گا۔

''غفران میاں! آج تمہارا نکاح ہے۔ کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔'' شاہ جی نے اس سے کہا تو وہ پہلی بار نگاہ اٹھا کر شاہ جی کے متبسم چہرے کو دیکھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس نے شرم سے سر جھکا لیا تھا۔

''کیا تمہیں عصمہ پسند ہے؟ میرا مطلب ہے کہ کیا تم اپنی زندگی میں اس لڑکی کو شامل کر کے شریکِ زندگی بنانا چاہتے ہو؟'' شاہ جی نے کہا تو غفران کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ عصمہ کا بھی دل باہر آنے کو مچلنے لگا تھا۔

''آپ بہتر سمجھتے ہیں تو بہتر ہی ہو گا جی۔'' وہ سعادت مندی سے سر جھکا کر بولا۔

''تم کیا سمجھتے ہو؟''

''بہتر ہی سمجھتا ہوں جی۔ وہ مجھے پسند ہے۔ مطلب ہے کہ اچھی لگتی ہے۔'' وہ اتنی بڑی بات بآسانی کہہ گیا تھا۔

''تو پھر وضو تو ہو گا تمہارا۔ میرے پیچھے پیچھے پڑھتے جانا۔''

''جی شاہ جی۔''

شاہ صاحب نے کلمے پڑھائے۔ پھر خطبہ دیا گیا۔ پھر ایجاب و قبول کروایا گیا۔ غفران کو عصمہ کی موجودگی کا تب پتہ چلا تھا جب شاہ جی نے عصمہ سے غفران کے متعلق ایجاب کروایا تھا۔ وہ اس بات کو محسوس کر کے سرخ ہو گیا تھا کہ عصمہ نے اس کی پسند والی بات سن لی ہو گی اور عصمہ بھی فخر سے پھول گئی تھی کہ غفران بھی اسے پسند کرتا ہے۔

رخصتی کے وقت عصمہ کو حاجی عبداللہ نے پیار دیا اور کافی روپوں کی سلامی بھی دی۔ وہ جانی کے گلے لگ کر رونے لگی۔ اس کا بھی کوئی نہ تھا اور اس کا بھی۔ بس پیری مریدی نے انہیں بہن بھائی کے رشتے میں باندھ دیا تھا۔ جانی کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے تر ہو گئی تھیں۔ شاہ جی نے عصمہ کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور بولے۔

''اللہ نے تمہاری عزت محفوظ رکھنے کے لیے تمہیں ایک محفوظ سہارا دے دیا ہے۔ کل

تک یہ بھٹکا ہوا تھا، لیکن اس کو بھٹکانے والا آج اللہ کی راہ سے بہت دور نکل گیا ہے۔ یہ اللہ کے کرم سے سیدھے راستے پر چل پڑا ہے۔ ابھی ایک اور کام اس کے ذمہ لگانا ہے۔ مگر تم اس کی خدمت کرنا بس یہی سمجھ لو کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے بعد کسی کو سجدہ واجب قرار دیتا تو وہ بیوی کا شوہر کو سجدہ ہوتا۔ اللہ تمہیں سدا خوش رکھے۔'' شاہ جی کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ انہوں نے یہ کمی اس طرح پوری کر لی تھی۔ اللہ پاک نے غفران کی صورت میں اچھا مرید جو کہ بیٹا تھا اور عصمہ جو کہ نیک اور حافظ قرآن مریدنی تھی۔ وہ بیٹی بن کر اس چوکھٹ سے رخصت ہو رہی تھی۔ شاہ جی نے مٹھائی کی ٹوکری سے برفی کا ٹکڑا اٹھا کر ان دونوں کا منہ میٹھا کروایا اور انہیں گھر کی طرف رخصت کر دیا۔

باقی مٹھائی محلہ میں بانٹنے کے لیے ارسلان احمد کو دے دی کہ وہ نذیراں کے گھر پہنچا آئے۔ ماں جی بھی بہت خوش تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں نیک سیرت اور خوبصورتی سے بھرپور اچھی بہو دی تھی۔

☆======☆======☆

ارسلان احمد کو بہت کام کرنے تھے۔ جن کا شاہ جی اور حاجی عبداللہ کو علم تھا۔ وہ کامیاب اور سرخرو ہونا چاہتا تھا۔ شاہ جی نے پہلی مرتبہ اسے کام کہا تھا۔ وہ کام یہ تھا کہ کل تک غفران احمد کا پاسپورٹ بنوانا تھا۔ حاجی عبداللہ تمام اخراجات کر رہے تھے۔ غفران احمد کو اگلے ہفتے عمرہ کی ادائیگی کے لیے بھیج رہے تھے۔ وہ اس نورانی پتھر کو اپنے ساتھ لے جا کر اس کے خاندان والوں میں چھوڑ کر آئے گا۔ یہ غفران احمد کی ڈیوٹی نہیں تھی، بلکہ رب تعالیٰ نے اس کام کے لیے چن لیا تھا اور یہ اس کے لیے اعزاز تو تھا ہی مگر شاہ جی کی ڈیوٹی تھی کہ اس بندے کو جلد از جلد درِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بھیجا جائے۔ اس کی حاضری کا بلاوا وہاں سے آیا تھا۔ جہاں تاجداروں کے تاجدار جا کر جھکتے تھے۔ جھولی اٹھا کر بھیک مانگتے تھے۔ کروڑوں پتی نہ جا سکتے تھے۔ بس حاضری اور بلاوے کی بات ہوتی ہے۔ یہ اعزاز خلقت خدا میں ہر کسی کو حاصل نہ ہوتا تھا۔

غفران احمد کی سہاگن بن کر عصمہ حجلۂ عروسی میں بیٹھی تھی۔ وہ اپنی قسمت پر نازاں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی عزت، لاج اور شرم رکھ لی تھی۔ وہ بن ماں باپ کی بچی، اس ظالم معاشرے میں دربدر کی ٹھوکریں کھا کر نہ جانے کیا بن جاتی۔ اسے آج خالد بری طرح یاد آیا تھا۔ وہ اگر ہوتا تو کتنا خوش ہوتا۔ یہ خیال عصمہ کی آنکھوں کو بھگو گیا۔

لیکن خوشی اس بات کی بھی تھی کہ غفران احمد جیسا شوہر ملا تھا۔ جسے اللہ تعالیٰ نے

ہدایت اور نیکی کا راستہ دکھا دیا تھا اور عصمہ اس کی شریکِ حیات بن گئی تھی۔ اس بات کو بھی اس نے اپنے منہ سے سن لیا تھا کہ غفران عصمہ کو پسند کرتا ہے۔

اس کی شادی بھی عجیب شادی تھی۔ مہندی، ابٹن، مایوں، ڈھولک، گیت، سکھیاں، ناچ گانا، بھنگڑا، لڈی وغیرہ کچھ بھی نہ تھا۔ مگر جس عظیم ہستی کے گھر سے اس کی رخصتی ہوئی تھی۔ وہ قابل فخر بات تھی۔ سید گھرانے کے چشم و چراغ کا ہاتھ اس کے سر پر تھا۔ دنیا کے کسی بھی جھمیلے اور بکھیڑے کی ضرورت نہ تھی۔ سب کچھ مل گیا تھا اور پھر غفران احمد کو اللہ تعالیٰ نے خواب میں روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے جو فیض یابی عطا فرمائی تھی۔ وہ حقیقت بن کر غفران کے وجود پر چھا گئی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز نے اسے چونکا دیا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو غفران احمد نروس سا نظر آیا۔ وہ بھی گھبرائی ہوئی تھی۔ یہ وہی غفران تھا۔ جسے روزانہ صبح سویرے نماز کے لیے جگایا کرتی تھی۔ قرآنِ کریم کی تلاوت سنایا کرتی تھی۔ جسے چھپ چھپ کر اوٹ سے دیکھا کرتی تھی۔ جسے کھانا دیا کرتی تھی۔ کبھی تیز مرچ اور کبھی تیز نمک ڈال کر شرارت کیا کرتی تھی۔ مگر اس کی زبان سے کبھی کوئی گلہ نہ نکلا تھا۔

غفران احمد کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ ابھی تک دروازے میں ہی کھڑا سوچ رہا تھا۔ وہ عصمہ کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ لیتا اور پھر نظریں جھکا لیتا۔ یہ وہی عصمہ تھی۔ جسے پہلی ہی نظر میں دیکھنے کے بعد دل نے کہا تھا کہ غفران احمد ہو نہ ہو یہ تمہارا جیون ساتھی ہے۔ جسے دیکھ کر دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی تھیں۔ جسے دیکھنے کے لیے غفران احمد چھپ چھپ کر اس کے راستوں میں بیٹھا کرتا تھا۔ جس کی نیک سیرتی نے غفران بدمعاش کو غفران احمد بنا دیا تھا۔ جس کی ایک جھلک نے ہی غفران جیسے پتھر دل میں محبت کا بوٹا بو دیا تھا۔ وہ بوٹا محبت اور عشق کا پانی پی پی کر عشق حقیقی کا تناور درخت بن گیا تھا۔ اسے تو عصمہ کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا کہ اس نے غفران احمد کو اپنی زندگی کا ساتھی چن لیا تھا۔

وہ ہمت کر کے آگے بڑھا اور عصمہ جو کہ چھوئی موئی ہو گئی تھی۔ اس کا گھونگھٹ اٹھایا اور حیران رہ گیا۔ وہ عصمہ تو نہ لگ رہی تھی۔ کوئی حور لگ رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ کا انعام اس عورت کے روپ میں غفران احمد کو مل گیا تھا۔ وہ حیرانی اور فخر سے عصمہ کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے ہونٹ ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ وہ ڈرتا ہوا وہیں جام ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں اس کے میلے ہاتھ عصمہ کے خوبصورت وجود کو میلا نہ کر دیں۔ وہ اپنی تمام تر قوتِ گویائی مجتمع کر کے بولا۔

''میں آپ کا ''مشور'' ہوں جی کہ آپ نے میرا جیون ساتھی بننے کے لیے مجھے چنا۔'' اس کی آواز کانپ رہی تھی، لیکن اس کا فقرہ ختم ہونے سے پہلے عصمہ اپنے قہقہے کو ضبط نہ کر سکی۔ غفران احمد حیرانگی سے اسے دیکھنے لگا۔ یک دم کمرا کلیوں کی مہک سے مہک اٹھا تھا۔ اس کی نقرئی ہنسی سے کمرے کا ماحول خوشگوار ہو گیا تھا۔ اس نے غفران کے ہاتھ پکڑ لیے تو ایک نامعلوم سا کرنٹ اس کے پورے وجود میں دوڑ گیا تھا۔ عصمہ کی خوبصورت آواز آئی۔

''مشور نہیں بلکہ مشکور ہوتا ہے اور پھر آپ کا یہ احسان کیا کم ہے کہ مجھ پر اس گھرانے کی بدولت اللہ تعالیٰ نے رحمت کی ہے اور آپ جیسا محبت کرنے والا نیک شوہر دیا ہے۔''

''یہ میرا کوئی احسان نہیں ہے جی۔'' وہ عصمہ کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔ ''یہ تو اللہ نے آپ کے سینے میں جو قرآن رکھا ہے اس کی ہی دولت ہے۔''

''دولت نہیں بدولت۔'' عصمہ نے اس کی غلطی کو سدھارا تو وہ مسکرانے لگا اور بولا۔

''مطبل تو ایک ہی ہوتا ہے نا۔''

''مطبل نہیں۔ مطلب۔'' وہ مسکرا کر شوہر کی معصومیت پر قربان ہو رہی تھی۔

''میری غلطیاں کب سدھریں گی؟''

''کبھی بھی نہیں۔ کیونکہ ان میں جو معصومیت ہے وہ مجھے اچھی لگتی ہے۔'' وہ ادا سے بولی۔

''زندگی میں کبھی غصہ ہو جاؤں تو اڈونس ہی معافی چاہتا ہوں جی۔''

''میں ایسا موقع ہی نہ دوں گی کہ آپ کو غصہ آئے اور اڈونس نہیں ہوتا۔ ایڈوانس ہوتا ہے۔''

''بس جی ان پڑھ جو ہوئے۔''

''میں آپ کو سکھاؤں گی۔'' وہ اپنا سر اس کی گود میں رکھتی ہوئی بولی۔ ''میں پڑھاؤں گی۔ آپ کو۔''

''ٹھیک ہے میں اس حسن کی کتاب کو دل کھول کر پڑھنا چاہتا ہوں۔'' اس کے لہجے میں خماری آ گئی تھی۔

''اس کتاب کا ہر صفحہ ہر ورق آپ کی محبت اور لگن کا طلبگار رہے۔'' اس کے لہجے میں خود سپردگی تھی۔ غفران انجان نہ تھا اور ان حسین لمحات کو گنوانا نہ چاہتا تھا۔

عصمہ اس کے سامنے خوبصورت کتاب کی مانند کھلی ہوئی تھی۔ وہ اس کے حسین ورق

الٹ پلٹ کرنے لگا۔ مگر محبت اور عشق کی محویت میں کھو کر۔ اس نے عصمہ کا پورا حسن اپنی آنکھوں سے جذب کر کے دل کی لائبریری میں پہلی اور آخری کتاب کو ریک میں سجا لیا تھا۔

☆======☆======☆

غفران کو شاہ جی نے پتھر پکڑا دیا تھا۔ ارسلان احمد نے دیکھا کہ وہ ننھا سا پتھر اب کافی بڑا لگ رہا تھا۔ وہ پہلے تو پہچان نہ پایا تھا کہ یہی پتھر ہے۔ جو شاہ جی شیخ عمر حیات کے گھر سے لائے تھے۔

پھر وہ سمجھ گیا کہ پتھر آلِ رسول کی چوکھٹ پر اور پھر شاہ جی کے ہاتھوں میں آنے کے بعد گھلنا بند ہو گیا تھا۔ اب وہ اپنے اصلی حجم کی طرف مڑ رہا تھا۔

غفران احمد نے پتھر کو حیرانگی سے دیکھا۔ پھر شاہ جی کی ہدایت سننے لگا۔

''اس پتھر کو جبل نور یعنی غار حرا کے اندر رکھ کر آنا'' شاہ جی نے کہا۔ تو ان کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ وہ اس وقت ائیر پورٹ پر کھڑے تھے۔ غفران احمد پھولوں سے لدا پھندا کھڑا تھا۔ اس کا سر فخر سے اونچا مگر نگاہیں مرشد کے احترام میں جھکی ہوئی تھیں۔ ارسلان احمد، ماں جی اور عصمہ بھی ارسلان احمد کی جیپ میں سوار ہو کر غفران کو خدا حافظ کہنے آئے تھے۔ عصمہ کی آنکھیں متورم تھیں۔ ماں جی کی متورم آنکھیں بھی بیٹے کے اعلیٰ مقدروں پر خوش ہو کر موتی بہا رہی تھیں۔ غفران احمد اپنی قسمت پر نازاں تھا۔

''عمرہ کی ادائیگی کے بعد اس پتھر کو جبل نور پر نہ لے جانا۔ بلکہ جب مدینہ شریف جاؤ تو اس نورانی پتھر کو اپنے ساتھ لے جانا۔ اسے بھی گنبد خضریٰ کا دیدار کروانا۔'' شاہ جی کی آواز بھرا گئی تھی۔ ''میرے پیارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کی طرف بیٹھ کر میرا عاجزانہ سلام کہنا۔ میری طرف سے درود شریف کی ایک تسبیح پڑھ کر اس کا ثواب آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس اور ان کی آل کو بخشنا۔ ہر قدم پر ہر لمحہ پر اپنی والدہ کے لیے دعا کرنا۔ اپنی بیوی کے لئے دعا کرنا۔ اپنے اس بھائی ارسلان احمد کے لیے دعا کرنا۔ اس پتھر کو مسجد نبویؐ کے اندر پڑے ہوئے آب زم زم کے کولروں میں سے پانی نکال کر غسل دے دینا۔ یوں سمجھو کہ رب کریم نے اس بے جان اور بے زبان پتھر کے صدقے تمہارا مبارک سفر تمہارے نصیبوں میں لکھا ہے۔'' شاہ جی کی آواز بھرا گئی تھی۔ ان سب نے دیکھا کہ شاہ جی کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو رہی تھی۔ وہ کچھ توقف کے بعد بولے۔

''غفران احمد! ہماری تمہاری ملاقات شاید دوبارہ کبھی ہو یا نہ ہو۔'' ان کا لہجہ عجیب

سادرد لیے ہوئے تھا۔ ''پیارے آقا محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے میرا سلام ضرور کہہ دینا۔''

انہوں نے دوسری طرف منہ پھیر لیا تھا۔ ماں جی نے غفران کو گلے لگا کر اس کا ماتھا چوما۔ ارسلان احمد نے اسے گلے لگا کر اس کے گال پر بوسہ دیا۔ مرشد سرکار نے گلے لگا کر اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ اب عصمہ کی طرف مڑا تو آنسوؤں نے بولنا شروع کر دیا تھا۔ آنکھوں کی زبان نے اظہار کے لیے نمکین پانی کا سہارا لے لیا تھا۔ انہوں نے ان دونوں کو وہیں چھوڑ دیا اور خود ایک طرف جا کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ارسلان احمد مرشد کے احترام میں کھڑا رہ گیا۔ جبکہ ماں جی شاہ جی کی پچھلی کرسی پر بیٹھ گئی تھیں۔

''آپ فکر نہ کریں۔ شاہ جی کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔'' عصمہ نے شوہر کو تسلی دی۔

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔'' وہ کانپتا ہوا بولا۔ ''لگتا ہے جیسے میں کچھ کھو دوں گا۔ میری کوئی قیمتی چیز'' گواچ'' گئی تو کیا کروں گا جی؟''

''آپ کی قیمتی چیز اللہ اور اس کے رسول کی حفظ و پناہ میں ہے اور وہاں سے کسی کی مجال نہیں کہ اسے چرا سکے۔ میرے لیے سرکار دو عالم آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کے در پر حاضری کی دعا کرنا۔'' عصمہ نے روتے ہوئے شوہر کو الوداع کیا تو وہ واپس ماں جی کی طرف آیا۔ ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اپنا سر ان کے قدموں پر رکھ کر رونے لگا۔ اس کے آنسوؤں سے ماں جی کے پاؤں تر ہو گئے تھے۔ انہوں نے غفران کو قدموں سے اٹھایا اور ماتھے پر بوسہ دیا۔

''تجھے میں نے اللہ اور اس کے رسولؐ کے حوالے کیا۔ فی امان اللہ۔''

''مجھے معاف کر دینا ماں جی۔ میں نے آپ کو بہت دکھ دیئے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے ماں جی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ انہوں نے اسے ہاتھوں سے پکڑ کر سینے سے لگایا اور پیشانی پر بوسوں کی بارش کر دی۔

''میں نے تمہیں معاف کیا۔ میرے بچے۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔''

غفران احمد اب شاہ جی کی طرف مڑا۔ انہوں تبسم فرمایا اور پیار سے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ پھر ارسلان احمد آگے بڑھا اور اسے گلے لگا کر بولا۔

''غفران بھائی!''

''بول، جانی بادشاہ۔'' غفران نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا تو جانی کے لبوں پر درد

ناک تبسم ابھرا۔

''تمہارے احسانات کا بدلہ نہیں چکا سکتا۔ پیارے آقاؐ کے حضور میرے لیے دعا کرنا کہ میں اس قابل ہو سکوں کہ اس عظیم خاندان کا احسان اتار سکوں۔''

''جو تم نے مجھے دیا ہے۔ میں اس کا بھی بدلہ نہیں اتار سکتا۔'' غفران نے کہا تو ارسلان احمد نے استفہامیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ تو غفران نے کہا۔

''میرا مطلب ہے عصمہ۔'' وہ دونوں ہنس پڑے۔

اعلان ہونے پر غفران احمد ائیر پورٹ کی اندرونی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ جہاں سے جہاز اسے حجاز مقدس کی طرف لے جانے والا تھا۔

وہ سب کے سب ائیر پورٹ سے واپس گھر کی طرف چل پڑے۔ ابھی کچھ دور ہی آئے تھے کہ کچھ لوگوں کو جمع دیکھا۔ سڑک کے دوسرے کنارے پر ایک کار کھڑی تھی اور بہت سے لوگ جمع تھے۔ یوں لگتا تھا کہ کوئی ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ ارسلان احمد جو کہ سادہ لباس میں تھا اور اس وقت ڈیوٹی پر بھی نہ تھا۔ ایک سائیڈ سے ہو کر گزرنے لگا۔ مگر شاہ جی نے اسے کہا کہ گاڑی روک کر دیکھ کر آئے کہ کوئی زیادہ نقصان تو نہیں ہوا۔ یا پھر کوئی شناسا چہرہ مصیبت میں مبتلا نہ ہو۔

ارسلان احمد مجمع کو چیرتا ہوا مطلوبہ جگہ پر پہنچا تو حیران رہ گیا۔ سڑک پر عالیہ بیگم کی خون میں لت پت لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس نے بغور دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ دو خون ہوئے ہیں اس نے واپسی پر شاہ جی کو بتایا تو ماں جی اور عصمہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگیں۔

ارسلان احمد بتانے لگا کہ لوگ مرنے والی کے بارے میں کہہ رہے تھے کہ وہ فقیرنی تھی۔ سڑک کراس کرنے لگی کہ گاڑی کو دیکھ کر چکرا کر گر پڑی۔ مگر گاڑی سر پر پہنچ چکی تھی۔ اس کی تیز رفتاری کی وجہ سے گاڑی اس فقیرنی کو کچلتی ہوئی گزر گئی۔

ارسلان احمد نے بتاتے ہوئے جیپ آگے بڑھا دی۔

☆======☆======☆

جدہ ائیر پورٹ کی رنگین روشنیاں دیکھ کر غفران حیران رہ گیا تھا۔ اتنا بڑا علاقہ تیز روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ وہ بھی دوسرے لوگوں کی تقلید کرتا ہوا لمبی قطار میں کھڑا ہو گیا۔ امیگریشن کلیئر کروانے کے بعد وہ باہر ہی نکلا تھا کہ دو عربی مردوں نے اس کے ہاتھ سے پاسپورٹ پکڑ لیا۔ وہ کسی خلیل نامی شخص کو آوازیں دینے لگے۔ پتہ چلا کہ غفران اس کی کمپنی کے تحت پیکج کے تحت عمرہ کرنے آیا تھا۔ خلیل نامی لمبے تڑنگے شخص نے ایک لمبا کرتا پہنا

ہوا تھا جو کہ اس کے گھٹنوں تک تھا۔ اس نے گھڑی کی طرف نگاہ دوڑائی تو حیران رہ گیا۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ مگر اس کی کلائی پر بندھی گھڑی تین بجا رہی تھی۔

خلیل احمد نے اس کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے شستہ اردو میں بتایا کہ اس ملک کا وقت پاکستان کے وقت سے دو گھنٹے پیچھے ہے۔ لہٰذا اپنا وقت یعنی گھڑی درست کر لو۔ غفران کو ایک گاڑی میں بٹھا دیا تھا۔ اس کی طرح دوسرے مسافر بھی احرام کی حالت میں تھے۔ گاڑی انہیں جدہ ائیر پورٹ سے لے کر مکہ مکرمہ کی طرف چل پڑی۔ رات کے ایک بجے بھی سڑکیں بقعہ نور بنی ہوئی تھیں۔ غفران کو ڈیڑھ گھنٹہ گزرنے کے کا احساس ہی نہ ہوا تھا۔ وہ مکہ کے ایک بڑے ہوٹل میں پہنچ گیا تھا۔ اس کا ایک سفری بیگ اس کے پاس تھا۔ اسے جس کمرا میں ٹھہرایا گیا تھا۔ اس میں ایک بزرگ اور اسی کی طرح ایک نوجوان بھی تھا۔ تین بیڈ پر مشتمل یہ کمرا فلی ائیر کنڈیشن تھا۔ بزرگوار نے ان دونوں کا تعارف پوچھا۔ نوجوان نے اپنا نام سرفراز بتایا۔ اس نے بھی اپنا نام غفران بتا دیا تھا۔ جبکہ بزرگوار نے اپنا تعارف حاجی محمد رمضان کے طور پر کروایا۔ جو کہ پہلے بھی تین مرتبہ حج کی سعادت اور دو مرتبہ عمرہ کی سعادت حاصل کر چکے تھے۔ ان کی نسبت دونوں نوجوان ہی پہلی مرتبہ آئے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حاجی محمد رمضان کی صورت میں ان کی رہنمائی فرما کر عمرہ کی ادائیگی نہایت آسان بنا دی تھی۔

حاجی محمد رمضان نے انہیں وضو کرنے کا کہا اور خود بھی وضو کیا۔ انہیں لے کر حرم شریف کی طرف چل پڑے۔ راستے میں بتاتے جا رہے تھے۔

"جب حرم شریف کی حدود یعنی برآمدوں میں داخل ہوں۔ تو اپنی پہلی نگاہ کو بچا کر رکھنا یعنی کہ پہلی نگاہ جب خانہ کعبہ پر پڑے تو آنکھ جھپکے بغیر جو بھی آرزو کرو گے، جو بھی دعا مانگو گے وہ پوری ہو گی۔" وہ باتیں کرتے ہوئے ایک بازار سے گزر کر سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے تو غفران کے قدم من من کے ہو گئے تھے۔ وہ سرتاپا لرز کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر جم کر کھڑا ہو گیا۔ جبکہ سرفراز کی بھی یہی حالت تھی۔ حاجی رمضان نے ان کی کیفیت بھانپ لی۔ وہ مسکراتے ہوئے ان کی طرف بڑھے اور ان کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے۔

"ابھی تو ان میناروں کو ہی دیکھا ہے۔ جب ان کے پاس ان کے نیچے پہنچو گے تو میرے بچو کیا حالت ہو گی۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔ اللہ تعالیٰ کی تجلی اور نورانی نظارے دیکھنے کے لیے تمہیں اپنے یہ قدم اٹھانے ہی پڑیں گے۔" حاجی رمضان کی باتوں نے ان کو سہارا دیا۔ وہ بے جان قدموں سے حرم شریف کی حدود کی سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ حاجی صاحب

پھر بتانے لگے کہ "اللہ کا شکر ہے کہ ہمیں ہوٹل حرم شریف کے پاس ہی مل گیا ہے۔ ورنہ بہت پیدل چلنا پڑتا ہے۔" وہ ان کی طرف بھی دیکھ رہے تھے۔ غفران کی آنکھوں نے تو برسات کی جھڑی لگا دی تھی۔ اس کی دلی کیفیت کا اندازہ نہ ہو پا رہا تھا۔ وہ مضطرب اور بے چین تھا۔ حاجی رمضان کی آواز نے انہیں ایک بار پھر اپنی طرف متوجہ کیا۔ "یہ سامنے جو بڑا دروازہ ہے اس کا نام "باب الفتح" ہے۔ یاد رکھنا، ہم نے اسی دروازہ سے اندر جانا اور آنا ہے اور اسی راستہ سے واپس ہوٹل پہنچنا ہے۔" وہ چلتے چلتے باب الفتح کے پاس پہنچ گئے تھے۔ غفران احمد ان میناروں کے نیچے پہنچ گیا تھا جو اس نے کبھی کیلنڈروں اور تصاویر میں ہی دیکھے تھے۔

وہ ان میناروں سے نکلنے والی روشنی کو حقیقت میں دیکھ رہا تھا جو روشنی اس نے ٹیلی ویژن میں اذان کے دوران دیکھی تھی۔ رات کا تقریباً تین کا وقت ہو گا۔ مگر ہر طرف سفید روشنی نے ہر چیز کو سفیدی بخش دی تھی۔ اتنا نور تھا کہ ہر چیز اجلی اجلی اور دھلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ وہ میناروں کی چوکور اور بہت بڑی بنیادی اینٹوں کو چومنے لگا۔ اس کے ضبط کے سارے بندھن ہی ٹوٹ گئے تھے۔ سرفراز بھی اس کی طرح ایک سیدھا سادہ سا نوجوان تھا۔ مگر وہ پڑھا لکھا تھا۔ وہ بھی فرط جذبات سے اپنی آنکھوں سے نکلنے والے آنسوؤں کو نہ روک سکا تھا۔ وہ واقعی ان چیزوں کو تصاویر میں ہی دیکھا کرتے تھے۔ حاجی محمد رمضان نے انہیں دل کھول کر رونے دیا۔ وہ جانتا اور سمجھتا تھا کہ پہلی مرتبہ آنے والے مسلمان کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ بھی اس دور سے گزرا تھا۔

جب وہ اچھی طرح رو چکے تو حاجی نے انہیں اپنے پیچھے پیچھے آنے کو کہا اور نگاہیں نیچی رکھنے کو۔ وہ گیارہ بارہ سیڑھیاں اتر کر خانہ کعبہ کی حدود میں داخل ہو گئے تھے۔ قدموں میں سنگِ مرمر کا فرش تھا۔ جس پر نگاہ پھسلتی جا رہی تھی۔ مسلمانانِ اقوام آ جا رہے تھے۔ وہ روتی ہوئی آنکھوں سے کافی دیر چلتے رہے۔ پھر سیڑھیاں آئیں۔ مگر حاجی محمد رمضان نے رک کر ان کی طرف دیکھا۔ اور انہیں کہا۔ "اپنے دل میں جو بھی دعا یاد ہے۔ یاد کو باہر لے آؤ۔ زبان سے ادا کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ اب نگاہ اٹھا کر اس مقدس در کو دیکھو۔ جسے خلیل اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مٹی اور گارے سے بنایا تھا۔" انہوں نے محسوس کیا تھا کہ حاجی محمد رمضان کی آواز بھی بھرا گئی تھی۔ ان کی نگاہیں اٹھیں۔ مگر یہ کیا؟...... کسی نے نورانی نور کی مٹھی بھر کر ان کی آنکھوں میں پھینک دی تھی۔ آنکھیں نورِ خدا کی تجلی دیکھ کر کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

آنکھیں جھپکنا بھول گئی تھیں۔ بے خودی میں ہاتھ اٹھ گئے تھے۔ مگر حرفِ دعا بھول گئے تھے۔ سفیدی اور اجالے کا نور اس قدر تھا کہ ہر طرف ہر چیز دودھ میں نہائی ہوئی نظر آنے لگی۔ کالے غلاف میں لپٹا ہوا چون فٹ نو انچ بلند اللہ کا گھر اپنی نورانی آب و تاب کے ساتھ وسیع و عریض صحن میں کھڑا تھا۔ لوگ احرام باندھے اس کے گرد طواف کر رہے تھے۔ پہلی نظر میں تو غفران احمد کو یوں لگا کہ جیسے وہ کوئی تصویر یا سینری دیکھ رہا ہو۔ مگر آنسوؤں نے تمام بھید کھول دیا تھا۔ ہاتھوں کے کٹوروں میں پانی جمع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ غفران احمد کو کوئی دعا یاد نہ تھی۔ بس اتنا ہی کہہ سکا۔ ''کائنات کے مالک میرے دل کی تمام خواہشات ہی میری دعا، ہیں۔ بس ان کو قبول فرما اور جو بھی مانگوں اپنے وعدے اور اعلیٰ وارفع شان کے مطابق پورا فرما۔'' سرفراز کی حالت بھی اس سے مختلف نہ تھی۔ جبکہ حاجی محمد رمضان ان سے دو سیڑھیاں نیچے بیٹھا ہوا رو رہا تھا۔

غفران کو جھٹکا لگا کہ کیا ہم اس بیت اللہ کے پاس نہیں جا سکتے۔ کیونکہ حاجی وہیں بیٹھ گیا تھا۔ وہ حاجی کی طرف بڑھے۔ اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا تو اس نے سرخ آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا اور اپنا چہرہ صاف کر کے انہیں آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ مگر پھر رک گیا۔

''میرے بچو! اس تختی کو اچھی طرح ذہن میں رکھو۔ یہ باب الفتح ہے۔ اس کی نشانی ہے کہ یہ نیلے رنگ میں لکھا ہوا ہے۔ اگر تم میں سے کوئی راستہ بھول جائے تو اس دروازے کے پاس انہی سیڑھیوں پر آ جانا۔'' وہ دونوں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے حاجی محمد رمضان کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ غفران نے حاجی صاحب کو آواز دی۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا۔

''حاجی صاحب کیا ہم اس مقدس خانۂ خدا کو چھو سکتے ہیں؟'' اس کی آواز میں تڑپ تھی۔

''کیوں نہیں۔ ہم اس گھر کو چھوئیں گے بھی اور اس پر چڑھے ہوئے نورانی سیاہ رنگ کے غلاف کو بوسے بھی دیں گے۔ تم دیکھنا ہمیں کوئی نہیں روکے گا۔'' حاجی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تو دونوں نے پُرسکون سانس لی۔ غفران نے دیکھا کہ بہت سی عورتیں سروں پر کالے رنگ کے سکارف اوڑھے آ جا رہی تھیں۔ کئی عورتوں نے سفید رنگ کے سکارف اوڑھ رکھے تھے۔ وہ اب بالکل خانہ کعبہ کے پاس پہنچ چکے تھے۔ لوگ اس کی دیواروں سے چمٹے ہوئے تھے۔ حاجی نے بھی خالی جگہ دیکھ کر ان کو اس میں گھسا دیا۔ بس پھر کیا تھا؟ غلافِ کعبہ کو ہاتھ چھوئے تو دل کے تار بھی چھڑ گئے۔ ہونٹوں نے غلافِ کعبہ کو بوسہ دیا تو دل کی

دنیا میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ آنکھوں نے غلافِ کعبہ کو چوما تو اندھیر نگری میں کرن اور اجالا اس قدر پھیل گیا کہ غفران احمد کو اپنے اندر کا نظام نظر آنے لگا۔ آنسوؤں کی قدر و قیمت بہانے والے نہ جانتے تھے۔ مگر جس کی چوکھٹ کو تھام رکھا تھا وہ جانتا تھا وہ ایک ایک آنسو کو جمع کر رہا تھا۔ ان آنسوؤں کی سچائی کو پرکھ رہا تھا۔ ان آنسوؤں کے درجات تہہ در تہہ بلند کر رہا تھا۔ معطر و مطہر غلافِ کعبہ نے ان کے دل میں روشنی اور اجالے کی کرنیں جگمگا دی تھیں۔ وہ ہونٹوں سے، آنکھوں سے دل سے اور اپنے ہاتھوں سے اسے چھو رہے تھے، چوم رہے تھے۔ بے یقینی کی سی کیفیت تھی۔ ایک خوابناک ماحول تھا۔ وہ کبھی خود کو دیکھتا اور کبھی اوپر منہ اٹھا کر بلند و بالا خانۂ خدا کو دیکھتا۔ اس پر رب ذوالجلال کی ہیبت اور جلال طاری ہو جاتا۔ وہ نگاہ بھر کر اس مقدس گھر کو نہ دیکھ سکتا تھا۔ اپنا ایک ایک گناہ یاد آنے لگا۔ دل رونے لگا۔ تڑپنے لگا۔ مچلنے لگا۔ کسی بخشش کے پیغام کو سننے کے لیے کان بے چین ہونے لگے۔ وجود کانپنے لگا۔ لرزنے لگا۔ ٹانگوں نے ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ خوفِ خدا سے لرز کر گر پڑتا۔ حاجی محمد رمضان نے اسے پیچھے کھینچ لیا تھا۔

وہ دونوں کو مقام ابراہیم علیہ السلام پر لے گئے اور دو رکعت نماز نفل ادا کئے۔ بعد میں طواف کئے گئے۔ پھر کعبہ کے دروازہ پر ہاتھ بلند کر کے اس رحمٰن و رحیم کی چوکھٹ پر کھڑے ہو کر اس کے دروازے کو کھٹکھٹایا گیا۔ رو رو کر دعائیں مانگی گئیں۔ دل کھول کر رو دیا گیا۔ اپنے تمام گناہوں کو یاد کر کے اس کی معافی مانگی گئی۔ پھر زم زم سے پیاس بجھائی گئی۔ آنسوؤں کا خزانہ دل میں پھر جمع ہو گیا تھا۔ اب صفاء و مروہ کے درمیان سات چکر لگانے تھے۔ پھر زم زم کا دل کھول کر ہونٹوں نے استقبال کیا تھا۔ پھر حاجی محمد رمضان انہیں لے کر حجام کے پاس چلے گئے۔ ان کی ٹنڈیں کروا دی گئیں۔ حاجی صاحب نے بھی ٹنڈ کروائی۔ تب حاجی صاحب نے حمام سے نکل کر انہیں بتایا کہ ''تمہارا عمرہ ہو گیا ہے۔ تم حاجی صاحب ہو گئے ہو''۔ غفران اور سرفراز کی آنکھیں اس لقب سے چمکنے لگیں۔ حاجی صاحب نے انہیں تقریباً کھینچتے ہوئے دوبارہ حرم شریف چلنے کا کہا۔

''اس وقت حجرِ اسود پر رش کم ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی باری مشکل سے ہی آتی ہے۔ چلو قسمت آزما کر دیکھ لیتے ہیں۔''

باری آنے پر کوشش وہ حجرِ اسود کو بوسہ دینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ غفران کے کانوں میں اذانِ فجر کی آواز گونجنے لگی۔ پورا حرم ہی اللہ کی حمد و ثنا کرنے لگا۔ یہ وہ آواز تھی جو وہ کبھی کبھار چائے کے کھوکھے پر رکھے ہوئے ٹیلی ویژن پر دیکھا اور سنا کرتا تھا۔ پہلی نماز

باجماعت ادا کر کے غفران احمد کا سر فخر اور اظہارِ تشکر سے بلند ہو گیا تھا۔ اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ماں جی، عصمہ، ارسلان احمد اور اس کے محسن حاجی عبداللہ شاہ جی کے ساتھ کھڑے ہوئے غفران احمد کی آنکھوں کے سامنے آ کھڑے ہوئے پھران کی ایک ایک بات، اک اک ادا، اک اک حرکت سامنے آنے لگی۔

دعا کا طویل سلسلہ جاری تھا۔ غفران احمد رب ذوالجلال کے گھر کے سامنے اس کے صحن میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ آنکھوں کو اٹھا کر رب ذوالجلال کی شان کا اندازہ کرنا چاہتا تو آنکھ تھکی ماندی پلٹ کرنا کام لوٹ آتی تھی۔

پھر اس نے عجیب منظر دیکھا۔ اس کے سر پر خانہ کعبہ سے تھوڑی بلندی پر سیاہ رنگ کے چھوٹے چھوٹے پرندے چہچہانے لگے۔ وہ حیرانگی سے انہیں دیکھنے لگا۔

''یہ ابابیل ہیں۔ اللہ کی فوج ہے جس نے ہاتھی والوں پر کنکریاں برسائی تھیں اور انہیں ایسا کر دیا تھا جیسے کہ کھایا ہوا بھس ہو۔'' یہ حاجی رمضان کی آواز تھی جو اس کے پیچھے ہی سرفراز کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔

''ان کی چہچہاہٹ سنو غفران۔ یہ بھی رب ذوالجلال کی حمد و ثناء بیان کر رہی ہیں۔''

اس نے حیرانگی سے ان پرندوں کی طرف دیکھا۔ پھر حاجی کی آواز پر متوجہ ہو گیا۔

''اس جگہ کا انچ انچ اس وحدہٗ لاشریک کی تسبیح کرتا ہے۔ یہی ہے خدا جس کو سجدہ واجب ہے۔ جس کی عبادت میں کوئی شریک نہیں ٹھہرایا جا سکتا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔'' حاجی نے انہیں ہوٹل جا کر کچھ دیر آرام کرنے کا کہا اور احرام بھی اتارنے کا کہا۔ اب وہ شلوار قمیض پہن سکتے تھے اب باقی عبادت شلوار قمیض میں ہی کرنی تھی۔ لہٰذا وہ ہوٹل آ گئے۔ غفران نے کپڑے بدلے اور اپنے بیگ میں سے پتھر کو نکال کر دیکھا اور اسے چومنے لگا۔ اس نورانی پتھر کی بدولت ہی وہ آج یہاں تک پہنچ سکا تھا۔ مرشد کا حکم تھا اور اللہ کی رحمت تھی اور پھر مدنی آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا بلاوا تھا۔

دو دن مکہ مکرمہ میں گزارنے کے بعد ان کا مدینے کی طرف سفر شروع ہو گیا تھا۔ حاجی محمد رمضان نہ ہوتا تو وہ عمرہ کی ادائیگی اور نوافل وغیرہ شاید ٹھیک طریقے سے ادا نہ کر سکتے۔ خانہ خدا میں حاجی محمد رمضان نے ہر جگہ ان کی رہنمائی کی تھی۔ اب گاڑی انہیں مدینہ لے کر پہنچ گئی تھی۔ رات کا وقت تھا وہ ابھی مدینے شہر سے دور ہی تھے کہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے غفران احمد کو حاجی محمد رمضان نے اپنی انگلی کے اشارے کی سیدھ میں دیکھنے کے لیے کہا۔ غفران نے چلتی ہوئی گاڑی کی سکرین کے پار سامنے نگاہ دوڑائی تو وہ سانس لینا بھول

گیا تھا۔ اس نے اپنی جوتی فوراً اتار دی۔ اس کے جسم نے پسینہ چھوڑ دیا۔ اس کے سر کے بال جو کہ ابھی نئے اگنے والے تھے۔ لگتا تھا کہ کھڑے ہو گئے ہیں۔ اس کا وجود کانپنے لگا۔ اس کے ہونٹ درود شریف پڑھنے لگے۔ متحرک ہونٹوں سے لرزتی اور خوشی سے کانپتی آنکھوں کے ساتھ وہ سامنے مسجد نبوی کے ان میناروں کو دیکھ رہا تھا جو کہ رات کے درمیانی پہر میں اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہے تھے۔ اتنی دور سے وہ مینار دیکھ کر اسے ریگستان والا خواب یاد آ گیا تھا۔ وہ گنبد خضریٰ کو تلاش کرنے لگا۔ مگر گاڑی نے ایک موڑ کاٹا تو مینار بھی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ حاجی رمضان نے اس کی کیفیت بھانپتے ہوئے اسے زم زم سے بھری ہوئی بوتل پیش کی۔ غفران اسے گھونٹ گھونٹ پینے لگا اور رو رو کر خالی ہونے والی آنکھوں کے لیے زم زم کی صورت میں دوبارہ پٹرول بھرنے لگا تھا۔ گاڑی مدینہ شہر میں پہنچ گئی تھی۔ ایک وسیع و عریض پارکنگ میں گاڑی رکی۔ مسافر اپنا اپنا سامان اتارنے لگے۔ یہ ہوٹل کی عمارت مکہ کے ہوٹل سے بھی بلند تھی۔ کمرے میں پہنچ کر انہوں نے وضو کیا اور سبز گنبد کو دیکھنے کے لیے تڑپنے لگے۔ حاجی محمد رمضان انہیں لے کر چل پڑے۔ کوئی سات آٹھ منٹ کے فاصلے پر جنت البقیع کا قبرستان شروع ہو گیا تھا۔ چلتے چلتے اچانک حاجی صاحب رک گئے۔ وہ دونوں بھی رک گئے۔ حاجی صاحب نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ وہ قبرستان ہے جہاں اہل بیت اور ازواج مطہرات کی قبریں ہیں۔'' وہ توقف کر کے پھر بولے۔ ''میرے بچو! اپنے دل کو سنبھال لو۔ دھڑکنوں کو سجدہ ریز کر لو۔ اب وہ نظارہ سامنے آ رہا ہے جو تم نے کہیں بھی نہ دیکھا ہو گا۔'' یہ کہہ کر وہ ایک طرف مڑ گئے۔ دونوں نے ان کی پیروی کی۔ مگر سامنے مڑتے ہی دونوں کی دھڑکنیں اس قدر تیز ہو گئیں کہ لگتا تھا دل باہر آ جائے گا۔ سامنے ہی وہ نظارہ تھا۔ جو کبھی خوابوں میں کتابوں میں سوالوں میں جوابوں میں۔ فلموں میں ٹیلی ویژن پر دیکھا تھا مگر اب حقیقت بن کر سامنے آ گیا تھا۔ اپنے گندے قدموں کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ ہو رہی تھی۔ آنسوؤں کا کوئی حساب نہ تھا۔ گالوں پر لکیریں بن گئی تھیں۔ سر ادب و احترام سے جھک گئے تھے۔ دھڑکنیں درود شریف کا ورد کرنے لگی تھیں۔ آگے قدم اٹھانا دوبھر ہو گیا تھا۔ رات کے آخری پہر میں وہ نور، وہ تجلی، وہ روشنی کا طمطراق، نور کا سیلاب برداشت نہ کر سکے تھے۔ وقت تھم جاتا۔ مگر یہ خواہش ہی تھی۔ تہجد کی اذان نے دل میں تڑپ پیدا کر دی۔ اپنے بوجھل قدموں کو نئے جوش کے ساتھ اٹھایا گیا۔ جا کر گنبد خضریٰ کے نیچے کھڑے ہو کر باب جبرئیل کا نظارہ کیا گیا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں کی طرف سے اندر داخل ہو کر سنہری

جالیوں کا دیدار کیا گیا۔ التجائیں، دعائیں، حسرتیں سبھی کچھ ان آنکھوں کے راستے آنسو بن کر بہہ گیا تھا۔ خواہشیں تڑپ کر مچل کر آنسوؤں کی صورت میں آقائے دو جہاں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان ہو رہی تھیں۔ یقیناً یہ نظارے کعبہ میں بھی نہ دیکھے تھے۔

وقتِ ظہر دھوپ نے خوبصورت فرش کو مزید خوبصورت کر دیا تھا۔ تیز اور چمکتی دھوپ جب گنبدِ خضریٰ پر پڑتی تو گنبدِ خضریٰ کا سایہ سفید سنگِ مرمر پر پڑتا تھا تو آنکھوں میں اتنی تاب نہ تھی کہ اس فرش کا نظارہ کر سکتیں۔ جس پر گنبد خضریٰ کا سایہ پڑتا تھا۔ دل کو باوضو کر کے رات دن کے نظاروں سے لطف اندوز ہو کر غفران احمد نے لرزتے کانپتے وجود کے ساتھ ہزاروں خواہشیں آقائے دو جہاں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں عجز و انکساری سے پیش کیں۔ بیشک یہ وہ جگہ تھی یہ وہ مقام تھا کہ آرزو دل میں ابھی مچل رہی ہوتی ہے کہ وہ قبولیت کے درجہ پر پہنچ جاتی ہے۔

مرشد سرکار کا حکم یاد آیا تو سرکار کے قدموں میں بیٹھ کر درود شریف کی تسبیح کی۔ ماں جی عصمہ اور ارسلان احمد کا سلام پیش کیا۔ ان کے لیے دعائیں کیں۔ وہ بار بار گنبد خضریٰ کو دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھنے کی خاطر اس نے آبلہ پائی کا خیال بھی نہ کیا تھا۔ یقیناً جنت اتنی حسین نہ ہو گی۔ جتنی خوبصورت و دلکش و حسین مسجد نبوی ہے۔ غفران نے سوچا، مقدر کی یاوری تھی کہ اسے دو نفل ادائیگی کے لیے ریاض الجنتہ میں بھی جگہ مل گئی۔ اس نے جی بھر کر اس جگہ کے کونے کونے اور چپے چپے کو چوما۔ آنکھوں سے لگایا۔ دل سے بوسے دیئے اور جیب سے پتھر نکال کر اس کو مسجد نبویؐ کے خوبصورت وسیع و عریض صحن میں رکھ دیا۔ گویا وہ بھی دیدار سے فیض یابی حاصل کر لے۔

آٹھ دن بعد ان کی مکہ مکرمہ واپسی تھی۔ روتے ہوئے سسکیوں کے ساتھ اس نے آقائے تاجدار مدینہ کی خدمت اقدس میں شکرانے اور نذرانے کا تحفہ آنسوؤں کی صورت میں پیش کیا اور قدرے نقاہت اور مضمحل دل سے وہاں سے روتے ہوئے واپسی پر ایک عمرہ پھر کیا۔

پھر وہ حاجی محمد رمضان کی سربراہی میں غار حرا کی جانب چل پڑے۔ غفران احمد کو ایک نظر میں لگا کہ پہاڑ رویا ہوا ہے۔ جیسے اسے کسی نے مٹھی میں لے کر دبوچا ہوا ہو۔ ایسا کیوں نہ ہوتا۔ آخر سرورِ کون و مکان محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مبارک و معطر وجود۔ پھر جبرائیل علیہ السلام اور قرآنِ کریم کا نزول۔ ان چیزوں کی شہادت اور گواہی نے ہی اس کو رلا دیا تھا۔ مگر اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کی جیب میں پڑا ہوا پتھر اچھل اچھل کر

باہر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

غفران احمد نے پہاڑ پر چڑھتے ہوئے اسے جیب سے نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور اسے بوسے دینے لگا۔ حاجی محمد رمضان جو کہ نیچے ہی بیٹھ گئے تھے۔ انہوں نے کہا کہ اب وہ پچیس سو فٹ بلندی پر چڑھنے سے معذور ہیں۔ سرفراز بھی نیچے ہی رک گیا تھا۔ غفران ہانپتا کانپتا ہوا جبل نور پر پہنچا۔ اس نے غار کے پتھروں کو چومنا شروع کر دیا تھا۔ نورانی بھی اسے دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ اس نے نورانی کو ایک جگہ پر غار میں رکھ دیا۔ نورانی اپنے اصلی حجم میں واپس آ گیا تھا۔ تمام نورانیوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ان کا گھرانہ مکمل ہو گیا تھا۔ ان کے افراد پورے ہو گئے تھے۔ ان کی دعائیں رنگ لے آئی تھیں۔ انہوں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اُمتی کو سلام کیا۔ غفران کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ انہوں نے فخر سے اس امتی کو دیکھا اور رشک کیا۔ اس نے غار میں دو رکعت نماز نفل ادا کی۔ ایک طرف چبوترے پر ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ غفران نے سلام پھیر کر ان کی طرف دیکھا تو ان کا جھکا ہوا چہرہ دیکھ کر غفران کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ صرف اتنا ہی کہہ پایا۔

''اسمٰعیل بھائی آپ؟''

اسمٰعیل نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''ہاں میری یہیں پر ڈیوٹی ہے۔ مرشد سرکار بھی ابھی یہاں سے گئے ہیں۔ تمہارے پہنچنے کا انہوں نے مجھے بتا دیا تھا۔''

''مرشد سرکار؟'' غفران کے لہجے میں حیرت کا عنصر نمایاں تھا۔

''ہاں! اب وہ تمہیں وہاں نہ ملیں گے۔ اس دنیا سے ان کا رابطہ ختم ہو گیا ہے۔'' اسمٰعیل نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تو غفران کا ڈر، اس کا گمان باہر آ گیا۔ اس نے آتے ہوئے عصمہ سے کہا تھا کہ اسے ڈر لگتا ہے کہیں اس کی قیمتی ترین چیز نہ ''گواچ'' جائے۔ وہی ہوا تھا۔ آنکھیں ایک بار پھر اشکبار ہو گئی تھیں۔ اسمٰعیل نے اسے دلاسہ دیا۔

''ان کی جتنی ڈیوٹی تھی۔ وہ دے چکے، تم واپس جا کر میرا بوسہ سرکار کی چوکھٹ پر اپنے ہونٹ رکھ کر دینا۔ وہ میرا مرشد خانہ ہے۔ میں اب وہاں نہیں جا سکتا۔ مگر اپنا سلام تو بھیج سکتا ہوں۔'' اسمٰعیل کی آواز میں یاسیت تھی۔ ''اب ان پتھروں کو کوئی بھی یہاں سے جدا نہیں کر سکتا۔ میری یہ ڈیوٹی ہے۔ غفران احمد! میری ماں اور عصمہ بہن کو سلام کہنا اور شادی کی مبارک بھی دینا۔'' یہ کہہ کر اسمٰعیل نے دوبارہ اپنا سر جھکا لیا۔ گویا اب وہ کوئی بات نہ کرے گا۔

غفران احمد وہاں سے روتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ اب وہ واپس اپنے وطن جا رہا تھا۔ مگر مرشد کو سامنے نہ پا کر کیا کرے گا۔ کون اس کی رہنمائی کرے گا؟ وہ یہ سوچ کر وہیں بیٹھ کر رونے لگا۔ ''اللہ کے کام اللہ ہی جانتا ہے۔ اس کی کسی بھی مرضی کا گلہ نہیں کرتے۔''

اس کے کانوں میں شاہ جی کی آواز گونجنے لگی۔۔ وہ اِدھر اُدھر ہواؤں میں ان فضاؤں میں انہیں ڈھونڈنے لگا۔ مگر یہ اس کی خام خیالی تھی کہ وہ انہیں ڈھونڈ سکے گا۔ وہ بددلی سے جبل نور سے نیچے اترنے لگا۔ اسے غفران بدمعاش سے غفران احمد بنانے والے اب اس دنیا میں نہ رہے تھے۔

☆======☆======☆

نورانیوں نے اپنے ساتھی کو گھیر لیا تھا۔ وہ انہیں تمام واقعات بتانے لگا۔ مگر جب مدینہ شریف کی باری آ گئی۔ گنبد خضریٰ کے مکین کی مدح سرائی کی باری آئی۔ وہ بول نہ سکا۔ اس کے آنسو اس کی تمام داستان کہہ رہے تھے۔ وہ جب رو رو کر ہلکان ہو گئے تو اسمٰعیل نے آگے بڑھ کر انہیں دلاسہ دیا۔ اب نورانی پتھروں کو گفتگو کرنے کے لیے اسمٰعیل کی صورت میں ساتھی مل گیا تھا۔ اسمٰعیل کے کہنے پر نورانی نے اپنا مدنی سفر بیان کرنا شروع کر دیا۔

''پیارے نورانیو! آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے در کی بات میں بیان نہیں کر سکتا۔ ان کی شان۔ ان کی مدح سرائی کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ میں تو حقیر ہوں۔ ان کی اعلیٰ وارفع شان میں تو رب تعالیٰ جل شانہ خود دن رات مدح سرائی کرتا ہے۔ مؤذن کی اذان میں، مسلمان کے نام میں، کلمہ طیبہ میں، نمازیں، دعا میں، قرآن میں، ہر امتی کے دل میں جو پیار اور محبت بھری ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی کے قلم میں بھی اتنی طاقت نہ ہوگی کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر اٹھے اور یہ کہے کہ ہاں میں نے مکمل لکھ دیا ہے۔ اس در پر سلاطین سر کو جھکا کر اپنے دامنِ گدائی کو بھرتے ہیں۔ ہوا باادب اور معطر ہو کر چلتی ہے۔ سورج کی کرنیں سجدہ ریز ہو کر گزرتی ہیں۔ چاند کی چاندنی ٹھنڈی آہیں بھرتی ہوئی گزر جاتی ہے۔ ہم بے جان اِدھر ہی پڑے رہیں گے۔ بس اس امتی کے لیے دعا کرو۔ جس کی بدولت میں یہ سب کچھ دیکھ سکا ہوں۔ پیارے آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آل کے لیے دعا کرو کہ ان کی آل کے ایک روشن چراغ نے مجھے بھی زندوں میں شامل کر دیا۔ مجھے گنبد خضریٰ کا نورانی وجدانی نظارہ کرا کے آقا علیہ الصلوٰۃ السلام کی مدح سرائی کا موقع دیا ہے۔ میں وہ سماں، وہ منظر، وہ نظارے کبھی بھی نہیں بھول سکتا۔ وہاں اڑنے والے کبوتروں کو بھی خود سے خوش قسمت تصور کرتا ہوں۔'' نورانی کی آواز بھیگ گئی تھی۔ اس پر رقت طاری ہو گئی

تھی۔ تمام پتھر گیلے ہو گئے تھے۔ وہ آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جدائی میں رو رو رہے تھے اور ننھا نورانی جو کہ زائر طیبہ بنا تھا۔ جھوم جھوم کر پڑھنے لگا:

خوش بخت پرندے ہیں اڑتے ہیں ان فضاؤں میں
کاش میں بھی کبوتر ہوتا اک پیارا مدینے کا!

نور ایسا تھا پھیلا ہوا اس بستیِ رحمت میں
سب دُکھ درد مٹتا گیا میرے بیمار سینے کا!

خوشبوؤں سے معطر ہو یہ سیاہ بخت سینہ میرا
مل جائے اگر آقا ﷺ اک قطرہ پسینے کا!

اسمٰعیل کو وہ لمحات یاد آنے لگے جب وہ مرشد سرکار کی خدمت میں اس نعت کو پڑھا کرتا تھا۔ اس کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئی تھیں اور نورانیوں کے وجود مزید گیلے ہو گئے تھے۔

☆====== ختم شد ======☆